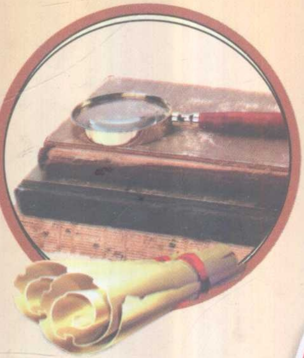
3



فتاویٰ علمیہ

المعروف

توضیح الاحکام

تالیف
محدث العصر حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ



مکتبہ اسلامیہ

فتاویٰ علمیہ

المعروف

توضیح الاحکام

تالیف

محدث العصر حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ

ترتیب و تعلیق

حافظ ندیم ظہیر

مکتبہ اسلامیہ

کتاب

فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الاحکام

تالیف

محدث العصر حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------- 2015ء

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

لاہور: ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

0300-8661763
/maktabaislamia1
www.maktabaislamiapk.com
maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

توحید وسنت کے مسائل

نماز سے متعلق مسائل

نمازِ جنازہ سے متعلق مسائل

روزہ، صدقہ فطر اور زکوٰۃ کے مسائل

نکاح وطلاق کے مسائل

اصول، تخریج الروایات اور ان کا حکم

متفرق مسائل

حرف اول

الحمد للّٰہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ الأمین، أما بعد:

اہل علم واصحاب دانش کی مثال ایک چراغ سی ہے کہ جوں جوں اس کی روشنی پھیلتی چلی جاتی ہے پروانے (متلاشیانِ علم) اس کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جلیل القدر تابعی ابوادریس خولانی رحمہ اللہ کا بیان ہے، میں دمشق کی مسجد میں گیا (تو دیکھا) ایک جوان آدمی جس کے اگلے دانت خوب چمکیلے ہیں اور لوگ اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے ہیں، جب لوگ کسی چیز کے بارے میں آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو اس کے حل کے لیے اس سے سوال کرتے ہیں اور اپنی (مختلف فیہ) رائے سے رجوع کر کے اس کی (صواب) رائے کو قبول کرتے ہیں، چنانچہ میں نے اس جوان سے متعلق پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔

(موطا امام ملك ٢/ ٩٥٤ وسنده صحيح)

علمائے حق کا اس زمین پر موجود ہونا کسی نعمت سے کم نہیں، کیونکہ عوام اور طلبا ان کے ذریعے سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں اور معلوم شد کہ حصول علم کا بہترین ذریعہ سوال جواب ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ رب العزت نے ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣) کے ذریعے سے تاکید فرمائی کہ اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے فتویٰ طلب کرلو اور ﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ﴾ کے ساتھ مفتی پر واضح کر دیا کہ فتویٰ دلائل سے مزین کرنا ہے۔

زیرنظر کتاب ''فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الاحکام'' کی تیسری جلد ہے جو مذکورہ

خاصیت کی حامل ہے، یعنی اس میں جن سوالات کے جوابات ہیں وہ دلائل ہی سے مزین وآراستہ ہیں۔

محدث العصر حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ سے جو سوالات پوچھے جاتے وہ بڑی محنت سے ان کے جوابات تحریر فرماتے اور کسی قول کو بھی بغیر حوالے کے نقل نہ کرتے، یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل فتاوی علمیہ کی دونوں جلدوں کو بطور خاص پذیرائی ملی، علماء وطلبا اور عوام وخواص میں بہت مقبول ہوئیں۔ محدث العصر رحمہ اللہ کی وفات کے بعد بھی ان کی تحقیقات وتصنیفات کو منظر عام پر لانے کا سلسلہ جاری ہے جس کے لیے محترم حافظ شیر محمد الاثری اور محترم مولانا محمد سرور عاصم حفظہ اللہ کا بھرپور تعاون قابل تحسین ہے۔ اللہ رب العزت انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

اسی طرح راقم محترم جناب نصیر احمد کاشف حفظہ اللہ کا بھی ممنون ہے، جنہوں نے آخری فہارس تیار کیں۔ جزاہ اللہ خیرًا.

قارئین کرام! ہمیں اعتراف ہے کہ استاذ محترم رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کئی وجوہات کی بنا پر کتب کی اشاعت میں مسلسل تاخیر ہو رہی ہے لیکن ہم اس کا باقاعدہ سدباب کر رہے ہیں اور امید واثق ہے کہ جلد ہی آپ کی تمام شکایات کا ازالہ آپ کے ہاتھوں میں کتابیں پہنچا کر کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

اللہ تعالیٰ ہماری ان کاوشوں کو قبول فرمائے اور ہمارے استاذ محترم رحمہ اللہ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اللہ آپ کے درجات کو بلند فرمائے اور حسنات کو شرف قبولیت عطا کرے۔ آمین

حافظ ندیم ظہیر

مدیر اشاعۃ الحدیث حضرو ضلع اٹک

8/8/2015

توحید وسنت کے مسائل

اہل حدیث سے مراد: محدثینِ کرام اور اُن کے عوام دونوں ہیں

سوال آج کل بعض لوگ کہتے ہیں: "اہلِ حدیث سے مراد صرف محدثینِ کرام ہیں، محدثین کے عوام نہیں ہیں۔" کیا ان لوگوں کی یہ بات صحیح ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ان لوگوں کی یہ بات بالکل غلط اور خود ساختہ ہے، کیونکہ اہلِ حدیث سے (صحیح العقیدہ) محدثینِ کرام اور حدیث پر عمل کرنے والے اُن کے عوام دونوں مراد ہیں اور یہی حق ہے۔ اس کی فی الحال دس (۱۰) دلیلیں پیشِ خدمت ہیں:

۱) علمائے حق کا اجماع ہے کہ طائفہ منصورہ (فرقۂ ناجیہ) سے مراد اہلِ حدیث ہیں، لہٰذا عرض ہے کہ جب محدثینِ کرام جنت میں تشریف لے جائیں گے تو کیا اُن کے عوام باہر کھڑے رہیں گے؟!

۲) امامِ اہلِ سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: "صاحب الحدیث عندنا من یستعمل الحدیث" ہمارے نزدیک اہلِ حدیث وہ ہے جو حدیث پر عمل کرتا ہے۔

(مناقب الامام احمد لابن الجوزی ص ۲۰۸ وسندہ صحیح)

۳) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ہم اہلِ حدیث کا یہ مطلب نہیں لیتے کہ اس سے مراد صرف وہی لوگ ہیں جنھوں نے حدیث سُنی، لکھی یا روایت کی ہے بلکہ اس سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ ہر آدمی جو اس کے حفظ، معرفت اور فہم کا ظاہری و باطنی لحاظ سے مستحق ہے اور ظاہری و باطنی لحاظ سے اس کا اتباع کرتا ہے اور یہی معاملہ اہلِ قرآن کا ہے۔

(مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۴ ص ۹۵، ماہنامہ الحدیث حضرو: ۲۹ ص ۳۲)

حافظ ابن تیمیہ کی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اہلِ حدیث سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں: محدثینِ کرام اور اُن کے عوام۔

۴) حافظ ابن حبان رحمہ اللہ نے اہلِ حدیث کی درج ذیل صفت بیان کی:
وہ حدیثوں پر عمل کرتے ہیں، ان کا دفاع کرتے ہیں اور ان کے مخالفین کا قلع قمع کرتے ہیں۔ (صحیح ابن حبان، الاحسان: ۶۱۲۹، الحدیث حضرو: ۲۹ ص ۲۳)

۵) ثقہ امام احمد بن سنان الواسطی رحمہ اللہ (متوفی ۲۵۹ھ) نے فرمایا: دنیا میں کوئی ایسا بدعتی نہیں جو اہلِ حدیث سے بغض نہیں رکھتا۔ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۴ وسندہ صحیح)

یہ بات عام لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ صحیح العقیدہ محدثینِ کرام اور اُن کے عوام دونوں سے اہلِ بدعت بہت بغض رکھتے ہیں۔

۶) قرآن مجید سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو اُن کے امام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ (دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل: ۷۱)

اس کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بعض سلف (صالحین) سے نقل کیا کہ یہ آیت اہلِ حدیث کی سب سے بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اُن کے امام نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۶۴، دیکھئے الحدیث حضرو: ۲۹ ص ۲۸)

محدثینِ کرام اور اُن کے عوام دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اپنا امام یعنی امام اعظم سمجھتے ہیں۔

۷) حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنے مشہور قصیدہ نونیہ میں فرمایا:
اے اہلِ حدیث سے بغض رکھنے اور گالیاں دینے والے، تجھے شیطان سے دوستی قائم کرنے کی بشارت ہو۔ (الکافیہ الشافیہ ص ۱۹۹، الحدیث حضرو: ۲۹ ص ۲۸)

دنیا میں آپ جہاں بھی چلے جائیں، یہ دیکھیں گے کہ محدثینِ کرام اور اُن کے عوام سے تمام اہلِ بدعت بغض رکھتے ہیں اور بسا اوقات گالیاں بھی دیتے ہیں۔

۸) علامہ جلال الدین سیوطی نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر: ۷۱ کی تفسیر میں نقل فرمایا:
اہلِ حدیث کے لئے اس سے زیادہ فضیلت والی دوسری کوئی بات نہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اہلِ حدیث کا کوئی امام نہیں ہے۔ (تدریب الراوی ج ۲ ص ۱۲۶، نوع ۲۷)

محدثینِ کرام کی طرح اُن کے عوام بھی علانیہ طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اپنا امام (یعنی

امام اعظم) قرار دیتے ہیں اور یہی اُن کا منہج و ایمان ہے۔

۹) ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر البغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) نے ملکِ شام وغیرہ کی سرحدوں پر رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں کہا: وہ سب اہلِ سنت میں سے اہلِ حدیث کے مذہب پر ہیں۔ (اصول الدین ص ۳۱۷)

یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ صرف محدثینِ کرام ہی مذکورہ سرحدی علاقوں میں رہتے تھے اور وہاں اُن کے عوام موجود نہیں تھے، لہٰذا ثابت ہوا کہ عبدالقاہر بغدادی کے نزدیک محدثین کے عوام بھی اہلِ حدیث ہیں۔

۱۰) ابو عبداللہ محمد بن احمد بن البناء المقدسی البشاری (متوفی ۳۸۰ھ) نے اپنے دور کے اہلِ سندھ کے بارے میں لکھا:

"مذاهبهم أكثرهم أصحاب حديث و رأيت القاضي أبا محمد المنصوري داوديًّا إمامًا في مذهبه وله تدريس و تصانيف، قد صنّف كتبًا عدّة حسنةً."

ان (سندھیوں) کے مذاہب: ان میں اکثر اہلِ حدیث ہیں اور میں نے قاضی ابو محمد المنصوری کو دیکھا، وہ داود ظاہری کے مسلک پر اپنے مذہب (اہلِ ظاہر) کے امام تھے، وہ تدریس بھی کرتے ہیں اور کتابیں بھی لکھی ہیں، انھوں نے بہت سی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔

(احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص ۳۶۳)

بشاری نے سندھیوں کی اکثریت کو اہلِ حدیث قرار دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ محدثین کرام کی طرح صحیح العقیدہ عوام بھی اہلِ حدیث ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی دلائل ہیں اور ہمارے علم کے مطابق کسی مستند محدث یا معتبر عالم سے یہ قطعاً ثابت نہیں کہ اہلِ حدیث سے مراد صرف محدثینِ کرام ہیں، اور یہ کہ محدثین کرام تو گزر چکے ہیں اور اب کوئی محدث دنیا میں باقی نہیں رہا اور نہ یہ ثابت ہے کہ کتاب و سنت پر (تقلید کے بغیر) عمل کرنے والے محدثینِ کرام کے عوام اس سے مراد نہیں ہیں۔

(۳۱/ مارچ ۲۰۱۰ء)

تہتر فرقے اور اُمتِ اجابت

سوال محترم حافظ صاحب! ایک حدیث کی وضاحت فرمادیں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی، تمام فرقے جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے۔ (مشکوۃ: ۱۷۲)

اس حدیث میں جو فرقے ہیں، کیا اس سے مسلمانوں کے فرقے مراد ہیں یا یہود و نصاریٰ بھی اس میں شامل ہیں؟ ہمارے ساتھیوں میں اس مسئلے میں اختلاف ہو گیا، بعض نے مسلمانوں کے فرقے مراد لئے اور بعض نے ساری اُمت میں یہود و نصاریٰ، ہندو بت پرست، آتش پرست وغیرہ بھی شامل کئے ہیں۔ محدثین و شارحین کا اس مسئلے میں کیا موقف ہے؟

آپ اس کا مفصل جواب تحریر فرمائیں اور محدثین و شارحین کے حوالہ جات بھی ضرور لکھیں۔ جزاکم اللہ خیراً

(ابوابراہیم خرم ارشاد محمدی۔ دولت نگر)

الجواب اُمت کی دو قسمیں ہیں:

۱: اُمتِ دعوت مثلاً یہود و نصاریٰ، ہندو اور قادیانی مرزائی وغیرہ ہر قسم کے کافر ان سب لوگوں پر فرض ہے کہ دینِ اسلام قبول کریں اور کفر و شرک ترک کر دیں۔

۲: اُمتِ اجابت یعنی کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرنے والے یا اس کا دعویٰ کرنے والے لوگ، بشرطیکہ وہ ضروریاتِ دین کا انکار کر کے کافر و مرتد نہ قرار پائیں، مثلاً مرجیہ، شیعہ، خوارج اور مبتدعین وغیرہ۔

یاد رہے کہ اُمتِ اجابت سے قادیانی مرزائی اور بہائی وغیرہ خارج ہیں۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ حدیثِ مذکور میں اُمت سے مراد اُمتِ اجابت یعنی

اُمت محمدیہ ہے (صلی اللہ علی محمد وسلم علیہ) جیسا کہ شارحین حدیث اور دیگر علماء نے صراحت کی ہے اور اس کے فی الحال دس حوالے پیش خدمت ہیں:

۱: ترمذی (بتبویبہ قبل ح ۲۶۴۰) قال: ما جاء في افتراق هذه الأمة

یعنی اس اُمت کے فرقوں کے بارے میں جو (باب) آیا ہے۔

۲: معالم السنن للخطابی (۴/ ۲۹۵، کتاب شرح السنة)

۳: عارضة الاحوذی (۱۰/ ۱۰۸-۱۰۹ ح ۲۶۴۰، اشارةً)

۴: الکاشف عن حقائق السنن یعنی شرح الطیبی عن مشکاة المصابیح (ج۱ص ۳۶۸ ح ۱۷۱)

۵: فیض القدیر للمناوی الصوفی (۲/ ۲۶ ت ۱۲۲۳)

۶: حاشیة السندھی علیٰ سنن ابن ماجه (۲/ ۴۷۹ ح ۳۹۹۱)

۷: تحفة الاحوذی (۳/ ۳۶۷ ح ۲۶۴۰) وقال: " المراد من أمتي: أمة الإجابة " یعنی من اُمتی سے مراد اُمتِ اجابت ہے۔

۸: مرعاة المفاتیح (۱/ ۲۷۰ ح ۱۷۱)

۹: انجاز الحاجه شرح سنن ابن ماجه (۱۱/ ۳۹۷ ح ۳۹۹۱)

۱۰: علمائے کرام نے اس حدیث سے مراد اُمتِ مسلمہ کے فرقے، مثلاً خوارج، شیعہ اور مرجیہ وغیرہ لئے ہیں۔

دیکھئے الفرق فی الفرق لعبد القاہر البغدادی اور غنیۃ الطالبین لعبد القادر جیلانی وغیرہما۔

معلوم ہوا کہ اس حدیث سے مسلمانوں کے یا اسلام کی طرف منسوب فرقے مراد ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور کفار و مرتدین مراد نہیں ہیں۔ (۱۲/ جون ۲۰۱۰ء)

کیا انبیاء اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں؟

سوال سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ مدلل بیان کریں۔

کیا اس روایت کو بیہقی، سبکی، ابن حجر عسقلانی، ہیثمی اور سیوطی وغیرہم نے صحیح قرار دیا ہے؟ (قاری محمد اسماعیل سلفی، جھنگ)

الجواب یہ روایت: " الأنبياء أحياء في قبورهم يصلّون ."

مسند ابی یعلی الموصلی (۶/ ۱۴۷ ح ۳۴۲۵) اور حیاۃ الانبیاء للبیہقی (ح ۲ من طریق ابی یعلی) میں درج ذیل سند کے ساتھ موجود ہے:

" يحيى بن أبي بكير :حدثنا المستلم بن سعيد عن الحجاج عن ثابت البناني عن أنس بن مالك ."

اس سند میں حجاج راوی غیر منسوب ہے، اس کی ولدیت یا نسب معلوم نہیں اور حافظ ذہبی نے فرمایا: " نكرة . ما روى عنه فيما أعلم سوى مستلم بن سعيد فأتى بخبر منكر عنه ... " مجہول ہے، میرے علم کے مطابق مستلم بن سعید کے علاوہ کسی نے اس سے روایت نہیں کی، پس وہ (مستلم) اس سے منکر خبر لایا ہے...(میزان الاعتدال ۱/ ۴۶۰ ت ۱۷۲۲، وقال الذہبی: "حجاج بن الاسود" وھو خطأ من الذہبی والصواب: "حجاج" من غیر "ابن الاسود")

اگر کوئی آدمی حافظ ابن حجر کے حوالے سے کہے کہ حجاج سے مراد حجاج بن ابی زیاد الاسود البصری ہے تو عرض ہے کہ یہ تعیین کئی وجہ سے غلط ہے:

۱: حافظ ذہبی جو کہ بقولِ ابن حجر " من أهل الاستقراء التام في نقد الرجال " تھے۔ (نزہۃ النظر شرح نخبۃ الفکر مع شرح الملا علی قاری ص ۷۳۶)

وہ حجاج بن ابی زیاد الاسود القسملی کو اچھی طرح پہچانتے تھے، جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا:

" بصري صدوق ... و كان من الصلحاء و ثقه ابن معين . مات بضع و

أربعين و مائة " (سیر اعلام النبلاء ۷/ ۷۶)

معلوم ہوا کہ حافظ ذہبی کے نزدیک حجاج دو ہیں:

اول: ابن ابی زیاد الاسود زق العسل ، صدوق۔

دوم: نامعلوم ، مجہول۔

۲: مستلم بن سعید سے اس روایت کی کسی صحیح سند میں حجاج کے بعد " بن الاسود " کی صراحت ثابت نہیں اور حسن بن قتیبہ المدائنی (متروک مجروح ، ضعفہ الجمہور) کی جس روایت میں یہ صراحت آئی ہے ، وہ مردود و باطل ہے۔

حسن بن قتیبہ متروک وھالک کی روایت مسند البزار ، الفوائد لتمام الرازی ، الکامل لابن عدی ، حیاۃ الانبیاء للبیہقی اور تاریخ دمشق لابن عساکر میں موجود ہے۔

(دیکھئے الصحیحۃ للالبانی ۲/ ۱۸۷ ح ۶۲۱)

اگر کوئی کہے کہ تہذیب الکمال میں مستلم بن سعید کے شیوخ میں حجاج بن ابی زیاد الاسود کا ذکر کیا گیا ہے ، تو عرض ہے کہ ذہبی کے اختلاف مذکور کے بعد یہ ذکر نا قابلِ حجت ہے۔ جو لوگ حجاج (مجہول) کو ضرور بالضرور ابن الاسود ثابت کرنے پر بضد ہیں ، انھیں چاہیے کہ اس کا ثبوت صحیح سند سے پیش کریں۔

فائدہ: المستلم بن سعيد عن حجاج عن ثابت والی روایت اخبار اصفہان لابی نعیم الاصبہانی (۲/ ۸۳) میں موجود ہے ، لیکن اس کی سند ضعیف ہے اور الفاظ درج ذیل ہیں: " الأنبياء في قبورهم يصلون "

یعنی اس میں " أحياء " کا لفظ ہی نہیں ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ مذکورہ عجیب و غریب روایت بلحاظِ سند صحیح نہیں ، لہٰذا محمد عباس رضوی بریلوی کا اپنی کتاب " واللہ آپ زندہ ہیں " میں اوراق کے اوراق لکھنا چنداں مفید نہیں ہے۔

امام بیہقی کا اس روایت کو صحیح کہنا ان کی کتاب سے ثابت نہیں اور حافظ ابن حجر کی نقل

منقطع و بے سند ہے۔ خود حافظ ابن حجر سے اس روایت کو صحیح قرار دینا ثابت نہیں اور سبکی کا ذہبی کے مقابلے میں کوئی مقام نہیں ہے۔

ہیثمی کا اس روایت کے راویوں کو ثقہ قرار دینا حجاج مجہول کی وجہ سے غلط ہے اور سیوطی متاخرین میں سے تھے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ روایت اصولِ حدیث و اسماء الرجال کی وجہ سے صحیح نہیں اور اس کے تمام شواہد بھی ضعیف و مردود ہیں۔

اس باب میں صرف صحیح مسلم کی وہ حدیث ثابت ہے جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (معراج کی رات) موسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ خاص معجزہ ہے اور اس سے عام استدلال محلِ نظر ہے۔ واللہ اعلم

انبیائے کرام کی برزخی زندگی (حیاۃ الانبیاء) کے لئے دیکھئے میری کتاب: تحقیقی مقالات (ج ۱ ص ۱۹۔۲۶)

کیا نبی ﷺ کے والد بھی ذبیح تھے؟

سوال بعض خطباء کا کہنا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کے آباؤ اجداد میں دو ذبیح ہیں۔ ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے آپ ﷺ کے والد عبداللہ۔

دوسرے مبینہ ذبیح کے بارے میں عبدالمطلب کا نذر و نیاز والا طویل واقعہ بیان کرتے ہیں اس کی تحقیق درکار ہے۔ (محمد صدیق تلیاں، سمندر کٹھہ ایبٹ آباد)

الجواب اس بارے میں صحابہ و تابعین وغیرہم کے درمیان اختلاف تھا کہ ذبیح کون ہیں: اسماعیل یا اسحاق علیہما السلام؟ لیکن راجح یہی ہے کہ ذبیح سے مراد سیدنا اسماعیل علیہ السلام ہیں نہ کہ سیدنا اسحاق علیہ السلام۔

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ھو إسماعیل'' وہ اسماعیل ہیں۔ (تفسیر ابن جریر محققہ ۹/۱۸ ح ۲۹۵۲۹ وسندہ صحیح، وصححہ الحاکم

علی شرط الشیخین ۲/۵۵۵ ح ۴۰۳۸ ووافقہ الذہبی)

امام عامر بن شراحیل الشعبی رحمہ اللہ (تابعی) نے فرمایا: وہ اسماعیل ہیں اور مینڈھے کے دونوں سینگ کعبے میں لٹکے ہوئے تھے۔ (تفسیر ابن جریر ۱۹/۵۱۹ ح ۲۹۵۸۷ وسندہ صحیح)

تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر (۵/۳۵۰۔۳۵۱، الصافات: ۱۰۱)

مسند احمد میں ہے کہ جب اسماعیل (علیہ السلام) کو ذبح کے لئے لٹایا گیا تو انھوں نے سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ (ج ۱ ص ۲۹۷ ح ۲۷۰۷ وسندہ صحیح)

اس حدیث کے راوی ابو عاصم الغنوی رحمہ اللہ کے بارے میں امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: "ثقة" (کتاب الجرح والتعدیل ۹/۴۱۴ وسندہ صحیح)

اس زبردست توثیق کے بعد ان پر کوئی جرح ثابت نہیں، لہٰذا امام ابو حاتم الرازی کا انھیں نہ پہچاننا، یا اُن کا نام معلوم نہ ہونا کوئی مضر نہیں ہے۔

محمد بن کعب بن سُلیم القرظی (ثقہ تابعی) رحمہ اللہ نے اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح قرار دیا۔

(دیکھئے المستدرک ۲/۵۵۵ ح ۴۰۳۹ وسندہ حسن)

تورات سے یہ ثابت ہے کہ جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام چھیاسی (۸۶) سال کے تھے۔ (پیدائش ۱۶:۱۶)

اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام سو (۱۰۰) سال کے تھے۔

(تورات/ پیدائش ۲۱:۵)

ثابت ہوا کہ اسماعیل علیہ السلام اکلوتے بیٹے تھے اور موجودہ محرّف تورات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ (پیدائش ۲۲: ۱۵۔۱۶)

☆ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أنا ابن الذبیحین" میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔ / لیکن اس روایت کی کوئی سند اور اصل نہیں ہے۔

(دیکھئے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ للالبانی: ۳۳۱)

ایک روایت میں نبی کریم ﷺ کے والد عبداللہ کے بارے میں آیا ہے کہ

"آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے جب چاہ زمزم کھودا تو نذر مانی تھی کہ اگر یہ کام آسانی سے پورا ہو گیا تو میں اپنے ایک لڑکے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کروں گا۔ جب کام ہو گیا اور قرعہ اندازی کی گئی کہ کس بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کریں؟ تو حضور ﷺ کے والد عبداللہ کا نام نکلا۔ ان کے ننھیال والوں نے کہا کہ آپ ان کی طرف سے ایک سو اونٹ اللہ کی راہ میں ذبح کر دیں، چنانچہ وہ ذبح کر دیئے گئے۔"

(تفسیر ابن کثیر مترجم ۳۲۲/۴، المستدرک للحاکم ۵۵۴/۲ ح ۴۰۳۶)

اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ اس میں عبداللہ بن سعید الصنابحی مجہول راوی ہے۔

(دیکھئے میزان الاعتدال ۴۲۹/۲ رقم ۴۳۴۸)

اور حافظ ذہبی نے فرمایا: "إسناده واہٍ" اس کی سند سخت کمزور ہے۔

(تلخیص المستدرک ۵۵۴/۲)

مختصر یہ کہ نبی ﷺ کے والد کے بارے میں ذبیح ہونے والی روایت ثابت نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ (۲۰/ نومبر ۲۰۱۰ء)

جماعت المسلمین سے کیا مراد ہے؟

سوال عرض ہے کہ "جماعت المسلمین" (رجسٹرڈ) بخاری و مسلم کی اس (آنے والی) حدیث کو اپنے حق میں پیش فرماتے ہیں، جبکہ ہمیں ان کے اس فہم و استفادہ سے، اس طرح کے استدلال سے اختلاف ہے۔ براہِ مہربانی خیر القرون کے فہم و استفادہ سے مستفیض فرمائیں۔

زیرِ تحت باب كيف الأمر إذا لم تكن جماعة میں حدیث نمبر ۱۹۶۸... قال : تلزم جماعة المسلمين و إمامهم . قلت :فإن لم يكن لهم جماعة و لا إمام؟ قال :فاعتزل تلك الفرق كلها و لو أن تعض بأصل شجرة حتى يدركك الموت و أنت على ذلك . (ج ۳ ص ۷۷۹)

صحیح مسلم، کتاب الامارۃ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظہور الفتن و فی کل حال۔ (ج ۲ص ۱۲۷)

محترم! اس تناظر میں قرون ثلاثہ کے حوالے سے مکمل راہنمائی فرمائیں کہ "جماعت المسلمین" (رجسٹرڈ) اس بنیاد پر

۱: سب لوگوں کو گمراہ اور اپنے آپ کو کاملاً صحیح سمجھتے ہیں۔

۲: اپنی کئی کتب مثلاً (۱) دعوتِ اسلام (ص ۴۷۔۴۸) میں ۳۴ مذہبی جماعتوں (۲) دعوتِ فکر و نظر (ص ۴۹) میں ۳۳ مذہبی جماعتوں اور لمحہ فکریہ (ص ۴۲) وغیرہ میں ۳۳ مذہبی جماعتوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ (جماعتیں) چونکہ "جماعت المسلمین" (رجسٹرڈ سے) وابستہ نہیں، لہٰذا گمراہ ہیں۔

۳: سیاسی جماعتوں کا اس (میں) مطلق ذکر نہ (ہونا) بھی کسی خطرے سے خالی نہیں۔

براہِ کرم اپنے قیمتی لمحات میں سے کچھ وقت خصوصی راہنمائی کے لئے ضرور وقف فرمائیں۔ (طالب اصلاح و خیر: طارق محمود، سعید آنوز دینہ جہلم)

الجواب اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اور صحیح حدیث حجت ہے اور قرآن و حدیث سے اجماعِ امت کا حجت ہونا ثابت ہے، لہٰذا ادلۂ شرعیہ تین ہیں:

۱: قرآن مجید

۲: احادیث صحیحہ و حسنہ لذاتہا، مرفوعہ

۳: اجماعِ امت

سبیل المومنین والی آیت کریمہ اور دیگر دلائل سے درج ذیل دو اہم اصول بھی ثابت ہیں:

۱: کتاب و سنت کا صرف وہی مفہوم معتبر ہے جو سلف صالحین (مثلاً صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، علمائے دین اور صحیح العقیدہ شارحین حدیث) سے متفقہ یا بغیر اختلاف کے ثابت ہے۔

۲: اجتہاد، مثلاً آثارِ سلف صالحین سے استدلال۔

اس تمہید کے بعد سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث:

((تلزم جماعة المسلمين و إمامهم .)) مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کو لازم پکڑلو، کی تشریح میں عرض ہے کہ جماعت المسلمین سے مراد خلافت المسلمین اور إمامهم سے مراد خلیفتهم (یعنی خلیفہ) ہے۔ اس تشریح کی دو دلیلیں درج ذیل ہیں:

۱: (سبیع بن خالد) الیشکری رحمہ اللہ (ثقہ تابعی) کی سند سے روایت ہے کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((فإن لم تجد يومئذ خليفةً فاهرب حتى تموت ...)) پھر اگر تم ان ایام میں کوئی خلیفہ نہ پاؤ تو بھاگ جاؤ حتیٰ کہ مر جاؤ۔

(سنن ابی داود: ۴۲۴۷، وسندہ حسن، مسند ابی عوانہ ۴/ ۴۲۰ ح ۷۱۶۸ شاملہ)

اس حدیث کے راویوں کی مختصر توثیق درج ذیل ہے:

(۱) سبیع بن خالد الیشکری رحمہ اللہ

انھیں ابن حبان، امام عجلی، حاکم، ابوعوانہ اور ذہبی نے ثقہ وصحیح الحدیث قرار دیا ہے، لہٰذا اس زبردست توثیق کے بعد انھیں مجہول یا مستور کہنا غلط ہے۔

(۲) صخر بن بدر العجلی رحمہ اللہ

انھیں ابن حبان اور ابوعوانہ نے ثقہ وصحیح الحدیث قرار دیا ہے، اس توثیق کے بعد شیخ البانی رحمہ اللہ کا انھیں مجہول قرار دینا غلط ہے۔

(۳) ابوالتیاح یزید بن حمید رحمہ اللہ

صحیحین وسنن اربعہ کے راوی اور ثقہ ثبت تھے۔

(۴) عبدالوارث بن سعید رحمہ اللہ

صحیحین وسنن اربعہ کے راوی اور ثقہ ثبت تھے۔

(۵) مسدد بن مسرہد رحمہ اللہ

صحیح بخاری وغیرہ کے راوی اور ثقہ حافظ تھے۔

ثابت ہوا کہ یہ سند حسن لذاتہ ہے اور قتادہ (ثقہ مدلس) کی عن نصر بن عاصم عن سبیع

بن خالد والی روایت صخر بن بدر کی حدیث کا شاہد ہے جو کہ مسعود احمد بی ایس سی کے ''اصولِ حدیث'' کی رُو سے سبیع بن خالد رحمہ اللہ تک صحیح ہے۔

(دیکھئے سنن ابی داود: ۴۲۴۴ وصححہ الحاکم ۴/ ۴۳۲۔۴۳۳ ووافقہ الذہبی)

اس حسن روایت سے ثابت ہوا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں امام سے مراد خلیفہ ہے۔ یاد رہے کہ حدیث حدیث کی تشریح کرتی ہے۔

۲: حافظ ابن حجر العسقلانی نے ''تلزم جماعة المسلمین و إمامهم'' کی تشریح میں فرمایا: "قال البیضاوي: المعنی إذا لم یکن في الأرض خلیفة فعلیك بالعزلة و الصبر علی تحمل شدة الزمان و عض أصل الشجرة کنایة عن مکابدة المشقة." (قاضی) بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر زمین میں خلیفہ نہ ہو تو تم (سب سے) علیحدہ ہو جانا اور زمانے کی سختیوں پر صبر کرنا۔ درخت کی جڑ چبانے کے اشارے سے مراد مصیبتیں برداشت کرنا ہے۔ (فتح الباری ۱۳/ ۳۶ ونسخہ اخری ۱۶/ ۴۸۷)

حافظ ابن حجر نے محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۰ھ) سے نقل کیا کہ ''والصواب أن المراد من الخبر لزوم الجماعة الذین في طاعة من اجتمعوا علی تأمیره فمن نکث بیعته خرج عن الجماعة ، قال : و في الحدیث أنه متی لم یکن للناس إمام فافترق الناس أحزابًا فلا یتبع أحدًا في الفرقة و یعتزل الجمیع إن استطاع ذلك ... '' اور صحیح یہ ہے کہ (اس) حدیث سے مراد اس جماعت کو لازم پکڑنا ہے جو اس (امام) کی امارت پر جمع ہوتے ہیں، پس جس نے اپنی بیعت توڑ دی وہ جماعت سے خارج ہو گیا۔ فرمایا: اور حدیث میں (یہ بھی) ہے کہ اگر لوگوں کا امام (امیر بالاجماع) نہ ہو اور لوگوں نے پارٹیاں بنا رکھی ہوں تو دورِ اختلاف میں کسی ایک کی اتباع نہ کرے اور اگر طاقت ہو تو تمام (پارٹیوں) سے علیحدہ رہے۔

(فتح الباری ۱۳/ ۳۶ ونسخہ اخری ۱۶/ ۴۸۷)

شارح صحیح البخاری علامہ علی بن خلف بن عبد الملک ابن بطال القرطبی (متوفی

۴۴۹ھ) نے فرمایا: " و فيه حجة لجماعة الفقهاء في وجوب لزوم جماعة المسلمين و ترك القيام على أئمة الجور " اور اس (حدیث) میں جماعت فقہاء کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا چاہیے اور ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج نہیں کرنا چاہیے۔ (شرح صحیح بخاری لابن بطال ۱۰/ ۳۶)

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے ایک ٹکڑے کی تشریح میں فرمایا:

" وهو كناية عن لزوم جماعة المسلمين و طاعة سلاطينهم ولو عصوا " اور یہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کو لازمی پکڑا جائے اور مسلمانوں کے سلاطین (حکمرانوں) کی اطاعت کی جائے، اگرچہ وہ نافرمانیاں کریں۔ (فتح الباری ۱۳/ ۳۶)

شارحینِ حدیث (ابن جریر طبری، قاضی بیضاوی، ابن بطال اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ) کی ان تشریحات (فہمِ سلف صالحین) سے ثابت ہوا کہ حدیث مذکور ((تلزم جماعة المسلمين و إمامهم)) سے مروجہ جماعتیں اور پارٹیاں (مثلاً مسعود احمد بی ایس سی کی جماعت المسلمین رجسٹرڈ) مراد نہیں بلکہ مسلمین (مسلمانوں) کی متفقہ خلافت اور اجماعی خلیفہ مراد ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ((من مات و ليس له إمام مات ميتة جاهلية)) "جو شخص فوت ہو جائے اور اس کا امام (خلیفہ) نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔"

(صحیح ابن حبان ۱۰/ ۴۳۴ ح ۴۵۷۳ و هو حديث حسن)

اس حدیث کی تشریح میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا: کیا تجھے پتا ہے کہ (اس حدیث میں) امام کسے کہتے ہیں؟ (امام اسے کہتے ہیں) جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو جائے (اور) ہر آدمی یہی کہے کہ یہ امام (خلیفہ) ہے۔

پس اس حدیث کا یہی معنی ہے۔ (سوالات ابن ہانی: ۲۰۱۱، تحقیقی مقالات ۱/ ۴۰۳)

اس تشریح سے بھی یہی ثابت ہے کہ "و إمامهم" سے مراد وہ خلیفہ (امام) ہے، جس کی خلافت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو چکا ہو اور اگر کسی پر پہلے سے ہی اختلاف ہو تو وہ

اس حدیث میں مراد نہیں ہے، لہٰذا فرقۂ مسعودیہ ''جماعت المسلمین رجسٹرڈ'' کا اس حدیث سے اپنی خودساختہ ونوزائدہ ''فرقی'' مراد لینا غلط، باطل اور بہت بڑا افراڈ ہے۔

آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ کیا کسی ثقہ وصدوق امام، محدث، شارح یا عالم نے زمانۂ خیر القرون، زمانۂ تدوینِ حدیث اور زمانۂ شارحین حدیث (پہلی صدی سے نویں صدی ہجری تک) میں اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ جماعت المسلمین سے خلافت مراد نہیں اور امامہم سے خلیفہ مراد نہیں، بلکہ کاغذی رجسٹرڈ جماعت اور اس کا کاغذی بے اختیار امیر مراد ہے؟! اگر اس کا کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں، ورنہ عامۃ المسلمین کو گمراہ نہ کریں۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے محترم ابو جابر عبداللہ دامانوی حفظہ اللہ کی کتاب: '' الفرقة الجديدة ''

(۲۴/ستمبر ۲۰۱۱ھ، جامعۃ الامام البخاری، مقامِ حیات سرگودھا)

مسلمان ہونے کی شرائط اور اہلِ قبلہ کی تکفیر

سوال کیا قبلہ کی طرف رخ کرنے والے سارے لوگ مسلمان ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (محمد فیاض دامانوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب قبلہ (بیت اللہ) کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے والے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے یا کہلوانے والے سارے لوگ مسلمان نہیں، بلکہ ان میں ختمِ نبوت کے منکرین، مثلاً قادیانیہ و بہائیہ وغیرہما اور ان جیسے کفریہ عقائد رکھنے والے لوگ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ درج ذیل ایمانیات وعقائد پر صحیح اور سچا ایمان رکھے:

۱: قرآن مجید کے کلام اللہ، برحق اور غیر مخلوق ہونے پر ایمان

جو لوگ قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں یا قرآن مجید کو مخلوق کہتے ہیں، وہ لوگ کافر ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

۲: رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ پر ایمان

۳: جو عقیدہ و عمل قرآن و احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس پر ایمان، مثلاً حیاتِ مسیح علیہ السلام، نزولِ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، خروج دجال لعین اور دیگر عقائد صحیحہ

۴: ختم نبوت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے) پر ایمان

۵: توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید الاسماء والصفات پر ایمان

۶: شعائر اللہ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بیت اللہ، کتاب اللہ اور صحیح حدیث وغیرہ کی تکریم و تعظیم اور اس سے محبت کرنا اور ہر قسم کی صریح و غیر صریح گستاخیوں سے مکمل بچنا۔

۷: ضروریاتِ دین والے عقائد و مسائل پر ایمان

۸: ثابت شدہ اور ناقابلِ تردید اجماعِ امت پر ایمان

۹: تقدیر پر ایمان ۱۰: فرشتوں پر ایمان

۱۱: آسمانی کتابوں مثلاً تورات، زبور، انجیل اور صحفِ ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام پر ایمان کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں اور یہود و نصاریٰ نے بعد میں آسمانی کتابوں میں تحریف و تبدیلی کردی۔

۱۲: تمام رسولوں اور انبیاء کی رسالت و نبوت پر ایمان

۱۳: توحید پر ایمان

۱۴: شرک سے کلیتًا اجتناب

۱۵: شیاطین اور ان کی ذریت، نیز طواغیت اور مقلدینِ طواغیت سے براءت کا اعلان (وغیر ذلک)

تفصیل کے لئے مطولات (مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم کی کتاب الایمان اور امام آجری کی کتاب الشریعہ وغیرہ) کا مطالعہ مفید ہے، یا اپنے قریبی صحیح العقیدہ علماء سے رابطہ رکھیں۔

یہ وہ ایمانیات ہیں، جن میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی انسان دائرہ اسلام سے باہر ہو جاتا ہے۔

نیز دیکھئے راقم الحروف کی ترجمہ کردہ کتاب: ''شرح حدیث جبریل علیہ السلام''

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک اور حیاتِ برزخیہ

سوال رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک میں برزخی حیات سے متعلق علمائے اہلِ سنت کا عقیدہ کیا ہے؟

الجواب رسول اللہ ﷺ وفات کے بعد دنیا سے تشریف لے گئے ہیں، جیسا کہ ''خرج رسول الله ﷺ من الدنیا'' والی حدیث سے ثابت ہے۔ (صحیح بخاری:۵۴۱۴)

رسول اللہ ﷺ اپنی قبر میں عالم برزخ میں زندہ ہیں جیسا کہ حافظ ذہبی نے فرمایا: اور آپ (ﷺ) اپنی قبر میں برزخی طور پر زندہ ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء ۱۶۱/۹، تحقیقی مقالات ج۱ص۲۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا: ''لِأَنَّهُ بَعْدَ مَوْتِهِ وَإِنْ كَانَ حَيًّا فَهِيَ حَيَاةٌ أُخْرَوِيَّةٌ لَا تَشْبَهُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ''

آپ (ﷺ) اپنی وفات کے بعد اگرچہ زندہ ہیں، لیکن یہ اُخروی زندگی ہے جو دنیاوی زندگی کے مشابہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم (فتح الباری ۳۴۹/۷ ح۴۰۴۲)

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ وفات کے بعد زندہ ہیں، لیکن آپ کی یہ زندگی اُخروی اور برزخی ہے، دنیاوی نہیں ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ پر وفات نہیں آئی یا آپ دنیاوی طور پر زندہ ہیں، ان لوگوں کی یہ دونوں باتیں قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت نہیں اور نہ اکابر علمائے اہلِ سنت سے ہی اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے، لہٰذا یہ عقیدہ غلط ہے۔

سعودی عرب کے مشہور شیخ صالح الفوزان نے کہا: جو شخص یہ کہتا ہے کہ آپ (ﷺ) کی برزخی زندگی دنیا کی طرح ہے وہ شخص جھوٹا ہے۔ یہ من گھڑت باتیں کرنے والوں کا کلام ہے۔

(التعلیق المختصر علی القصیدۃ النونیہ ج۲ص۶۸۴)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی ایسے لوگوں کی تردید کی ہے جو برزخی حیات کے بجائے دنیاوی حیات کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ (دیکھئے النونیہ فصل فی الکلام فی حیاۃ الانبیاء فی قبورھم ۲/۱۵۴، ۱۵۵)

جھوٹی قسم کا کفارہ

سوال اگر کسی نے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھالی، بعد میں احساس ہوا تو اس کا کیا کفارہ ہوگا؟ (ایک سائلہ)

الجواب سب سے پہلے عرض ہے کہ جھوٹی قسم کھانا حرام ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (۶۶۷۵، ۶۹۲۰) اور صحیح مسلم (۱۳۸) وغیرہما کی احادیث سے ثابت ہے اور غلط کام کی قسم کھا لینا بھی ناجائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ نَذَرَ أن يُّطِيْعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ وَ مَنْ نَذَرَ أن يَّعْصِيَ اللّٰهَ فَلَا يَعْصِهِ .)) "جس شخص نے اللہ کی اطاعت کرنے کی نذر مانی ہو تو وہ اللہ کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی ہو تو وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔" (موطا امام مالک تحقیقی، روایۃ ابن القاسم ص ۲۸۱ ح ۱۸۸، صحیح بخاری: ۶۶۹۶)

اب رہا یہ سوال کہ جھوٹی اور نافرمانی والی قسم کھانے والے پر کوئی کفارہ ہے یا نہیں؟

تو اس بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں:

① کفارہ نہیں ہے۔ ② کفارہ ہے۔

اور ہماری تحقیق میں یہی دوسرا قول راجح ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا نَذْرَ فِيْ مَعْصِيَةٍ وَ كَفَّارَتُهَا كَفَّارَةُ الْيَمِيْنِ .))

نافرمانی میں کوئی نذر نہیں اور اس (نافرمانی والی نذر) کا وہی کفارہ ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔

(سنن نسائی، کتاب الایمان والنذور، کفارۃ النذر ۷/ ۲۷ ح ۳۸۶۹ وسندہ صحیح)

امام ابوداود نے اس حدیث پر " من رأى عليه كفّارة إذا كان في معصية " جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کفارہ ہے، اگر (قسم) نافرمانی (گناہ) میں (بھی) ہو۔ کا باب باندھا ہے۔ (قبل ح ۳۲۹۰)

ایک عورت نے آکر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بتایا کہ میں نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانی ہے تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اپنے بیٹے کو ذبح نہ کرنا اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو۔ الخ (موطأ امام مالک، روایۃ یحییٰ ۲/ ۴۷۶ ح ۱۰۴۸، وسندہ صحیح، الاتحاف الباسم ص ۲۸۱)

ثابت ہوا کہ غلط اور جھوٹی قسم پر عمل کرنا حرام ہے، لیکن اس قسم کا کفارہ دینا پڑے گا، اور امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ نے بھی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: " و من حلف عامدًا للكذب فقال: والله! لقد كان كذا و كذا ولم يكن أو والله! ما كان كذا و قد كان، كفّر و قد أثم و أساء حيث عمد الحلف بالله باطلاً، فإن قال: و ما الحجة في أن يكفّر و قد عمد الباطل؟ قيل: أقربها قول النبي ﷺ: ((فليأت الذي هو خير و ليكفّر عن يمينه .)) فقد أمره أن يعمد الحنث ."

جس شخص نے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی (مثلاً) کہا: اللہ کی قسم! اس طرح، اس طرح ہوا ہے اور اس طرح ہوا نہیں تھا یا اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوا اور (حالانکہ) ایسا ہوا تھا، وہ کفارہ دے گا اور اس نے گناہ کیا اور باطل بات پر اللہ کی قسم کھا کر بُرا کام کیا۔ اگر کہا جائے کہ باطل کے ارادے پر (جھوٹی قسم کے) کفارے کی دلیل کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث: "پس اچھی بات پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی قسم کا کفارہ دینا چاہیے" اس کی اقرب ترین دلیل ہے، کیونکہ آپ نے اسے قسم توڑنے کا حکم دیا ہے۔

(کتاب الام ج ۷ ص ۶۱، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۳۶)

امام شافعی رحمہ اللہ کی بیان کردہ حدیث صحیح بخاری (۶۶۲۳) اور صحیح مسلم (۱۶۴۹، ۱۶۵۲) وغیرہما میں مختلف الفاظ کے ساتھ مذکور ہے۔

خلاصۃ الجواب یہ ہے کہ ایسی حالت میں قسم توڑنا ضروری ہے اور اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا جو دس مسکینوں کو (عام) کھانا کھلانا، یا کپڑے پہنانا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر تین روزے رکھنا ضروری ہیں۔ (دیکھئے سورۃ المائدہ: ۸۹)

اہلِ حدیث کب سے ہیں اور دیو بندیہ و بریلویہ کا آغاز کب ہوا؟

سوال ہم لوگ یہ سنتے رہتے ہیں کہ اہلِ حدیث حضرات انگریزوں کے دور میں شروع ہوئے ہیں۔ پہلے ان لوگوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ براہِ مہربانی پاک و ہند کے گزشتہ دور کے اہلِ حدیث علماء کے نام مختصر تعارف کے ساتھ تحریر فرمادیں۔ شکریہ

(محمد فیاض داماٹوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب جس طرح عربی زبان میں "أهل السنة" کا مطلب ہے: سنت والے۔ اسی طرح اہل الحدیث کا مطلب ہے: حدیث والے۔

جس طرح سنت والوں سے مراد صحیح العقیدہ سُنی علماء اور اُن کے صحیح العقیدہ عوام ہیں، اسی طرح حدیث والوں سے مراد صحیح العقیدہ محدثین کرام اور ان کے صحیح العقیدہ عوام ہیں۔

یاد رہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ حدیث ایک ہی گروہ کے دو صفاتی نام ہیں۔

صحیح العقیدہ محدثین کرام کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً

۱: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

۲: تابعین عظام رحمہم اللہ

۳: تبع تابعین

۴: اتباع تبع تابعین

۵: حفاظِ حدیث

۶: راویانِ حدیث

۷: شارحینِ حدیث وغیرہم رحمہم اللہ

صحیح العقیدہ محدثین کے صحیح العقیدہ عوام کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً:

۱: بہت پڑھے لکھے لوگ

۲: درمیانے پڑھے لکھے لوگ

۳: تھوڑے پڑھے لکھے لوگ

۴: ان پڑھ عوام

یہ کل (۷ + ۴) گروہ اہلِ حدیث کہلاتے ہیں اور ان کی اہم ترین نشانیاں درج ذیل ہیں:

۱: قرآن و حدیث اور اجماعِ اُمت پر عمل کرنا۔

۲: قرآن و حدیث اور اجماع کے مقابلے میں کسی کی بات نہ ماننا۔

۳: تقلید نہ کرنا۔

۴: اللہ تعالیٰ کو سات آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ماننا۔ کما یلیق بشأنہ

۵: ایمان کا مطلب دِلی یقین، زبانی قول اور جسمانی عمل ماننا۔

۶: ایمان کی کمی بیشی کا عقیدہ رکھنا۔

۷: کتاب و سنت کو سلف صالحین کے فہم پر سمجھنا اور اس کے مقابلے میں ہر شخص کی بات کو رد کر دینا۔

۸: تمام صحابہ، ثقہ و صدوق تابعین، تبع تابعین و اتباع تبع تابعین اور تمام ثقہ و صدوق صحیح العقیدہ محدثین سے محبت کرنا۔ وغیر ذلک

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا:

''صاحب الحدیث عندنا من یستعمل الحدیث'' ہمارے نزدیک صاحبِ حدیث وہ ہے جو حدیث پر عمل کرے۔ (الجامع للخطیب: ۱۸۶، وسندہ صحیح)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ونحن لا نعني بأهل الحديث المقتصرين علٰى سماعه أو كتابته أو روايته بل نعني بهم: كل من كان أحق بحفظه و معرفته و فهمه ظاهرًا و باطنًا. واتباعه باطنًا و ظاهرًا.''

اور ہم اہلِ حدیث سے مراد صرف سامعینِ حدیث، کاتبینِ حدیث یا راویانِ حدیث

ہی نہیں لیتے بلکہ ہم اُن سے ہر وہ شخص مراد لیتے ہیں جو اسے کما حقہ یاد رکھتا ہے، ظاہری و باطنی معرفت وفہم رکھتا ہے، اور باطنی وظاہری اتباع کرتا ہے۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ۴/ ۹۵)

حافظ ابن تیمیہ کے مذکورہ قول سے بھی اہلِ حدیث (کثرھم اللہ) کی دو قسمیں ثابت ہیں:

۱: عاملین بالحدیث محدثین کرام

۲: حدیث پر عمل کرنے والے عوام

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے:

اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں میں سے فرقہ ناجیہ ہونے کا سب سے زیادہ مستحق اہل الحدیث والسنۃ ہیں، جن کا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی متبوع (امام) نہیں جس کے لیے وہ تعصب رکھتے ہوں۔ (مجموع فتاویٰ ۳/ ۳۴۷)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۂ بنی اسرائیل (آیت: ۷۱) کی تفسیر میں بعض سلف (صالحین) سے نقل کیا ہے: ''هذا أكبر شرف لأصحاب الحديث لأن إمامهم النبي ﷺ''

یہ اصحاب الحدیث کی سب سے بڑی فضیلت ہے، کیونکہ ان کے امام نبی ﷺ ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۶۴، الاسراء: ۷۱)

علامہ سیوطی نے بھی لکھا ہے: ''ليس لأهل الحديث منقبة أشرف من ذلك لأنه لا إمام لهم غيره ﷺ'' اہلِ حدیث کے لئے اس سے زیادہ فضیلت والی کوئی بات نہیں، کیونکہ ان کا آپ ﷺ کے علاوہ دوسرا کوئی امام (متبوع) نہیں۔

(تدریب الراوی ۲/ ۱۲۶ النوع: ۲۷)

امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور امام علی بن المدینی وغیرہم (رحمہم اللہ) نے اہل الحدیث کو طائفہ منصورہ قرار دیا ہے۔ (دیکھئے معرفۃ علوم الحدیث للحاکم: ۲ و صححہ ابن حجر العسقلانی فی فتح الباری ۱۳/ ۲۹۳ تحت ح ۷۳۱۱، مسألۃ الاحتجاج بالشافعی للخطیب ص ۴۷، سنن ترمذی مع عارضۃ الاحوذی ۹/ ۷۴ ح ۲۲۲۹)

امام بخاری و امام مسلم کے ثقہ استاذ امام احمد بن سنان الواسطی رحمہ اللہ نے فرمایا: دنیا میں ایسا کوئی بدعتی نہیں جو اہل الحدیث سے بغض نہیں رکھتا۔ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۴ وسندہ صحیح)

امام قتیبہ بن سعید الثقفی (متوفی ۲۴۰ھ بعمر ۹۰ سال) نے فرمایا: جب تُو کسی آدمی کو دیکھے کہ وہ اہل الحدیث سے محبت کرتا ہے تو (سمجھ لے کہ) وہ شخص سنت پر ہے۔

(شرف اصحاب الحدیث للخطیب: ۱۴۳، وسندہ صحیح)

تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب: تحقیقی مقالات (ج ا ص ۱۶۱۔۱۷۴) اور اہل حدیث ایک صفاتی نام۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے: (امام) مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابویعلیٰ اور بزار وغیرہم اہل الحدیث کے مذہب پر تھے، وہ علماء میں سے کسی متعین کے مقلد نہیں تھے... (مجموع فتاویٰ ۲۰/ ۴۰، تحقیقی مقالات ۱/ ۱۶۸)

عبارات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ اہلِ حدیث سے مراد دو گروہ ہیں:

۱: صحیح العقیدہ اور تقلید نہ کرنے والے سلف صالحین و محدثین کرام

۲: سلف صالحین اور محدثین کرام کے صحیح العقیدہ اور تقلید نہ کرنے والے عوام

راقم الحروف نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں سو سے زیادہ علمائے اسلام کے حوالے پیش کیے ہیں، جو تقلید نہیں کرتے تھے اور ان میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں:

امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن سعید القطان، امام عبداللہ بن المبارک، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداود السجستانی، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام نسائی، امام ابوبکر بن ابی شیبہ، امام ابوداود الطیالسی، امام عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، امام ابوعبید القاسم بن سلام، امام سعید بن منصور، امام بقی بن مخلد، امام مسدد، امام ابویعلیٰ الموصلی، امام ابن خزیمہ، امام ذہلی، امام اسحاق بن راہویہ، محدث بزار، محدث ابن المنذر، امام ابن جریر الطبری اور امام سلطان یعقوب بن یوسف المراکشی المجاہد وغیرہم۔ رحمہم اللہ اجمعین

یہ سب اہلِ حدیث علماء صدیوں پہلے رُوئے زمین پر گزر چکے ہیں۔

ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر البغدادی نے شام، جزیرہ، آذربائیجان اور باب الابواب وغیرہ کی سرحدوں پر رہنے والوں کے بارے میں فرمایا:

وہ تمام اہلِ سنت میں سے اہلِ حدیث کے مذہب پر ہیں۔ (اصول الدین ص ۳۱۷)

ابوعبداللہ محمد بن احمد بن البناء البشاری المقدسی (متوفی ۳۸۰ھ) نے ملتان کے بارے میں فرمایا: "مذاهبهم: أكثرهم أصحاب حديث ..."

ان کے مذاہب: ان میں اکثریت اہلِ حدیث ہے۔ (احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص ۳۶۳)

فرقۂ دیوبندیہ کا آغاز ۱۸۶۷ء میں مدرسۂ دیوبند کی ابتدا کے ساتھ ہوا اور فرقۂ بریلویہ کے بانی احمد رضا خان بریلوی جون ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔

۱: فرقۂ دیوبندیہ اور فرقۂ بریلویہ دونوں کی پیدائش سے بہت پہلے شیخ محمد فاخر بن محمد یحییٰ بن محمد امین العباسی السلفی الہ آبادی رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء) تقلید نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کتاب وسنت کے دلائل پر عمل کرتے اور خود اجتہاد کرتے تھے۔

(دیکھئے نزہۃ الخواطر ۶/ ۳۵۱ ت ۶/ ۳۵۱، تحقیقی مقالات ۲/ ۵۸)

۲: شیخ محمد حیات بن ابراہیم السندھی المدنی رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء) تقلید نہیں کرتے تھے اور عمل بالحدیث کے قائل تھے۔

ماسٹر امین اوکاڑوی نے محمد حیات سندھی، محمد فاخر الہ آبادی اور مبارکپوری تینوں کے بارے میں لکھا ہے: "ان تین غیر مقلدوں کے علاوہ کسی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی نے اسکو سہو کاتب بھی نہیں کہا۔" (تجلیاتِ صفدر ۲/ ۲۴۳، نیز دیکھئے تجلیات صفدر ۵/ ۳۵۵)

۳: ابوالحسن محمد بن عبدالہادی السندھی الکبیر رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۴۱ھ بمطابق ۱۷۲۹ء) کے بارے میں امین اوکاڑوی نے لکھا ہے: "حالانکہ یہ ابوالحسن سندھی غیر مقلد تھا..."

(تجلیات صفدر ۶/ ۴۴)

یہ سب حوالے ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے سے بہت پہلے کے ہیں، لہٰذا آپ نے جن لوگوں سے یہ سنا ہے کہ "اہلِ حدیث حضرات انگریزوں کے دور میں شروع ہوئے ہیں پہلے ان لوگوں کا نام ونشان نہیں تھا" بالکل جھوٹ اور افتراء ہے۔

رشید احمد گنگوہی دیوبندی نے لکھا ہے: "تقریباً دوسری تیسری صدی ہجری میں

اہلِ حق میں فروعی اور جزئی مسائل کے حل کرنے میں اختلافِ انظار کے پیشِ نظر پانچ مکاتبِ فکر قائم ہوگئے یعنی مذاہب اربعہ اور اہلِ حدیث۔ اس زمانے سے لیکر آج تک انہی پانچ طریقوں میں حق کو منحصر سمجھا جاتا رہا۔'' (احسن الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۱۶)

اس عبارت میں لدھیانوی صاحب نے اہلِ حدیث کا قدیم ہونا، انگریزوں کے دور سے بہت پہلے ہونا اور اہلِ حق ہونا تسلیم کیا ہے۔

حاجی امداد اللہ مکی کے ''خلیفۂ مجاز'' محمد انوار اللہ فاروقی ''فضیلت جنگ'' نے لکھا ہے:

''حالانکہ اہل حدیث کل صحابہ تھے''

(حقیقۃ الفقہ حصہ دوم ص ۲۲۸ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)

محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی نے لکھا ہے: ''اہل حدیث تو تمام صحابہ تھے''

(اجتہاد اور تقلید کی بیمثال تحقیق ص ۴۸)

میری طرف سے تمام آلِ دیوبند اور تمام آلِ بریلی سے سوال ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی (یعنی ہندوستان پر انگریزی قبضے کے دور) سے پہلے کیا دیوبندی مسلک یا بریلوی مسلک کا آدمی موجود تھا؟ اگر تھا تو صحیح اور صریح صرف ایک حوالہ پیش کریں اور اگر نہیں تھا تو ثابت ہو گیا کہ بریلوی مذہب اور دیوبندی مذہب دونوں، ہندوستان پر انگریزی قبضے کے بعد کی پیداوار ہیں۔ وما علینا إلا البلاغ (۱۴/فروری ۲۰۱۲ء)

دیوبندی عقائد کا مختصر تحقیقی جائزہ

سوال میرے ایک (دیوبندی) دوست نے مجھے ایک پرچہ (عقائد علمائے اہلسنت دیوبند) کے نام سے فوٹوسٹیٹ کروا کر دیا (جس میں عقیدہ نمبر ۳ تا ۷، عقیدہ نمبر ۹، اور عقیدہ نمبر ۲۴ لکھے ہوئے ہیں) اور (اس دیوبندی نے) کہا: ''یہ عقائد صحیح ہیں اور اہل حدیث حضرات ان کو نہیں مانتے۔''

میں نے سوچا کہ آپ کو خط لکھ کر آپ سے پوچھ لوں۔ میں وہ پرچہ بھی آپ کو روانہ کر

رہا ہوں اور آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ان عقائد کو قرآن وصحیح احادیث کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کا جواب تحقیق کے ساتھ دیں۔ (محمد عرفان، نئی آبادی مورگاہ۔ راولپنڈی)

الجواب مسائل الایمان وعقائد کا دارومدار چار دلائل پر ہے:

۱: قرآن مجید۔

۲: احادیث صحیحہ مرفوعہ۔

۳: ثابت شدہ اجماع اُمت۔

۴: آثارِ سلف صالحین۔

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ مرفوعہ سے مراد وہ نصوص صریحہ واضحہ ہیں، جن میں اہل حق یعنی اہلِ سنت کے نزدیک کوئی تاویل نہیں بلکہ ظاہری معنی ہی مراد ہے، مثلاً نبی کریم ﷺ کا آخری نبی ہونا، اس پر ایمان کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں اور قیامت سے پہلے سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا (آسمان سے) نزول۔ وغیرہ

آثارِ سلف صالحین سے مراد صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور اتباع تبع تابعین رحمہم اللہ یعنی خیر القرون کے وہ آثار ہیں جو صحیح یا حسن لذاتہ سندوں کے ساتھ ثابت ہیں اور ان کے مدلول پر اہل حق کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

خیر القرون کا زمانہ ۳۰۰ ہجری تک ختم ہے۔

خیر القرون کے بعد تدوینِ حدیث کا زمانہ تقریباً ۶۰۰ ہجری تک ہے۔

تدوینِ حدیث کے بعد شارحینِ حدیث کا زمانہ ۹۰۰ ہجری تک ہے۔

سلف صالحین سے مراد صحیح العقیدہ، ثقہ وصدوق عند الجمہور علمائے اہلِ سنت ہیں اور تمام اہل بدعت اس جماعت حقہ سے خارج ہیں۔

جو عقیدہ یا ایمانیات کا مسئلہ ان ادلہ اربعہ سے ثابت نہیں، اہلِ حدیث یعنی اہلِ سنت کے نزدیک وہ عقیدہ باطل اور مردود ہے۔

اس تفصیل کے بعد اب دیوبندی عقائد کی تحقیق پیشِ خدمت ہے:

دیوبندی عقیدہ نمبر ۳: ''وہ حصہ زمین جو جناب رسول اللہ ﷺ کے اعضاء مبارکہ کو مَس کیے ہوئے ہے۔ (یعنی چھوئے ہوئے ہے) علی الاطلاق افضل ہے۔ یہاں تک کہ کعبہ اور عرش وکرسی سے بھی افضل ہے۔ (المہند ص ۱۱، زبدۃ المناسک از رشید احمد گنگوہی)''

تحقیق: رشید احمد گنگوہی اور المہند والے خلیل احمد سہارنپوری انبیٹھوی کے اس عقیدے کی کوئی دلیل قرآن، حدیث، اجماع اور خیر القرون کے آثار سلف صالحین میں موجود نہیں اور نہ امام ابوحنیفہ، قاضی ابو یوسف، ابن فرقد شیبانی یا طحاوی سے ثابت ہے۔

دیوبندی رسالے بینات کراچی اور الیاس گھمن کے قافلے (ج ۸ شمارہ ۱) میں یہ عقیدہ درج ذیل علماء کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے:

۱: قاضی عیاض المالکی (متوفی ۵۴۴ھ)

۲: ابو الولید الباجی (متوفی ۴۷۴ھ)

۳: علی بن احمد السمہودی، صاحب وفاء الوفاء (متوفی ۹۱۱ھ)

۴: ابو الیمن ابن عساکر (متوفی ۶۸۶ھ) ھو عبدالصمد بن عبدالوھاب واللہ اعلم/ دیکھئے اتحاف الزائر ص ۶۳ ج ۱، ابو الیمن ابن عساکر کی عبارت میں عرش اور کرسی کا ذکر نہیں ہے۔

۵: التاج السبکی (متوفی ۷۷۱ھ)

۶: ابن عقیل الحنبلی

۷: التاج الفاکہی

۸: ملا علی القاری (متوفی ۱۰۱۴ھ)

۹: ابن عابدین شامی (متوفی ۱۲۵۲ھ)

یہ سب لوگ خیر القرون کے بہت بعد میں گزرے ہیں۔

قاضی عیاض مالکی کا قول اس کی کتاب ''الشفاء'' میں نہیں ملا، بلکہ قاضی صاحب نے تو یہ لکھا ہے: ''ولا خلاف أن موضع قبره أفضل بقاع الأرض ۔'' اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ ﷺ کی قبر کی جگہ روئے زمین (کے ہر ٹکڑے) سے افضل ہے۔

(الشفاء ج ۲/ ۹۱)

اس میں کرسی اور عرش کا نام ونشان تک نہیں اور محمد یوسف بنوری تقلیدی نے بغیر کسی سند کے بذریعہ الشفاء امام مالک سے نقل کیا ہے: "ان البقعة التی فیها جسد النبی علیہ السلام أفضل من كل شئ حتى الكرسي والعرش...."

(معارف السنن ۳/ ۳۲۳ دیوبندی قافلہ ا/ ۴۸-۴۹)

تمام آلِ دیوبند وآلِ بنوری سے مطالبہ ہے کہ یہ قول صحیح سند کے ساتھ امام مالک سے ثابت کردیں اور اگر نہ کرسکیں تو علانیہ توبہ کریں۔

ابو الولید الباجی کا قول بھی ثابت نہیں اور سمہودی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قاضی عیاض کے قول جیسا ہے، یعنی افضل بقاع الارض والا قول ہے اور ان لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم

سمہودی تو دسویں صدی ہجری کا ایک عالم تھا۔

ابو الیمن ابن عساکر کا حوالہ نہیں ملا اور عین ممکن ہے کہ یہ قاضی عیاض کے مذکور قول (افضل بقاع الارض) جیسا ہی ہو جیسا کہ سمہودی کی عبارت سے ظاہر ہے۔

(دیکھئے وفاء الوفاء ج ۱ ص ۳۱)

سبکی کا اصل حوالہ بھی مطلوب ہے اور سمہودی کی عبارت سے ظاہر ہے کہ تاج سبکی نے ابن عقیل حنبلی سے یہ قول (أن تلك البقعة أفضل من العرش) نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم

ابن عقیل الحنبلی سے مراد اگر لسان المیزان والا ابو الوفاء علی بن عقیل (سابق معتزلی) نہیں تو اس کے تعین میں نظر ہے اور اس کا اصل حوالہ بھی باسند صحیح مطلوب ہے۔

المطالب اولی النھی فی شرح غایۃ المنتھی ۲/ ۳۸۴ میں ایسا ایک حوالہ ابو الوفاء علی بن عقیل کی کتاب الفنون سے نقل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

تاج فاکہی کے تعین میں بھی نظر ہے۔

یہ نو عدد نام (اور ان کے ساتھ خطیب بن جملہ اور کئی متاخرین کو بھی ملایا جائے تو) ان

لوگوں میں سے کوئی بھی خیر القرون میں رُوئے زمین پر موجود نہیں تھا، بلکہ ان کا ظہور شر القرون میں ہوا ہے۔

مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلے پر دو قسم کے اجماعوں کا دعویٰ کیا گیا ہے:

اول: افضل بقاع الارض

دوم: افضل من العرش

اجماع کے ان دعووں کے مقابلے میں حافظ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) نے فرمایا:

''**الحمد لله ،أما نفس محمد ﷺ فما خلق الله خلقًا أكرم عليه منه وأما نفس التراب فليس هو أفضل من الكعبة البيت الحرام بل الكعبة أفضل منه ولا يعرف أحد من العلماء فضل تراب القبر على الكعبة إلا القاضي عياض ولم يسبقه أحد إليه ولا وافقه أحد عليه ـ والله أعلم**''

الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ نے (سیدنا) محمد ﷺ کی ذات سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی اور رہی مٹی تو یہ کعبہ سے افضل نہیں بلکہ کعبہ اس سے افضل ہے۔ قاضی عیاض کے علاوہ علماء میں سے کوئی بھی ایسا معلوم نہیں جو قبر کی مٹی کو کعبہ پر فضیلت دیتا ہو اور اس (قاضی) سے پہلے کسی نے ایسی بات نہیں کہی اور نہ کسی نے اس کی موافقت کی ہے۔ واللہ اعلم

(مجموع فتاویٰ ج ۲۷ص ۳۸۔ الفتاویٰ الکبریٰ ج ۴ص ۴۱۱ مسئلہ ۱۰۱۳)

حافظ ابن عبدالبر نے بھی مدینے اور مکے کی افضلیت کے بارے میں اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے الاستذکار ج ۸ ص ۲۲۱ کتاب الجامع، باب ما جاء فی سکنی المدینۃ والخروج منھا)

سیدنا عبداللہ بن عدی بن الحمراء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکے (بیت اللہ) کے بارے میں فرمایا: ((**والله !إنك لخير أرض الله وأحبّ أرض الله إليّ، والله !لو لاأني أخرجت منك ماخرجت**)) ''اللہ کی قسم! تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر ہے اور میرے نزدیک سب سے پسندیدہ ہے، اللہ کی قسم! اگر مجھے یہاں سے نکالا نہ جاتا تو میں نہ نکلتا۔''

(سنن ابن ماجہ: ۳۱۰۸ وسندہ صحیح، سنن ترمذی: ۳۹۲۵ وقال: ''حسن غریب صحیح''، وصححہ الحاکم علی شرط الشیخین ۳/ ۷ ووافقہ الذہبی)

اس ساری بحث وتحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ آلِ دیوبند کا مذکورہ عقیدہ نہ تو قرآن مجید سے ثابت ہے اور نہ صحیح حدیث سے، نہ تو صحابہ کرام سے ثابت ہے اور نہ تابعین و تبع تابعین سے، نیز حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اختلاف کے بعد اس پر اجماع کا دعویٰ بھی غلط ہے، لہٰذا اس مسئلے میں سکوت کرنا چاہیے۔

میری طرف سے تمام آلِ دیوبند سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنا یہ عقیدہ اپنے مزعوم امام ابوحنیفہ سے ثابت کریں یا خیر القرون کے کسی صحیح العقیدہ موثق عند الجمہور سے ہی ثابت کر دیں اور اگر نہ کر سکیں تو ایسے مسائل میں خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ واللہ اعلم

تنبیہ: رسول اللہ ﷺ کی قبر (حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا) روضة من رياض الجنة (جنت کے باغوں میں سے ایک باغ) ہے۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۱۱۹۶، صحیح مسلم: ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱)

دیوبندی عقیدہ نمبر ۴: ''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دعاؤں میں انبیاء علیہم السلام اور صلحاء و اولیاء شہدا و صدیقین کا توسّل جائز ہے اُن کی حیات میں بھی اور اُن کی وفات کے بعد بھی۔ اس طریقہ پر، کہ، کہے: یا اللہ! میں بوسیلہ فلاں بزرگ کے تجھ سے دعا کی قبولیت اور حاجت برآری چاہتا ہوں، یا اس جیسے اور کلمات کہے۔

(المہند ص ۱۳، فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۱۲،)''

تحقیق: مذکورہ عقیدے میں اموات اور مقتولین کی ذاتوں کا وسیلہ پکڑنا جائز قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اموات و مقتولین کا وسیلہ نہ تو قرآن مجید سے ثابت ہے اور نہ حدیث سے ثابت ہے، نہ تو اجماع سے ثابت ہے اور نہ آثار سلف صالحین سے، بلکہ بعض علماء نے اس کے رد پر کتابیں بھی لکھی ہیں، مثلاً حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''قاعدة جليلة في التوسل والوسيلة'' لکھا ہے اور انھوں نے اس وسیلے کی ممانعت جمہور علماء سے نقل کی ہے۔ (دیکھئے ص ۶۳)

مُردوں کا وسیلہ پکڑنا امام ابوحنیفہ سے بھی ثابت نہیں، بلکہ بطورِ الزامی دلیل عرض ہے

کہ کتبِ فقہ حنفیہ میں امام ابوحنیفہ سے روایت ہے:

''لاينبغي لأحد أن يدعو الله إلا به''

کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اللہ سے غیر اللہ کے ذریعے سے دعا مانگے۔

(ملخصا مفہوما از درمختار ۲/ ۶۳۰، التوسل واحکامہ للألبانی ص ۵۰)

ہدایہ میں لکھا ہوا ہے کہ دعا میں بحق فلان اور بحق انبیائک ورسلک کہنا مکروہ ہے، کیونکہ خالق پر مخلوق کا کوئی حق نہیں۔ (دیکھئے ہدایہ اخیرین ۴/ ۴۷۵ کتاب الکراھیۃ)

بلکہ مرتضٰی زبیدی نے بحقِ فلان وغیرہ کا مکروہ (حرام) ہونا امام ابوحنیفہ، قاضی ابو یوسف اور ابن فرقد تینوں سے نقل کیا ہے۔ (دیکھئے اتحاف السادۃ المتقین ج ۲ ص ۲۸۵ سطر ۱۳) ☆

ثابت ہوا کہ آلِ دیوبند کا مذکورہ عقیدہ نہ تو ادلۂ شریعہ سے ثابت ہے اور نہ امام ابوحنیفہ سے ثابت ہے، لہٰذا ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عقائد کی اصلاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بغیر وسیلے کے دعا مانگیں جس طرح کہ انبیاء ورسل اور صحابہ وتابعین دعائیں مانگتے تھے۔

دیوبندی عقیدہ نمبر ۵: ''آنحضرت ﷺ کی قبر شریف کے پاس حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کرنا اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ حضرت میری مغفرت کی شفاعت فرمائیں۔!

(فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۱۲، فتح القدیر ج ۱ ص ۳۳۸، اور طحطاوی علی المراقی ص ۴۰۰)....''

تحقیق: گنگوہی، ابن ہمام اور طحطاوی ادلۂ شرعیہ کے نام نہیں، بلکہ آلِ تقلید کے چند غالی علماء کے نام ہیں۔

مذکورہ عقیدہ قرآن، حدیث، اجماع اور آثار سے ثابت نہیں اور نہ امام ابوحنیفہ سے ثابت ہے۔

آلِ دیوبند کے اس عقیدے نے واضح کر دیا کہ بریلویوں اور دیوبندیوں میں کوئی فرق نہیں، بلکہ دونوں ایک ہی راستے کے راہی ہیں۔

☆ سرفراز خان صفدر دیوبندی نے کہا: ''دعا میں بحق نبی یا بحق فلاں کہنا مکروہ ہے: یہاں ایک مسئلہ ہے کہ دعا میں بحق نبی یا بحق فلاں کہے تو مکروہ ہے۔ صاحب ہدایہ نے دلیل دی ہے کہ اللہ پر کسی کا حق نہیں ہے۔'' (فوائد صفدریہ ص ۲۱) ندیم ظہیر

دیوبندی عقیدہ نمبر ۶: ''اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس سے صلوٰۃ وسلام پڑھے تو اس کو آپ خود بنفسِ نفیس سنتے ہیں اور دُور سے پڑھے ہوئے صلوٰۃ وسلام کو فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں۔''

تحقیق: فرشتوں کا (مجمل طور پر بغیر کسی کا نام لئے) سلام پہنچانا تو صحیح ہے، جیسا کہ قاضی اسماعیل بن اسحاق کی کتاب فضائل درود سے ثابت ہے۔

(دیکھئے میری کتاب فضائل درود وسلام ص ۶۴، فضل الصلوٰۃ علی النبی ﷺ ح ۲۱ وسندہ صحیح)

قبر کے پاس درود سننے والی روایت سخت ضعیف ومردود ہے۔ (دیکھئے فضائل درود وسلام ص ۱۶)

آلِ دیوبند کا یہ عقیدہ بھی ادلۂ شرعیہ، بلکہ امام ابوحنیفہ سے بھی ثابت نہیں۔

دیوبندی عقیدہ نمبر ۷: ''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے بلا مکلّف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے۔ آنحضرت اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے جو حاصل ہے۔ تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو ''

تحقیق: یہ عقیدہ بھی (حیاۃ دنیویہ غیر برزخیہ کی صراحت کے ساتھ) نہ تو ادلۂ شرعیہ سے ثابت ہے اور نہ امام ابوحنیفہ سے ثابت ہے، بلکہ حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہما کی عبارات سے ثابت ہے کہ یہ زندگی برزخی ہے۔ (دیکھئے تحقیقی مقالات ج ۱ ص ۲۳)

صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہے کہ ''خرج رسول اللّٰہ ﷺ من الدنیا'' رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ (ح ۵۴۱۴)

لیکن آلِ دیوبند کہتے ہیں کہ آپ کی زندگی برزخی نہیں بلکہ دنیاوی ہے۔ سبحان اللہ

یہاں بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ اشاعتی، مماتی اور پنج پیری دیوبندیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہوگئے ہیں اور آپ کی زندگی اب دنیاوی نہیں بلکہ برزخی ہے۔

اس کے بعد عقیدہ نمبر ۸ کا کوئی ذکر موجود نہیں، بلکہ عقیدہ نمبر ۹ لکھا ہوا ہے۔

عقیدہ نمبر ۹: ''ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ (اسی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام) اپنی قبروں

میں زندہ ہیں ۔نماز پڑھتے ہیں ۔حسن وعلم سے موصوف ہیں اور آپ پر امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور آپ کو صلوٰۃ وسلام پہنچائے جاتے ہیں۔"

تحقیق: قبروں میں زندہ ہونے سے اگر برزخی زندگی مراد ہے تو ہم بھی اسی کے قائل ہیں اور اگر دنیاوی زندگی مراد ہے تو اس کا کوئی ثبوت کسی دلیل سے نہیں ملا۔ اگر آلِ دیوبند کے پاس دنیاوی زندگی کے بارے میں کوئی جدید ثبوت آ گیا ہے تو پیش کریں۔

نماز پڑھتے ہیں، کے بارے میں دو روایتیں ہیں:

۱: معراج والی رات موسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

یہ حدیث صحیح ہے اور اس سے دنیاوی زندگی ثابت کرنے والوں کا استدلال غلط ہے۔

۲: مسند ابی یعلیٰ والی روایت ۔یہ روایت حجاج مجہول الحال کی وجہ سے ضعیف ہے اور اگر یہ حدیث صحیح بھی ہوتی تو دنیاوی زندگی والوں کا اس سے استدلال غلط ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ آلِ دیوبند کے نزدیک نمازی کو سلام نہیں کہنا چاہیے تو کیا ان کے نزدیک نماز پڑھنے والے انبیاء ورسل کو حالتِ نماز میں سلام کہنا جائز ہے؟!

یہ کہنا کہ اعمال پیش کیے جاتے ہیں، کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

اس کے بعد عقیدہ نمبر ۱۰ میں سے کچھ بھی درج نہیں کیا گیا۔

عقیدہ نمبر ۲۴: "مشائخ (اور بزرگوں) کی روحانیت سے استفادہ اور اُن کے سینوں اور قبروں سے باطنی فیوض کا پہنچنا سو بے شک صحیح ہے۔مگر اس طریقہ سے جو اس کے اہل اور خواص کو معلوم ہے۔ نہ اُس طرز سے جو عوام میں رائج ہے۔(المہند ص ۱۸)"

تحقیق: المہند نہ تو قرآن ہے اور نہ صحیح حدیث کی کوئی کتاب ہے، لہٰذا اس کتاب کو بطور دلیل ذکر کرنا غلط ہے۔

قبروں سے باطنی فیوض پہنچنے کا عقیدہ نہ تو قرآن سے ثابت ہے، نہ حدیث سے ثابت ہے، نہ اجماع سے ثابت ہے اور نہ آثار سلف صالحین سے ثابت ہے بلکہ امام ابوحنیفہ سے بھی ثابت نہیں۔اس عقیدے میں حیاتی آلِ دیوبند اور آلِ بریلی متفق ہیں اور غالباً انھی

جیسے عقائد مشترکہ کی وجہ سے محمد یوسف لدھیانوی دیوبندی نے لکھا ہے:

''میرے لئے دیوبندی بریلوی اختلاف کا لفظ ہی موجبِ حیرت ہے۔ آپ سن چکے ہیں کہ شیعہ سنی اختلاف تو صحابہ کرامؓ کو ماننے نہ ماننے کے مسئلہ پر پیدا ہوا، اور حنفی وہابی اختلاف ائمہ ہدیٰ کی پیروی کرنے نہ کرنے پر پیدا ہوا۔ لیکن دیوبندی بریلوی اختلاف کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے۔'' (اختلاف امت اور صراط مستقیم طبع قدیم ج ا ص ۲۵، طبع جدید ص ۲۸)

اہل حدیث کے نزدیک تمام صحابہ کرام، ثقہ وصدوق عند الجمہور صحیح العقیدہ تابعین، تبع تابعین اور اتباع تبع تابعین ائمہ ہدیٰ ہیں اور ہم ادلۂ شرعیہ کی پیروی انھی کے فہم کی روشنی میں کرتے ہیں۔ والحمد للہ

عرفان صاحب! آپ نے دیکھ لیا کہ آلِ دیوبند کے مذکورہ تمام عقائد بشمول ''قبروں سے باطنی فیوض کا پہنچنا'' نہ تو ادلۂ شرعیہ سے ثابت ہیں اور نہ خیر القرون کے ائمہ ہدیٰ سے ثابت ہیں، بلکہ ان بنیادی عقائد میں دیوبندیوں نے سمہودی، ملا علی قاری، ابن ہمام، طحطاوی اور ابن عابدین جیسے لوگوں کا دامن مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، جو کہ شر القرون کی پیداوار تھے اور ان میں سے کوئی ایک بھی ائمہ ہدیٰ کے پاؤں کی مٹی کے برابر بھی نہیں تھا۔

اصل بات یہ کہ آلِ دیوبند کو سلف صالحین پر اعتماد نہیں بلکہ خلف خالفین اور معتزلہ وجہمیہ پر اندھا دھند اعتماد ہے۔ وہ اپنے عقائد ومسائل ادلۂ شرعیہ سے نہیں لیتے بلکہ خیر القرون کے صدیوں بعد والے خلف خالفیں سے لیتے ہیں اور پروپیگنڈا یہ کرتے ہیں کہ اہل حدیث ائمہ ہدیٰ کو نہیں مانتے۔

میری طرف سے تمام آلِ دیوبند کو عموماً اور محمد تقی عثمانی ومحمد الیاس گھمن کو خصوصاً چیلنج ہے کہ وہ اپنے دو ورقی عقائد مذکورہ صراحت کے ساتھ درج ذیل علماء میں سے کسی ایک سے ثابت کر دیں:

ا: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

۲: تابعین عظام

۳: تبع تابعین

۴: اتباع تبع تابعین

خیر القرون کے سلف صالحین رحمہم اللہ

اگر ان سے ثابت نہ کرسکیں تو اپنے تسلیم کردہ درج ذیل علماء میں سے کسی ایک سے ثابت کردیں:

۱: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

۲: قاضی ابو یوسف

۳: ابن فرقد الشیبانی

۴: طحاوی

اور اگر نہ ثابت کرسکیں تو علانیہ توبہ کریں۔

آخر میں بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ آلِ دیوبند کا اپنے آپ کو اہلِ سنت قرار دینا، ان کا نرا دعویٰ ہے اور اس کے رد کے لئے دیکھئے میری کتاب: تحقیقی مقالات (ج ۴ ص ۴۲۶۔۴۳۸)

وما علینا إلا البلاغ

(۱۸/ رجب ۱۴۳۳ھ بمطابق ۹/ جون ۲۰۱۲ء)

رسول اللہ ﷺ اور بعض غیب کی اطلاع

سوال رسول اللہ ﷺ کو دی گئی غیبی خبریں اور علمِ غیب سے متعلق علمائے اہلِ سنت کا موقف کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے الغیب نہیں جانتا مگر اللہ جانتا ہے۔ (النمل: ۶۵)

اس آیتِ کریمہ کی تشریح میں امام ابن جریر الطبری رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے

نبی محمد ﷺ سے فرماتا ہے کہ اے محمد! (ﷺ) قیامت کے بارے میں پوچھنے والے مشرکین سے جو کہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ کہہ دو! اللہ نے جو علم اپنے پاس رکھا ہے اور مخلوق سے اُسے چھپا دیا ہے اُس الغیب کو آسمانوں اور زمین میں کوئی نہیں جانتا اور قیامت بھی اسی (الغیب) میں سے ہے۔ (تفسیر طبری ج ۲۰ ص ۵)

اس آیتِ کریمہ سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے استدلال کر کے فرمایا: ''و من زعم أن محمدًا ﷺ يعلم ما في غد فقد أعظم على الله الفرية .'' اور جس نے دعویٰ کیا کہ محمد ﷺ جانتے تھے جو کل ہوگا تو اس نے اللہ پر بڑا افتراء باندھا، یعنی بہت بڑا جھوٹ بولا۔ (کتاب التوحید لابن خزیمہ ص ۲۲۳ ح ۳۲۴ وسندہ صحیح، المستخرج لابی نعیم الاصبہانی ۱/۲۴۲ ح ۴۴۲ وسندہ صحیح، صحیح ابی عوانہ ج ۱ ص ۱۵۴ ح ۳۰۴)

معلوم ہوا کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے، نیز اُس کا علم ہر وقت ہر چیز کو محیط ہے، وہ ''جميع ما كان و جميع ما يكون'' کا علم جانتا ہے اور کوئی چیز بھی اُس کے علم سے باہر نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((مفاتيح الغيب خمس لا يعلمها إلا الله: لا يعلم ما في غد إلا الله و لا يعلم ما تغيض الأرحام إلا الله و لا يعلم متى يأتي المطر أحد إلا الله و لا تدري نفس بأي أرض تموت و لا يعلم متى تقوم الساعة إلا الله)) ''غیب کی پانچ چابیاں ہیں جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا: کل کیا ہوگا؟ اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ارحام میں کیا پوشیدہ ہے؟ اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی، کسی جاندار کو یہ معلوم نہیں کہ زمین کے کس (حصے پر) اُس کی موت آئے گی اور اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی۔'' (صحیح بخاری: ۷۳۷۹)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((أوتيتُ مفاتيح كل شيٍ إلا الخمس)) ''مجھے ہر چیز کی چابیاں دی گئی ہیں سوائے پانچ کے۔''

پھر آپ نے سورۂ لقمان (آیت: ۳۴) کی تلاوت فرمائی۔

(مسند احمد ۲/۸۵۔۸۶ ح ۵۵۷۹ وسندہ صحیح، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۲/۳۶۰۔۳۶۱ ح ۱۳۳۴۴)

تنبیہ: شیخ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کو بڑی غلطی لگی ہے کہ انھوں نے ذکر اور عدمِ ذکر والے فلسفے کی رو سے اس حدیث کو ''شاذ أوله'' قرار دے کر اپنے سلسلہ ضعیفہ (۷/۳۴۸ ح ۳۳۳۵) میں نقل کر دیا۔

جبکہ اُن کے برعکس شیخ احمد محمد شاکر المصری رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا: ''إسناده صحیح'' اس کی سند صحیح ہے۔ (المسند تحقیق احمد شاکر ۷/۲۷۶)

اس حدیث سے دو باتیں صاف ثابت ہیں:

۱: نبی ﷺ کو پانچ چیزوں کی چابیاں نہیں دی گئیں۔

۲: ان پانچ چیزوں کے علاوہ ہر چیز کی چابیاں آپ ﷺ کو دے دی گئیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أوتي نبیکم ﷺ مفاتیح کل شيءٍ غیر خمس'' آپ کے نبی ﷺ کو پانچ کے علاوہ سب چابیاں عطا کی گئیں۔

پھر انھوں نے سورۂ لقمان (آیت: ۳۴) کی تلاوت فرمائی۔

(مسند احمد ۱/۳۸۶ ح ۳۶۵۹ وسندہ حسن، مسند الحمیدی بتحقیقی: ۱۲۵، وقال ابن کثیر: '' وهذا إسناد حسن '' إلخ)

اس حدیث کے راوی عبداللہ بن سلمہ جمہور محدثین کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے صدوق حسن الحدیث ہیں۔ (دیکھئے مسند الحمیدی بتحقیقی کا حاشیہ ح ۵۷)

عمرو بن مرہ کی روایت کی وجہ سے یہ حدیث عبداللہ بن سلمہ کے اختلاط سے پہلے کی ہے۔ اس سلسلے میں مفصل دلائل کے لئے کتبِ حدیث کی طرف رجوع فرمائیں۔

ایک آیت کریمہ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''إنّ اللّٰه یعلم الغیب جمیعه...'' بے شک اللہ سارا (کُل کا کُل) غیب جانتا ہے...

(تفسیر ابن کثیر ۳/۲۰۳، الانبیاء: ۱۱۰)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا

مَسَّنِیَ السُّوٓءُ ﴾ ''کہہ دیجئے: میں اپنی جان کے لئے نفع اور نقصان کا مالک نہیں مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے اور اگر میں الغیب جانتا تو بہت سی خیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔''

(الاعراف: ۱۸۸)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: اگر میں وہ جانتا جو ہونے والا ہے اور ابھی تک نہیں ہوا تو خیر کثیر اکٹھی کر لیتا۔ (تفسیر طبری ۵/۵۹۰، طبع دارالحدیث القاہرہ)

اب سوال یہ ہے کہ کیا انبیاء اور رسول بھی اللہ تعالیٰ کی اطلاع اور وحی سے بعض غیب جانتے تھے؟ تو اس کے جواب سے پہلے جلیل القدر مفسرین کرام اور علمائے عظام کے دس (۱۰) حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱: اہلِ سنت کے مشہور ثقہ امام ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۰ھ) نے سورۃ الجن (آیت: ۲۶۔۲۷) کی تفسیر میں فرمایا:

''فلا یظھر علٰی غیبه أحدًا فیعلمه أو یریه إیاه إلا من ارتضی من رسول فإنه یظھره علٰی ما شاء من ذلك ''پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، تاکہ وہ اسے جان لے یا دیکھ لے، سوائے رسول کے جس پر وہ راضی ہے تو اُسے اس میں سے جو چاہے اطلاع دے دیتا ہے۔ (تفسیر طبری ج۲۹ ص۷۶)

۲: امام ابن جریر سے تقریباً دو صدیاں پہلے مفسر قرآن امام قتادہ بن دعامہ البصری رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۷ھ) نے فرمایا:'' إلا من ارتضی من رسول فإنه یظھره من الغیب علٰی ماشاء إذا ارتضاه ''سوائے جس رسول پر وہ راضی ہو، تو اسے غیب میں سے جو چاہتا ہے بتا دیتا ہے۔ اگر اُس (یعنی اللہ تعالیٰ) کی رضا مندی ہو۔ (تفسیر ابن جریر الطبری ۲۹/۷۷ وسندہ صحیح)

۳: امام ابو محمد حسین بن مسعود البغوی الفراء رحمہ اللہ (متوفی ۵۱۶ھ) نے سورۂ آل عمران (آیت: ۱۷۹) کی تفسیر میں فرمایا:'' فیطلعه علٰی بعض علم الغیب ''پس وہ (اللہ) اسے (اپنے رسول کو) بعض علم غیب پر مطلع فرماتا ہے۔ (تفسیر بغوی ج۱ ص۳۷۶)

امام بغوی کی اس تفسیر سے صاف ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو غیب (کی خبروں) میں سے بعض کا علم عطا فرمایا تھا۔

۴: امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۸ھ) نے فرمایا:

''و المعنی أن من ارتضاہ [للرسالۃ و النبوۃ] فإنہ یطلعہ علی ما شاء من غیبہ'' اور معنی یہ ہے کہ جسے وہ رسالت اور نبوت کے لیے چن لے تو اُسے اپنے غیب میں سے جس پر چاہے اطلاع دے دیتا ہے۔ (الوسیط فی تفسیر القرآن المجید ۴/ ۳۶۹، الجن: ۲۶۔ ۲۷)

۵: حافظ ابن الجوزی (متوفی ۵۹۷ھ) نے فرمایا: ''و المعنی: أن من ارتضاہ للرسالۃ أطلعہ علی ماشاء من غیبہ'' اور معنی یہ ہے: جسے وہ رسالت کے لئے چن لے تو اپنے غیب میں سے جس پر چاہے اُسے اطلاع دے دیتا ہے۔

(زاد المسیر ۸/ ۳۸۵، الجن: ۲۶۔ ۲۷)

۶: قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ عرف ابن العربی المالکی (متوفی ۵۴۳ھ) نے منافقین کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ''و أنّ اللّٰہ یطلعہ علی ماشاء من غیبہ'' اور بے شک اللہ اسے (سیدنا محمد ﷺ کو) اپنے غیب میں سے جو چاہے اطلاع دے دیتا ہے۔

(احکام القرآن ۲/ ۱۰۳۳، التوبہ: ۱۲۷)

۷: ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی الانصاری (متوفی ۶۷۱ھ) نے فرمایا:

''فإنہ یظہرہ علی مایشاء من غیبہ لأنّ الرسل مؤیدون بالمعجزات و منہا الإخبار عن بعض الغائبات'' پس وہ انھیں اپنے غیب میں سے جو چاہے اطلاع دیتا ہے، کیونکہ رسولوں کی معجزات کے ساتھ تائید کی گئی اور ان (معجزات) میں سے بعض غیبوں کی خبر دینا (بھی) ہے۔ (تفسیر قرطبی ۱۹/ ۲۷۔ ۲۸، الجن: ۲۶۔ ۲۷)

نیز دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۸ ص ۲۹۹، التوبہ: ۱۲۷)

۸: امام ابوحیان محمد بن یوسف الاندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) نے فرمایا:

''فإنہ یظہرہ علی ماشاء من ذلک'' پس وہ اس (غیب) میں سے جو چاہے، آپ

(ﷺ) کو اطلاع دے دیتا ہے۔ (البحر المحیط ج ۸ ص ۳۴۸، الجن: ۲۶۔ ۲۷)

۹: حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (متوفی ۷۲۸ھ) نے بعض انبیاء کے بارے میں فرمایا:

"و منهم من أطلعه على ماشاء من غيبه" اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جنھیں اُس (اللہ) نے اپنے غیب میں سے بعض پر اطلاع فرمائی۔ (مجموع فتاوی ۲۸/۶۰۵)

۱۰: حافظ ابن القیم رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۱ھ) نے فرمایا:

"﴿ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء﴾ استدراك لما نفاه من اطلاع خلقه على الغيب سوى الرسل فإنه يطلعهم على ما يشاء من غيبه ..."

"اور لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے" نفی پر استدراک ہے کہ اللہ اپنی مخلوقات میں سے رسولوں کے سوا کسی کو غیب پر اطلاع نہیں دیتا، پس وہ جو چاہتا ہے اپنے غیب میں سے انھیں اطلاع دے دیتا ہے...

(زاد المعاد ج ۳ ص ۲۲۰ فصل فی ذکر بعض الحکم والغایات المحمودۃ....)

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر بیضاوی (۱/۱۹۵) تفسیر ثعلبی (۳/۲۱۹) ارشاد القاری للقسطلانی (۷/۱۸۶) الدر المصون فی علوم الکتاب المکنون (۲/۳۹۹) جلالین (ص ۹۲) اضواء البیان (۲/۱۹۶) اور التفسیر الصحیح لحکمت بشیر (۴/۵۴۸) وغیرہ.

حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے ایک آیت کی تفسیر میں فرمایا:

"فإنه يقتضي اطلاع الرسول على بعض الغيب" پس اس کا یہ تقاضا ہے کہ رسول کو بعض غیب پر اطلاع دی جائے۔ (فتح الباری ۸/۵۱۴ تحت ح ۴۷۷۸)

آثار سلف صالحین، آیاتِ کریمہ اور احادیثِ صحیحہ کا اس مسئلے میں خلاصہ درج ذیل ہے:

۱: صرف اللہ ہی عالم الغیب ہے اور یہ اس کی صفتِ خاصہ ہے جس میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔

۲: جمیع ما کان وما یکون یعنی سارا اور کلی علمِ غیب صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

۳: پانچ چیزوں (مثلاً قیامت وغیرہ) کا علم صرف اللہ کے پاس ہے اور مخلوق میں سے

کوئی بھی ان پانچ چیزوں کا علم نہیں جانتا۔

۴: رسولوں اور انبیاء کو بعض علم غیب کی اطلاع دی گئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کے بارے میں دو فرقوں کے متضاد نظریات درج ذیل ہیں:

۱: رسول اللہ ﷺ تکمیلِ قرآن کے بعد جمیع ما کان وجمیع ما یکون کا علم باذن اللہ جانتے ہیں۔ یہ بریلویہ رضا خانیہ کا عقیدہ ہے۔

اس نظریے کی کوئی صریح دلیل قرآن، حدیث، اجماع اور آثارِ سلف صالحین سے ثابت نہیں اور نہ تکمیلِ قرآن کی متعین تاریخ کا علم کسی حدیث یا خبر میں موجود ہے۔

اس جواب کے شروع میں گزر چکا ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا:

اور جس (شخص) نے دعویٰ کیا کہ (سیدنا) محمد ﷺ جانتے تھے جو کل ہوگا، تو اس نے اللہ پر بڑا افتراء باندھا یعنی بہت بڑا جھوٹ بولا۔ (صحیح ابی عوانہ ۱:۳۰۴)

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے یہ بات مسروق تابعی کے سامنے فرمائی تھی، جس سے ثابت ہوا کہ اُن کا یہ قول رسول اللہ ﷺ کی وفات اور تکمیلِ قرآن کے بعد کا ہے۔

۲: بعض لوگ ایک فلسفہ گھڑتے ہیں کہ جو غیب وحی یا اللہ کی طرف سے اطلاع و اخبار کے ذریعے سے معلوم ہو، اسے غیب نہیں کہتے، لہٰذا نبی ﷺ کسی قسم کا غیب نہیں جانتے تھے بلکہ ایک شخص نے میرے سامنے کہا: رسول اللہ ﷺ ایک ذرا برابر غیب بھی نہیں جانتے تھے۔ (أستغفر اللّٰہ ، معاذ اللّٰہ)

یہ بعض مبتدعہ اور جدید متکلمین کا عقیدہ ہے جس کی کوئی دلیل قرآن، حدیث، اجماع اور آثارِ سلف صالحین میں موجود نہیں، بلکہ یہ عقیدہ سراسر باطل اور صریح گمراہی ہے۔

بعض آلِ دیوبند نے نبی ﷺ کے علم کی وسعت کا انکار کیا اور دوسری طرف کہا:

''شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی، فخر عالم کی وسعت علم کی کونسی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے...''

(دیکھئے براہین قاطعہ بجواب انوار ساطعہ ص ۵۵)

عرض ہے کہ شیطان اور ملک الموت کی وسعتِ علم کے بارے میں نہ کوئی نص قطعی ہے، نہ خبر واحد صحیح اور نہ آثار میں سے کوئی صحیح اثر، لہٰذا مذکورہ عبارت باطل ہے اور نبی ﷺ کے علم کا شیطان کے باطل علم سے مقارنہ کرنا آپ ﷺ کی بہت بڑی توہین ہے۔

بعض آلِ دیوبند نے جمیع حیوانات وبہائم اور ہر صبی ومجنون کے ساتھ بعض علومِ غیبیہ کا انتساب کیا اور نبی ﷺ کے علم سے تشبیہانہ مقابلہ کیا۔

دیکھئے اشرفعلی تھانوی کی حفظ الایمان (مع التحریفات ص ۱۱۶، طبع انجمن ارشاد المسلمین لاہور)

یہ سارا بیان باطل اور صریح گستاخی ہے۔ ان اہلِ بدعت کے مقابلے میں اہلِ سنت والجماعۃ (اہلِ حدیث) کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو بعض غیب اللہ تعالیٰ نے بتایا، وہ آپ جانتے تھے اور جو نہیں بتایا وہ نہیں جانتے تھے۔

حافظ ابن عبدالبر الاندلسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۳ھ) نے ایک حدیث کی تشریح میں لکھا:

"و فیه أنه کان ﷺ لا یعلم الغیب و إنما کان یعلم منه ما یظهره الله علیه" اور اس حدیث میں یہ (فقہ) ہے کہ بے شک آپ ﷺ غیب نہیں جانتے تھے اور آپ صرف وہ جانتے تھے جو اللہ آپ پر ظاہر فرماتا تھا۔

(التمهید لما فی الموطأ من المعانی والاسانید ج ۶ ص ۲۵۱)

ابوالولید الباجی (متوفی ۴۹۴ھ) نے ایک حدیث کی تشریح میں فرمایا:

"لأنه لا یعلم من الغیب إلا ما اطلع علیه بالوحي"

کیونکہ بے شک آپ غیب میں سے نہیں جانتے تھے سوائے اُس کے جس کی آپ کو وحی کے ذریعے سے اطلاع دی گئی تھی۔ (المنتقی شرح الموطأ ج ۷ ص ۱۲۹، کتاب الاقضیہ باب ۱)

آخر میں بطورِ فائدہ اور بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ مخلوق میں سے نبی کریم ﷺ کا علم سب سے زیادہ ہے۔

صحابۂ کرام کا یہ تکیۂ کلام تھا اور وہ کثرت سے فرمایا کرتے تھے کہ "اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَم" یعنی اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

دیکھئے صحیح بخاری (۵۳، ۸۷، ۴۲۵ ... ۷۴۴۷) صحیح مسلم (۸|۹۳| ۱۷|۱۱۲|۳۰|۱۴۳|...۲۹۶۹|۲۹۳۹|۷۴۳۹) اور موطأ امام مالک (۱۹۲/۱ ح ۴۵۲...)

عبید بن عمیر بن قتادہ اللیثی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک دن (سیدنا) عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے کہا: یہ آیت: ﴿ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ ﴾ تمھارے خیال میں کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ تو انھوں نے کہا: ''اللّٰه أعلم'' اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ تو عمر (رضی اللہ عنہ) غصے ہوئے اور فرمایا: کہو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے... الخ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۱ ح ۴۵۳۸، فتح الباری ج ۸ ص ۲۰۲)

یعنی صاف صاف جواب دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ''اللّٰه و رسوله أعلم'' نہیں کہنا چاہیے بلکہ صرف اللّٰه أعلم کہنا چاہیے۔

مستدرک الحاکم (ج ۳ ص ۵۴۳ ح ۶۳۰۷، مخطوط مصور ج ۳ ص ۲۹۱) کی ایک روایت میں ''اللّٰه و رسوله أعلم'' کے الفاظ آئے ہیں اور حاکم نے اسے ''صحیح علی شرط الشیخین'' قرار دیا، لیکن اس کی سند منقطع ہونے کی وجہ ضعیف ہے۔ اس کے راوی عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکہ رحمہ اللہ کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں اور نہ روایت میں یہ صراحت ہے کہ انھوں نے اسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے سنا تھا۔ واللہ اعلم

مشہور اہل حدیث عالم حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے لکھا ہے:

''ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے غیب کی باتوں پر مطلع فرماتا ہے جس سے بعض دفعہ ان پر منافقین کا اور ان کے حالات اور ان کی سازشوں کا راز فاش ہو جاتا ہے۔'' (احسن البیان ص ۱۶۳، حاشیہ ۳، آل عمران: ۱۷۹)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ اللہ ہی عالم الغیب ہے اور وہی الغیب جانتا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بعض غیب کی اطلاع فرمائی تھی۔ (۱/ مئی ۲۰۱۰ء)

کیا (لوگوں کے) اعمال اقرباء و رشتہ داروں پر پیش ہوتے ہیں؟

سوال ایک روایت کی تحقیق مطلوب ہے:

مولانا عبدالمنان راسخ حفظہ اللہ کی ایک کتاب منہاج الخطیب میں ایک روایت لکھی ہوئی ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جب کوئی مومن فوت ہوتا ہے تو عالم برزخ میں اسکی نیک لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے اور عالم برزخ میں نیک لوگ فوت ہو کر آنے والے مومن سے طرح طرح کے اہم سوال کرتے ہیں اگرچہ اس کی کیفیت صرف اللہ ہی جانتے ہیں لیکن ہمارا قرآن و حدیث پر مکمل ایمان ہے اور اسی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

"اِنَّ اَعۡمَالَکُمۡ تَرِدُ عَلٰی اَقَارِبِکُمۡ وَ عَشَائِرِکُمۡ...."

بلاشبہ تمہارے اعمال تمہارے قریبی اور خاندان والوں پر پیش کیے جاتے ہیں اگر اعمال اچھے ہوں تو وہ راضی اور خوش ہوتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں: اے اللہ! یہ تیرا فضل اور تیری رحمت ہے۔ ہمارے اس نیکی کرنے والے پیارے پر اپنی نعمت کو مکمل فرما اور اسی پر اس کو موت دے اور اسی طرح آخرت والوں پر برائی کرنے والے کا عمل بھی پیش کیا جاتا ہے۔ وہ دعا کرتے ہیں: اے اللہ! اس کو ایسے نیک عمل کی توفیق عطا فرما جو تیری خوشنودی اور قرب کا باعث ہو۔ (منہاج الخطیب ص ۴۳۴۔۴۳۵، دارالقدس خطبہ نمبر ۱۹ موضوع: فوت شدہ پیاروں کے حقوق، کتاب الزہد امام عبداللہ بن مبارک ۱۴۹ ح ۴۴۳، المعجم الکبیر امام طبرانی ۴/۱۵۴ ح ۳۸۸۹، شرح الصدور امام سیوطی، سلسلہ احادیث صحیحہ: ۲۷۵۸، امام البانی)

اس روایت کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ یہ روایت سنداً کیسی ہے؟ جزاکم اللہ خیرا

اس روایت کی تحقیق کو ماہنامہ الحدیث میں شائع کیا جائے۔ والسلام

(ابوابراہیم خرم ارشاد محمدی۔ دولت نگر، گجرات)

الجواب آپ نے جس روایت کے الفاظ لکھے ہیں، اسے طبرانی (المعجم الکبیر

۴/۱۲۹ ح ۳۸۸۷، المعجم الاوسط ۱/۱۳۰۔۱۳۱ ح ۱۴۸، مسند الشامیین ۲/۳۸۳ ح ۱۵۴۴،
۴/۳۷۱ ح ۳۵۸۴) اور عبدالغنی المقدسی (السنن ۱/۱۹۸، من طریق الطبرانی، قالہ الالبانی
فی الضعیفہ ۲/۲۵۴ ح ۸۶۴) نے مسلمہ بن علی کی سند سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

حافظ ہیثمی نے فرمایا: اس میں مسلمہ بن علی ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ۲/۳۲۷)

شیخ البانی نے فرمایا: اور وہ (مسلمہ بن علی) متہم ہے۔ الخ (الضعیفہ ۲/۲۵۵)

اس سند کے دوسرے راوی عبدالرحمٰن بن سلامہ کے بارے میں البانی صاحب نے فرمایا: مجھے اس کے حالات نہیں ملے۔ (الصحیحہ ۶/۱۰۵ ح ۲۷۵۸)

اس روایت کے بارے میں شیخ البانی کا درج ذیل فیصلہ ہے:

"ضعیف جدًا" سخت ضعیف ہے۔ (الضعیفہ ۲/۲۵۴ ح ۸۶۴)

امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کی کتاب الزہد (ح ۴۴۳) وغیرہ میں اس مفہوم کی ایک موقوف روایت سیدنا ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ سے درج ذیل سند کے ساتھ مروی ہے:

"ثور بن يزيد عن أبي رهم السمعي عن أبي أيوب"

اس موقوف (یعنی غیر مرفوع) روایت کے بارے میں البانی صاحب نے لکھا ہے:

"قلت :إسناد الموقوف صحيح." میں نے کہا: موقوف کی سند صحیح ہے۔

(سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ۶/۱۰۴ ح ۲۷۵۸)

حالانکہ اسی سند کے بارے میں اسی کتاب کی اسی جلد میں البانی صاحب نے خود لکھا ہے: "قلت :ورجاله ثقات لكنه منقطع بين ثور بن يزيد وأبي رهم ..."
میں نے کہا: اور اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن یہ ثور بن یزید اور ابو رہم کے درمیان منقطع ہے۔

(الصحیحہ ۶/۲۶۴ ح ۲۶۲۸)

یعنی ثور بن یزید کی ابو رہم رحمہ اللہ سے ملاقات نہیں، لہٰذا عرض ہے کہ منقطع سند کو کس طرح سند صحیح کہا جا سکتا ہے؟!

موقوف سند تو خود شیخ البانی رحمہ اللہ کے اپنے قلم سے منقطع، یعنی ضعیف ثابت ہوئی

اور اس کے تمام شواہد بھی ضعیف ہیں۔ مثلاً:

۱: سلام الطویل متروک کی روایت۔

۲: معاویہ بن یحییٰ ضعیف کی روایت۔

۳: حسن بصری کی طرف منسوب مرسل روایت۔ وغیر ذلک

خلاصۃ التحقیق یہ ہے کہ آپ کی مسئولہ روایت ضعیف و مردود ہے اور عین ممکن ہے کہ محترم عبدالمنان راسخ حفظہ اللہ کو اس کی تحقیق کا موقع نہ مل سکا ہو، لہٰذا انھوں نے شیخ البانی رحمہ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی کتاب: منہاج الخطیب میں درج فرمادیا۔ واللہ اعلم

تنبیہ: اس باب میں مسند البزار (البحر الزخار ۱۷/۱۵۴۔۱۵۵ ح ۹۷۶۰، کشف الاستار ۱/۴۱۳۔۴۱۴ ح ۸۷۴) والی روایت حسن لذاتہ ہے اور شیخ البانی (۶/۲۶۲۔۲۶۳ ح ۲۶۲۸) نے بھی اسے صحیحہ میں ذکر کیا ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ ابو میمون محمد محفوظ اعوان صاحب کے قلم سے پیش خدمت ہے:

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مؤمن پر عالم نزع طاری ہوتا ہے تو وہ مختلف حقائق کا مشاہدہ کر کے یہ پسند کرتا ہے کہ اب اس کی روح نکل جائے (تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کر سکے) اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں۔ مؤمن کی روح آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے اور (فوت شدگان) مؤمنوں کی ارواح کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ وہ اس سے اپنے جاننے پہچاننے والوں کے بارے میں دریافت کرتی ہیں۔ جب وہ روح جواب دیتی ہے کہ فلاں تو ابھی تک دنیا میں ہی تھا (یعنی ابھی تک فوت نہیں ہوا تھا) تو وہ خوش ہوتی ہے اور جب وہ جواب دیتی ہے کہ (جس آدمی کے بارے میں تم پوچھ رہی ہو) وہ تو مر چکا ہے، تو وہ کہتی ہیں:
اسے ہمارے پاس نہیں لایا گیا (اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے جہنم میں لے جایا گیا ہے)۔
مؤمن کو قبر میں بٹھا دیا جاتا ہے اور اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ تیرا نبی کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرے نبی

محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔

(ان سوالات و جوابات کے بعد) اس کی قبر میں ایک دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف دیکھو۔ وہ اپنی قبر کی طرف دیکھتا ہے، پھر گویا کہ نیند طاری ہو جاتی ہے۔

جب اللہ کے دشمن پر عالم نزع طاری ہوتا ہے اور مختلف حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ نہیں چاہتا کہ اس کی روح نکلے (تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے بچ جائے) اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ جب اسے قبر میں بٹھا دیا جاتا ہے تو پوچھا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میں نہیں جانتا۔ اسے کہا جاتا ہے: تو نے جانا ہی نہیں۔ پھر (اس کی قبر میں) جہنم سے دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے ایسی ضرب لگائی جاتی ہے کہ جن وانس کے علاوہ ہر چوپایہ اس کو سنتا ہے، پھر اسے کہا جاتا ہے کہ ''منہوش'' کی نیند سو جا۔ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: منہوش سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا: منہوش سے مراد وہ آدمی ہے جسے کیڑے مکوڑے اور سانپ ڈستے اور نوچتے رہتے ہیں۔ پھر اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے۔'' (اردو سلسلہ احادیث صحیحہ ۳/ ۲۱۶۔۲۱۷ ح ۱۲۱۳)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے کے بعد (رشتہ دار یا قریبی) روحوں کی تازہ مرنے والے کی روح سے ملاقات ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے حالات معلوم کیے جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَلْأَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ))

''روحیں لشکروں اور گروہوں کی حالت میں (اکٹھی) رہتی ہیں یا رہتی تھیں، پس جس کا ایک دوسرے سے تعارف تھا تو اُن کی آپس میں محبت ہوتی ہے اور جو ایک دوسرے سے اجنبی تھیں تو وہ ایک دوسرے کے خلاف ہوتی ہیں۔'' (صحیح بخاری ۳۳۳۶، صحیح مسلم: ۲۶۳۸)

امام محمد بن المنکدر رحمہ اللہ (ثقہ تابعی) سے روایت ہے کہ میں جابر بن عبد اللہ

(الانصاری رضی اللہ عنہ) کے پاس گیا اور وہ وفات کے قریب تھے تو میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میری طرف سے سلام کہہ دیجئے گا۔ (سنن ابن ماجہ: ۱۴۵۰، مسند احمد ۴/ ۳۹۱ ح ۱۹۴۸۲، موسوعہ حدیثیہ ۳۲/ ۲۲۸ وسندہ صحیح)

سیدنا خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر سجدہ کر رہے ہیں، پھر (انھوں نے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا، آپ نے فرمایا: ((إن الروح لیلقی الروح.)) ''روح کی روح سے ملاقات ہوتی ہے۔''

(السنن الکبریٰ للنسائی ۴/ ۳۸۴ ح ۷۶۳۱، مسند احمد موسوعہ حدیثیہ ۳۶/ ۱۸۸، ۲۰۱)

مسند احمد (۵/ ۲۱۴، ۲۱۵) کی مشہور روایت اور طبقات ابن سعد (۴/ ۳۸۱) میں یہی روایت ''لا تلقی الروح'' یعنی روح کی روح سے ملاقات نہیں ہوتی، کے الفاظ سے ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ (۱۱/ ۷۸ ح ۳۰۵۰۶) میں ''إن الروح لا یلقی الروح'' یا ''الروح یلقی الروح'' کے الفاظ سے لکھی ہوئی ہے، لیکن مسند ابن ابی شیبہ (۱/ ۳۷ ح ۱۸) میں ''لتلقی الروح'' یا ''تلقی الروح'' یعنی اثبات کے ساتھ ہے اور عبد بن حمید نے اسی روایت کو ابن ابی شیبہ سے ''لتلقی الروح'' یعنی اثبات کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(دیکھئے المنتخب ۱/ ۲۱۹ ح ۲۱۶)

نفی اور اثبات کے اس ٹکراؤ کی وجہ سے یہ روایت مضطرب یعنی ضعیف ہے۔ احادیث صحیحہ اور غیر مضطربہ کی رُو سے یہی ثابت ہے کہ مرنے کے بعد روحوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی ہے، لیکن یہ الفاظ: ''إِنَّ أَعْمَالَكُمْ تَرِدُ عَلٰى أَقَارِبِكُمْ وَعَشَائِرِكُمْ....'' یعنی بلاشبہ تمھارے اعمال تمھارے قریبی اور خاندان والوں پر پیش کئے جاتے ہیں... الخ ثابت نہیں بلکہ ضعیف و مردود ہیں۔

(۱۸/ شوال ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۶/ ستمبر ۲۰۱۲ء)

خواب اور بیداری میں دیدارِ مصطفیٰ ﷺ

سوال خواب اور بیداری کی حالت میں دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب خواب میں رسول اللہ ﷺ کا دیدار ممکن ہے۔

دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۴۰ ص ۱۲۔۱۳، عدد ۶۶ ص ۴

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کا جو دیدار کیا تھا وہ حدیث کے حکم میں ہے اور حجت ہے۔

صحابۂ کرام کے بعد قیامت تک ہر شخص کا یہ دعویٰ کہ میں نے خواب میں نبی ﷺ کو دیکھا ہے، شرعی حجت نہیں بلکہ اگر اس میں قرآن، حدیث، اجماع اور آثارِ سلف صالحین کے خلاف کوئی بات ہو تو یہ دعویٰ مردود اور باطل ہے۔

بیداری میں رسول اللہ ﷺ کا دنیا میں دیدار قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت نہیں، دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۵۲۱۴) لہٰذا بیداری والے دیدار کا دعویٰ غلط اور باطل ہے۔

(۱۰/ اپریل ۲۰۱۰ء)

کیا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے خواب میں اللہ کو دیکھا تھا؟

سوال امام احمد (بن حنبل) رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میں نے خواب میں رب العالمین کو دیکھا تو پوچھا: کون سی عبادت سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ اللہ نے مجھے فرمایا: تلاوتِ قرآن۔ (دیکھئے امین الفتاویٰ بزبان پشتو ا/ ۹ بحوالہ حاشیہ شرح العقائد ص ۶۰)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (ایک سائل)

الجواب یہ جھوٹی روایت ہے۔ (دیکھئے میری کتاب: آلِ دیوبند کے تین سو جھوٹ ص ۱۵۸)

شرح عقائد نسفیہ اور حاشیہ شرح عقائد دونوں بے سند اور بے کار کتابیں ہیں، لہذا ایسی بے سند اور بے کار کتابوں کا حوالہ فضول ہوتا ہے۔

شرح عقائد نسفیہ (جس نے صحیح عقائد کو ہوا میں اُڑانے کی کوشش کی) پر رد کے لئے شیخ شمس الدین افغانی رحمہ اللہ کی بہترین کتاب: الماتریدیہ کا مطالعہ بیحد مفید ہے۔

ابوالحسن احمد بن محمد (بن الحسن بن یعقوب) بن مقسم (المقریٔ العطار) سے روایت ہے کہ

"سمعت عبد العزيز بن أحمد النهاوندي قال: سمعت عبد الله بن أحمد بن حنبل قال: سمعت أبي يقول: رأيت رب العزة عز وجل في المنام فقلت: يا رب! ما أفضل ما تقرب به المتقربون إليك فقال: كلامي يا أحمد. قال قلت: يا رب بفهم أو بغير فهم؟ قال: بفهم و بغير فهم."

(مناقب الامام احمد لابن الجوزی ص ۴۳۴ باب ۹۱)

اسے بعض اختلاف کے ساتھ حافظ ذہبی نے بھی مسنداً روایت کیا ہے۔

(سیر اعلام النبلاء ۱۱/ ۳۴۷)

اس سند کا بنیادی راوی احمد بن محمد بن مقسم سخت مجروح ہے۔

خطیب بغدادی نے فرمایا: " وكان يظهر النسك والصلاح ولم يكن في الحديث ثقة " وہ زہد اور پرہیز گاری ظاہر کرتا تھا، اور وہ حدیث میں ثقہ نہیں تھا۔

حمزہ بن یوسف السہمی اور دارقطنی وغیرہما نے اس پر جرح کی ہے۔ ابونعیم الاصبہانی نے اسے "لين الحديث" کہا اور امام ابوالقاسم الازہری نے فرمایا: " كان كذاباً"

(تاریخ بغداد ۴/ ۴۲۹ ت ۲۳۲۸)

ابن مقسم کے استاد عبدالعزیز النہاوندی کی توثیق نہیں ملی۔

حافظ ابن الجزری کی روایت میں ابن مقسم اور عبدالعزیز بن محمد (!) النہاوندی کے درمیان ابوبکر الرازی (؟) کا واسطہ موجود ہے۔ (دیکھئے النشر فی القراءات العشر ۱/ ۴)

اور یہ الرازی بھی مجہول ہے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا روایت موضوع ہے۔

تنبیہ: رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو خواب میں دیکھا۔

(دیکھئے سنن الترمذی: ۳۲۳۵ وقال: "ھذا حدیث حسن صحیح" وقال البخاری: "ھذا حدیث صحیح" مسند احمد ۵/ ۲۴۳)

یہ حدیث حسن ہے۔ (اضواء المصابیح: ۷۲۵)

رقبہ بن مصقلہ رحمہ اللہ (ثقہ تبع تابعی) نے فرمایا:

"رأيت رب العزة في المنام فقال: و عزتي لأكرمن من مثوى سليمان التيمي" میں نے خواب میں رب تعالیٰ کو دیکھا تو رب نے فرمایا: اور مجھے اپنی عزت کی قسم! میں سلیمان التیمی کو بہترین ٹھکانا عطا کروں گا۔ (کتاب الثقات لابن حبان ۴/ ۳۰۱ وسندہ صحیح)

نبی ﷺ کے بعد، اُمتیوں کے ایسے تمام خواب ظنی ہوتے ہیں، جن سے حجت قائم نہیں ہو سکتی لیکن بطورِ مبشرات حق کی تائید میں سلف صالحین کے خواب پیش ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کی سند صحیح یا حسن لذاتہ ہو۔ واللہ اعلم

کیا خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والا جنت میں داخل ہوگا؟

سوال سنن الدارمی (۲/ ۵۱) میں ایک روایت ہے کہ محمد بن سیرین (رحمہ اللہ) نے فرمایا: "من رأى ربه في المنام دخل الجنة" جس نے اپنے رب کو خواب میں دیکھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (دیکھئے امین الفتاوی بزبان پشتو ج ۱ص ۹)

کیا یہ روایت صحیح سند سے ثابت ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اس روایت کی سند درج ذیل ہے:

"أخبرنا نعيم بن حماد عن عبد بن عبد الرحمٰن عن قطبة عن يوسف عن ابن سيرين" (سنن الدارمی: ۲۱۵۶ دوسرا نسخہ: ۲۱۹۶)

اس کا راوی یوسف بن میمون سخت ضعیف و مجروح ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: "منكر الحديث جداً" (کتاب الضعفاء بتحقیقی: ۴۲۰)

ابوحاتم الرازی نے فرمایا: " لیس بالقوي، منکر الحدیث جدًا ضعیف "

(کتاب الجرح والتعدیل ۹/ ۲۳۰ ت ۹۶۵)

ابوزرعہ الرازی نے فرمایا: " واهي الحدیث " (اسئلۃ البرذعی ۲/ ۴۵۹، ۶۹۱)

یحییٰ بن معین نے فرمایا: " لیس بشيء " (سوالات ابن الجنید: ۶۹۷)

ابن حبان کی توثیق و جرح باہم متناقض و متعارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہے اور ابن عدی وغیرہ کی توثیق جمہور محدثین کے خلاف ہونے کی وجہ سے مرجوح ہے۔ بیہقی نے فرمایا:

" وھو منکر الحدیث " (شعب الایمان: ۲۱۱۷ حدیث: من سره أن يسبق الدائب)

دارقطنی نے فرمایا: " وکان ضعیفًا " (العلل ۱۳/ ۱۱۷ سوال ۲۹۹۴)

حافظ ابن حجر نے فرمایا: " ضعیف " (تقریب التہذیب: ۷۸۸۹)

حافظ ذہبی نے فرمایا: " لین " (المجرد فی اسماء رجال ابن ماجہ: ۱۳۱۴)

ہیثمی نے توثیقِ ابن حبان کا ذکر کرنے کے باوجود فرمایا:

" وضعفه الجمهور " اور جمہور نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد ۱۰/ ۲۰۰)

ثابت ہوا کہ یہ سند ضعیف و مردود ہے، لہٰذا امام ابن سیرین سے ثابت ہی نہیں۔

سوال محترم حافظ صاحب! کیا اللہ عرش پر ہے؟ اگر ہے تو اس کے دلائل قرآن و حدیث سے واضح کر دیں۔ جزاکم اللہ خیراً (ملک عطا الرحمٰن، درہ، خانپور)

الجواب آپ کے سوال کا جواب ایک مضمون کی صورت میں درج ذیل ہے:

مسئلة استواء الرحمٰن علی العرش

قرآن مجید کی روشنی میں:

۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ " بے شک تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا۔ " (سورة الأعراف: ٥٤)

(نیز دیکھئے سورۂ یونس:۳،الرعد:۲،طٰہٰ:۵،الفرقان:۵۹،السجدۃ:۴،الحدید:۴،استویٰ کا مطلب ہے ارتفع ، علا ، یعنی بلند ہوا ہے، دیکھئے صحیح بخاری کتاب التوحید اور تحقیقی مقالات ۱۳/۱،۱۴)

۲) ﴿ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ﴾ ''اس کا عرش پانی پر تھا۔'' (ھود: ۷)

(نیز دیکھئے التوبۃ:۱۲۹،الانبیاء:۲۲،المومنون:۸۶،۱۱۶،النمل:۲۶،المومن:۷،۱۵،الزخرف:۸۲،البروج:۱۵)

۳) ﴿ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴾ ''اور اس دن آپ کے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائیں گے آٹھ (فرشتے)'' (الحاقۃ: ۱۷، نیز دیکھئے الزمر: ۷۵)

٤) ﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴾

''کیا تم اس سے بے خوف ہو جو آسمان میں (یعنی اوپر) ہے کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے، پھر وہ تیزی کے ساتھ ہلنے لگ جائے۔''

(الملک: ١٦، نیز دیکھئے الملک: ١٧، القصص: ٣٨، المومن: ٣٦۔٣٧، بنی اسرائیل: ٤٢، الأنعام: ١٨، ٦١، النحل: ٥٦، البقرۃ: ١٤٤)

٥) ﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ ﴾

''اور انھوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔'' (النساء: ١٥٧۔١٥٨، نیز دیکھئے آل عمران: ٥٥ ، اس پر امت کا اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور وہ آسمان میں زندہ ہیں۔ آسمان سے اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ دیکھئے تحقیقی مقالات ۱/ ۸۷)

٦) ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ ''آسمان سے زمین تک تدبیرِ امور کرتا ہے، پھر وہ (امر) اس کی طرف چڑھتا ہے ایک دن میں (کہ) جس کی مقدار ہزار سال ہے۔'' (السجدۃ: ٥)

٧) ﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ﴾ ''اسی کی طرف چڑھتی ہیں پاکیزہ باتیں اور صالح عمل وہی اسے (بھی) اوپر اٹھاتا ہے'' (الفاطر: ١٠)

٨) ﴿ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ ﴾ ''آپ کا رب آئے گا اور فرشتے صف

بہ صف۔'' (الفجر : ۲۲)

۹) ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ ''اس جیسا کوئی بھی نہیں ہے اور وہ سننے، دیکھنے والا ہے۔'' (الشوریٰ : ۱۱)

احادیث کی روشنی میں:

۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أَيْنَ اللّٰهُ ؟)) اللہ کہاں ہے؟ تو لونڈی نے عرض کیا: ''فِي السَّمَاءِ'' آسمان میں (یعنی آسمانوں سے اوپر) ہے۔ آپ نے فرمایا: ''میں کون ہوں؟'' لونڈی نے کہا: اللہ کے رسول۔ آپ نے فرمایا: ((أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ)) ''اسے آزاد کردو یہ مومنہ عورت ہے۔'' (صحیح مسلم :۵۳۷ ، کتاب التوحید لابن خزیمة ۱/ ۲۷۹ وسندہ صحیح)

۲) جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم عرفہ کے خطبہ میں فرمایا: ''کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟'' تو صحابہ نے جواب دیا: جی ہاں۔ آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور فرمایا: ''اے اللہ! گواہ رہ۔'' (صحیح مسلم ۱/ ۳۹۷ ح ۱۲۱۸)

۳) عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ)) ''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر جو آسمان میں (اوپر) ہے رحم فرمائے گا۔ (رواہ الترمذي ۲ / ۱٤ ، وقال : هذا حديث حسن صحيح ، وصححه الحاكم ٤/ ۱۵۹ ، ووافقه الذهبي ، وسنده حسن)

٤) ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أَلَا تَأْمَنُوْنِي وَ أَنَا أَمِيْنُ مَنْ فِي السَّمَاءِ؟ يَأْتِيْنِي خَبَرُ السَّمَاءِ صَبَاحًا وَ مَسَاءً.)) ''کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے اور میں اس کا امین ہوں جو آسمان میں ہے۔ میرے پاس صبح و شام آسمان کی خبریں آتی ہیں۔''

(صحیح بخاري ۲/ ٦۲٤ ح ٤۳۵۱ و صحیح مسلم ۱/ ۳٤۱ ح ۱۰٦٤)

٥) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلاتا ہے، پھر وہ انکار کر دیتی ہے تو وہ جو آسمان میں ہے اس عورت پر ناراض ہو جاتا ہے جب تک مرد اس سے راضی نہ ہو جائے۔'' (صحیح مسلم ١/ ٤٦٤ ح١٤٣٦)

٦) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا...)) ''ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات دنیا کے آسمان پر نازل ہوتا (اترتا) ہے۔''

(موطأ امام مالك ص ١٩٧، واللفظ له، صحيح بخاري ٢/ ١١١٦ ح١١٤٥، صحيح مسلم ١/ ٢٥٨ ح٧٥٨، یہ حدیث متواتر ہے)

٧) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(نیک روح سے) کہا جاتا ہے: ((مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبَةِ)) پاکیزہ نفس کو خوش آمدید ((فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِي فِيهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ)) اسی طرح کہا جاتا ہے حتیٰ کہ اس روح کو اس آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہے۔'' (مسند أحمد ٢/ ٢٦٤ وسنده صحيح)

٨) اور فرمایا: ((إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا قَضَى الْخَلْقَ كَتَبَ عِنْدَهُ فَوْقَ عَرْشِهِ إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي)) ''جب اللہ نے تخلیق پوری کر دی تو اپنے پاس عرش کے اوپر (ایک کتاب میں) لکھ کر رکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''

(صحيح بخاري ٢/ ١١٠٤ ح ٧٤٢٢ واللفظ له، صحيح مسلم ٢/ ٣٥٦ ح٢٧٥١)

٩) نیز فرمایا: ((يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَإِذَا أَنَا بِمُوْسٰى آخِذٌ بِقَائِمَةٍ مِنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ)) ''قیامت کے دن سب بے ہوش ہو جائیں گے (پھر میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا) تو دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے کھڑے ہیں (یعنی وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے۔)''

(صحيح بخاري ٢/ ١١٠٤ ح٧٤٢٧، واللفظ له، صحيح مسلم: ٢/ ٢٦٧ ح٢٣٧٣)

١٠) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: ((فَرَجَعَ إِلٰى رَبِّهِ، فَقَالَ: أَرْسَلْتَنِي إِلٰى عَبْدٍ ...))

"پھر وہ (موت کا فرشتہ) اپنے رب کی طرف واپس گیا اور کہا: تو نے مجھے اپنے بندے (موسیٰ علیہ السلام) کی طرف بھیجا۔" (صحيح بخاري: ١٣٣٩، ٣٤٠٧، صحيح مسلم: ٢٣٧٢)

آثارِ صحابہ

۱) جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو امیر المومنین سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا: جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو وہ جان لے کہ بلاشبہ محمد ﷺ فوت ہو چکے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو وہ جان لے کہ اللہ آسمان میں زندہ ہے اس پر موت نہیں آئے گی۔

(الرد على الجهميه للدارمي ص ٧٨ وسنده حسن، التاريخ الكبير ١/ ٢٠١-٢٠٢)

۲) ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا دوسری ازواج النبی ﷺ پر فخر کرتے ہوئے فرمایا کرتی تھیں: "زَوَّجَنِي اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوَاتٍ." مجھے اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے نبی ﷺ کی بیوی بنایا ہے۔ (صحيح بخاري: ٧٤٢٠)

۳) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: اللہ نے آپ کی برأت سات آسمانوں کے اوپر سے نازل کی ہے۔ (طبقات ابن سعد ٨/ ٧٠ و سنده حسن، و أصله في صحيح البخاري ٢/ ٦٦٩)

٤) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آسمان دنیا اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے اور ہر آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے اور کرسی اور پانی کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ کرسی پانی کے اوپر ہے اور اللہ کرسی کے اوپر ہے اور وہ تمھارے اعمال جانتا ہے۔

(كتاب التوحيد لابن خزيمة ١/ ٢٤٤ و سنده حسن)

۵) سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک اللہ حیا فرماتا ہے جب بندہ اس کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے کہ انھیں خالی لوٹا دے۔

(رواه الحاكم في المستدرك ١/ ٤٩٧ وصححه على شرط الشيخين ووافقه الذهبي)

یہ حدیث مرفوعاً بھی صحیح ثابت ہے۔ دیکھئے ابوداود: ۱۴۸۸، الترمذی: ۳۵۵۶، ابن ماجہ: ۳۸۶۵)

٦) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر سے جانتا ہے کہ میں عثمان کے قتل کو پسند نہیں کرتی تھی۔ (رواہ الدارمي فی الرد علی الجهمية ص ۲۷ وقال الالباني: و إسناده صحيح / مختصر العلو ص ١٠٤)

اس پر صحابہ وتابعین کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ سات آسمانوں سے اوپر عرش پر مستوی ہے (جس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں) اس کے خلاف صحابہ وتابعین سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

جہمیہ کے شبہات اور ان کے جوابات

بعض لوگ کہتے ہیں: ﴿هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا﴾ وہ ان کے ساتھ ہے وہ جہاں بھی ہوں۔ (المجادلة: ٧)

اسی طرح وہ آیت کہ ہم شاہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔ (ق: ١٦)

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اس معیت کا مفہوم اللہ تعالیٰ کا علم ہے اسی بات پر صحابہ وتابعین کا اجماع ہو چکا ہے۔

(توحید خالص ص ۲۷۶، الرد علی الجہمیہ ص ۱۹، شرح حدیث النزول ص ۴۷)

دوسرے یہ کہ ان آیات میں خود علم کا (نعلم ، يعلم وغيره) ذکر ہے۔ جو اس بات کی قوی دلیل ہے کہ یہ معیت بالعلم ہے۔

تیسرے یہ کہ دیگر آیات، صحیح احادیث اور اجماع صحابہ ان آیات کے عموم کی تخصیص کرتا ہے۔

یاد رہے کہ قرآن وحدیث میں یہ کہیں بھی نہیں ہے کہ اللہ ہر جگہ (اپنی ذات کے ساتھ) موجود ہے۔ تعالى الله عن ذلك علواً كبيراً. اور اللہ کے لیے "حاضر" کا لفظ قرآن وحدیث اور اجماع سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔

عقلی دلائل

۱: لوگ دعا کرتے وقت ہاتھ اوپر اٹھاتے ہیں۔

۲: نبی ﷺ معراج کی رات آسمانوں پر اللہ کے پاس گئے تھے۔

۳: فرشتے آسمانوں سے زمین پر اترتے ہیں اور زمین سے آسمانوں پر جاتے ہیں اور اللہ ان سے اپنے بندوں کے بارے میں سوال کرتا ہے، حالانکہ وہ خود سب سے زیادہ جانتا ہے۔

۴: خالق اپنی مخلوق سے جدا ہے۔

تنبیہ: اس موضوع پر سیر حاصل بحث کے لیے دیکھئے مقالات (۱/۱۳) اور فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الاحکام (۱/۲۹ تا ۵۵) وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور صوفیاء

سوال اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق علماءِ اہل سنت اور صوفیا کا فرق بیان کیجئے اور صحیح عقیدہ کیا ہے؟

الجواب اہلِ سنت کا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ اور صفات پر اس طرح ایمان لانا فرض ہے جس طرح قرآن، حدیث، اجماع اور آثارِ سلف صالحین سے ثابت ہے مثلاً:

۱: اللہ تعالیٰ سات آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

۲: اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری پہر میں آسمانِ دنیا پر نازل ہوتا ہے۔

۳: اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں جیسا کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

ان صفات اور تمام صفاتِ ثابتہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کے استواء علی العرش اور علوِ سبحانہ وتعالیٰ کے دلائل کے لئے علمائے اہلِ سنت نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، مثلاً حافظ ذہبی رحمہ اللہ (متوفی ۷۴۸ھ) کی مشہور کتاب: العلو للعلی الغفار دو جلدوں میں تحقیق کے ساتھ چھپی ہوئی ہے جس کے ۱۶۴۱ صفحات ہیں۔

امام عبداللہ بن المبارک المروزی رحمہ اللہ نے فرمایا: "نعرف ربنا فوق سبع سموات علی العرش استوی ، بائن من خلقه و لا نقول کما قالت الجهمية: إنه ههنا - و أشار إلی الأرض ." ہم اپنے رب کو جانتے ہیں، وہ سات آسمانوں سے اوپر عرش پر مستوی ہے، اپنی مخلوقات سے جدا ہے، اور ہم جہمیہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ وہ یہاں ہے_ اور انھوں نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

(کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ۴۲۷ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ص ۵۳۸، تیسرا نسخہ ۲/۳۳۵ ح ۹۰۲)

اہل سنت کے خلاف جہمیہ (ایک انتہائی خطرناک گمراہ فرقہ) اور مبتدعین ضالین مُضلّین کے دو عقیدے ہیں:

1: معطلہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ سامنے ہے نہ پیچھے، نہ دائیں طرف ہے نہ بائیں طرف، یعنی وہ جہاتِ ستہ میں سے کسی طرف نہیں!

یہ (معطلہ) لوگ کہتے ہیں: " (أنه تعالىٰ ليس في جهة) من الجهات " وہ (اللہ) تعالیٰ جہات میں سے کسی جہت پر نہیں ہے۔ (دیکھئے شرح المواقف ج۸ص۲۲)

یہ تو معدوم (جس کا کوئی وجود اور ذات اصلاً نہ ہو) کی صفت اور تعریف ہے۔

دیکھئے اجتماع الجیوش الاسلامیہ لابن القیم (۱۸۰/۱، الشاملہ)

2: جہمیہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ہر جگہ بذاتہ اور ہر مخلوق میں ہے۔ معاذ اللّٰہ

ان لوگوں پر سلف صالحین نے شدید رد فرمایا، بلکہ تکفیر بھی کی ہے، مثلاً حافظ ذہبی نے فرمایا:

" و مقالة الجهمية :أن الله في جميع الأمكنة. تعالى الله عن قولهم . "

جہمیہ کا قول ہے کہ اللہ ہر مکان میں ہے۔ پاک ہے اللہ اُن کے قول سے۔

(العلو للعلی الغفار ج۲ص۱۰۷۰ ح ۳۵۲)

یہ لوگ فرقہ ضالہ مشبہہ کی ایک قسم ہیں۔ أعاذنا اللّٰه من شرهم

صوفیاء سے عام طور پر دو گروہ مراد لئے جاتے ہیں:

1: صحیح العقیدہ صالحین اور زہادِ اُمت مثلاً حسن بصری، فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادھم اور بشر بن الحارث الحافی رحمہم اللہ، یہ سب اہل سنت کے عقیدے پر تھے اور جہمیہ، معطلہ مشبہہ اور مبتدعین کے عقائدِ باطلہ سے بہت دور تھے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا: " ولا يجوز وصفه بأنه في كل مكان بل يقال : إنه في السماء على العرش " یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ (اللہ) ہر جگہ میں ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے: وہ آسمان میں عرش پر ہے۔ (الغنیۃ لطالبی طریق الحق ج۱ص۵۶، العلو للعلی الغفار ج۲ص۱۳۷۰ فقرہ: ۳۴۸، ذیل طبقات الحنابلہ لابن رجب ۲۹۶/۱)

یاد رہے کہ غنیۃ الطالبین عبدالقادر جیلانی کی کتاب ہے۔ دیکھئے کتاب الذیل علی طبقات الحنابلہ لابن رجب (۱/۲۹۶) والعلو للعلی الغفار (۲/۱۳۷۰)

عمرو بن عثمان المکی شیخ الصوفیہ نے اپنی کتاب: آداب المریدین میں کہا:

" المستوی علی عرشه بعظمة جلاله دون کل مکان ." وہ اپنی عظمت وجلالت کے ساتھ اپنے عرش پر مستوی ہے، ہر جگہ نہیں۔ (العلو للعلی الغفار ۲/۱۲۲۵)

۲: حلولی اور ضال مضل (گمراہ) صوفیاء مثلاً حسین بن منصور الحلاج اور ابن عربی المرسی وغیرہما، ان کے اور اہلِ سنت کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مثلاً ابن عربی نے کہا:

"پس تو بندہ ہے اور تو رب ہے" (فصوص الحکم ص ۱۵۷، توضیح الاحکام ج ۱ ص ۵۷)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

کتاب مذکور فصوص الحکم کا مصنف اور اس جیسے دوسرے مثلاً قونوی، تلمسانی، ابن سبعین، ششتری، ابن فارض اور ان کے پیروکاروں کا مذہب یہ ہے کہ وجود ایک ہے۔ انھیں وحدت الوجود والے کہا جاتا ہے اور وہ تحقیق وعرفان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور یہ لوگ خالق کے وجود کو مخلوقات کے وجود کا عین قرار دیتے ہیں۔

(مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۱۲۳۔۱۲۴، توضیح الاحکام ج ۱ ص ۵۶)

عبدالکریم بن ابراہیم الجیلی (غالی صوفی) نے ایک مسافر کا کلام بطورِ تائید اور بطورِ حجت نقل کیا "میں اپنی ہی مخلوق اور اپنا ہی خالق ہوں۔"

(انسان کامل، اردو مترجم ص ۳۳ طبع نفیس اکیڈمی کراچی)

عبدالکریم الجیلی نے اپنی اس کتاب کے شروع میں کہا:

"پس وہی حامد ہے اور وہی حمد اور وہی محمود وہ مطلق عین اُس چیز کا ہے جس کا نام خلق اور حق ہے۔" (انسان کامل ص ۱۷)

حاجی امداد اللہ تھانہ بھونوی (جنھیں بعض لوگ مہاجر مکی کہتے ہیں) نے کہا:

"بندہ قبل وجود خود باطن خدا تھا اور خدا ظاہر بندہ" (شمائم امدادیہ ص ۳۸)

حاجی امداد اللہ نے کہا:

''اکثر لوگ توحید وجودی میں غلطی کر کے گمراہ ہو جاتے ہیں تمثیل بیان فرمائی کہ کسی گُرو کا ایک چیلہ توحید وجودی میں مستغرق تھا راستہ میں ایک فیل مست ملا اسپر فیلبان پکارتا آتا تھا کہ یہ ہاتھی مست ہے میرے قابو میں نہیں ہے۔ اس (چیلہ کو) لوگوں نے بہت منع کیا۔ مگر اس نے نہ مانا اور کہا وہی تو ہے اور میں بھی وہی ہوں خدا کو خدا سے کیا ڈر۔ آخر ہاتھی نے اسے مار ڈالا۔ جب اس کے گُرو نے یہ حال سنا گالی دیکر کہا کہ ہاتھی جو مظہر مضل تھا۔ اسکو تو دیکھا اور فیلبان کو کہ مظہر ہادی تھا نہ دیکھا ہادی و مضل اوپر نیچے جمع تھے۔ ع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔'' (شمائم امدادیہ ص ۹۰، امداد المشتاق ص ۱۲۶ الفقرہ: ۳۱۸، دوسرا نسخہ ص ۱۳۲)

اس قصے سے پانچ باتیں ظاہر ہیں:

۱: گُرو کا چیلہ اپنے آپ کو اور ہاتھی کو خدا سمجھتا اور کہتا تھا۔

۲: گُرو کے نزدیک ہاتھی مظہر مضل اور فیلبان (ہاتھی چلانے والا) مظہر ہادی تھا۔

۳: صوفیاء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے بقول اُن کے خیر مظہر ہادی اور بقول اُن کے شر مظہر مضل ہے، جیسا کہ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

۴: گُرو اور حاجی امداد اللہ دونوں نے چیلے کے اس عقیدے ''خدا کو خدا سے کیا ڈر؟'' کی تردید نہیں کی بلکہ لوگوں کو سمجھایا کہ ہاتھی پر فیلبان بھی خدا (مظہر ہادی) تھا، لہٰذا چیلے کو اوپر والے خدا کی بات ماننا چاہیے تھی اور نہ ماننے کی وجہ سے وہ مارا گیا۔

۵: صوفیاء وحدت الوجود کے عقیدے کو دل و جان سے صحیح سمجھتے ہیں۔

یہ موضوع بہت تفصیل طلب ہے، لیکن اختصار کی وجہ سے صوفیائی عقیدہ وحدت الوجود کا ایک واقعہ بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

رشید احمد گنگوہی دیوبندی نے ایک دفعہ کہا: ''ضامن علی جلال آبادی کی سہارنپور میں بہت رنڈیاں مرید تھیں ایکبار یہ سہارنپور میں کسی رنڈی کے مکان پر ٹھیرے ہوئے تھے سب مریدنیاں اپنے میاں صاحب کی زیارت کیلئے حاضر ہوئیں مگر ایک رنڈی نہیں آئی میاں

صاحب بولے کہ فلانی کیوں نہیں آئی رنڈیوں نے جواب دیا" میاں صاحب ہم نے اُس سے بہتیرا کہا کہ چل میاں صاحب کی زیارت کو اُس نے کہا میں بہت گناہگار ہوں اور بہت روسیاہ ہوں میاں صاحب کو کیا منہ دکھاؤں میں زیارت کے قابل نہیں" میاں صاحب نے کہا نہیں جی تم اُسے ہمارے پاس ضرور لانا چنانچہ رنڈیاں اُسے لیکر آئیں جو وہ سامنے آئی تو میاں صاحب نے پوچھا "بی تم کیوں نہیں آئی تھیں؟" اس نے کہا حضرت روسیاہی کی وجہ سے زیارت کو آتی ہوئی شرماتی ہوں۔ میاں صاحب بولے "بی تم شرماتی کیوں ہو کرنے والا کون اور کرانے والا کون وہ تو ہی ہے" رنڈی یہ سُنکر آگ ہوگئی اور خفا ہو کر کہا لاحول ولا قوۃ اگرچہ روسیاہ و گناہگار ہوں مگر ایسے پیر کے مُنہ پر پیشاب بھی نہیں کرتی" میاں صاحب تو شرمندہ ہو کر سرنگوں رہ گئے اور وہ اُٹھکر چلدی۔" (تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۲۴۲)

اس گنگوہی قصے سے معلوم ہوا کہ صوفیاء کے نزدیک جو شخص توحید میں غرق ہو تو اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ زنا کرنے اور کرانے والا وہی (یعنی اللہ) ہے۔ معاذ اللہ، استغفر اللہ

نقلِ کفر کُفر نہ باشد

خود رشید احمد گنگوہی نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے لکھا:

"تیرا ہی ظل ہے۔ تیرا ہی وجود ہے، میں کیا ہوں، کچھ نہیں ہوں اور وہ جو میں ہوں وہ تو ہے اور میں اور تو خود شرک در شرک ہے۔"

(مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰، فضائل صدقات حصہ دوم ص ۵۵۶، بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم ص ۱۵)

مختصر یہ کہ اس قسم کے صوفیاء اور وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والے قرآن وحدیث کے مخالف اور اہلِ سنت سے خارج ہیں۔ أعاذنا اللہ من شرھم۔ آمین

دینِ اسلام کا اصل ماخذ کیا ہے؟

سوال کیا ہمارے دینِ اسلام کی تعلیمات کا اصل ماخذ قرآن، سنت اور اجماع ہے؟ (محمد نعیم، نیو خانپور)

الجواب جی ہاں! دینِ اسلام کے اصل ماخذ تین ہیں:

۱: کتاب اللہ یعنی قرآن مجید

۲: سنت یعنی حدیث

۳: اجماعِ اُمت

دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو جلد ۱ عدد: ۱ ص ۴

ایک حدیث میں لزومِ جماعت کا ذکر بھی آیا ہے۔

(مسند احمد ۱۸۳/۵ ح ۲۱۵۹۰ وسندہ صحیح، الحدیث حضرو: ۳۷ ص ۵)

لزومِ جماعت کی تشریح میں امام ابو عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۴ھ) نے فرمایا: ''و أمر رسول اللّٰه بلزوم جماعة المسلمین مما یحتج به في أن إجماع المسلمین - إن شاء اللّٰه - لازم.'' اور رسول اللہ (ﷺ) کے حکم: لزومِ جماعت المسلمین سے حجت پکڑی جاتی ہے کہ ان شاء اللہ مسلمانوں کا اجماع لازم (یعنی حجت) ہے۔ (کتاب الرسالہ ص ۴۰۳ فقرہ: ۱۱۰۵)

نیز دیکھئے صحیح ابن حبان (الاحسان: ۴۲۰۵، دوسرا نسخہ: ۴۲۳۳)

ایک حدیث میں آیا ہے: ''لا یجمع اللّٰه أمتي علی ضلالة أبدًا و ید اللّٰه علی الجماعة.'' اللہ میری اُمت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت (اجماع) پر ہے۔ (المستدرک ج ۱ ص ۱۱۶ ح ۳۹۹ عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وسندہ صحیح)

حاکم نیشاپوری نے اس حدیث سے اجماع کا حجت ہونا ثابت کیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لن تجتمع أمتي على الضلالة أبدًا فعليكم بالجماعة فإن يد الله على الجماعة .)) میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، لہٰذا تم جماعت کو لازم پکڑو کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۲ص ۴۴۷ح ۱۳۶۲۳، وسندہ حسن)

اجماع اتفاق کو کہتے ہیں۔ دیکھئے تاج العروس (ج ۱۱ص ۷۵) القاموس المحیط (ص ۹۱۷) المعجم الوسیط (۱/۱۳۵) اور القاموس الوحید (ص ۲۸۰) وغیرہ۔

امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (متوفی ۲۷۷ھ) نے فرمایا: ''و اتفاق أهل الحديث على شيً يكون حجة . '' اور اہلِ حدیث کا کسی چیز پر اتفاق کر لینا حجت ہوتا ہے۔

(کتاب المراسیل ص ۱۹۲)

امام ابو عبید القاسم بن سلام رحمہ اللہ نے آدھے یا چوتھائی سر کے مسح کی توقیت (تعیین وحد بندی) کے بارے میں فرمایا: ''لا يجوز إلا يوجد علمه في كتاب أو سنة أو اجماع . '' یہ جائز نہیں ہے الا یہ کہ اس کا علم کتاب، سنت یا اجماع میں ہو۔

(کتاب الطہور ص ۱۲۴، تحت ح ۳۳۴)

معلوم ہوا کہ امام ابو عبید اجماع کو حجت سمجھتے تھے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

اجماع کا معنی یہ ہے کہ احکام میں سے کسی حکم پر مسلمانوں کے علماء جمع ہو جائیں اور جب کسی حکم پر اُمت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ علماء کے اجماع سے باہر نکلے کیونکہ اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، لیکن بہت سے مسائل میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اجماع ہے، حالانکہ ان میں اجماع نہیں ہوتا بلکہ (اس کے مخالف) دوسرا قول کتاب و سنت میں زیادہ راجح ہوتا ہے۔ (مجموع فتاوی ج ۲۰ص ۱۰)

امام عبد اللہ بن المبارک المروزی رحمہ اللہ (متوفی ۱۸۱ھ) نے فرمایا: ''اجماع الناس على شيً أوثق في نفسي من سفيان عن منصور عن إبراهيم عن علقمة عن عبد الله بن مسعود . '' لوگوں کا کسی چیز پر اجماع میرے نزدیک سفیان (الثوری) عن

منصور (بن المعتمر) عن ابراہیم (النخعی) عن علقمہ (بن قیس) عن عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ (الکفایہ للخطیب ص ۴۳۴ وسندہ حسن)

معلوم ہوا کہ امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ اجماع کو ز بردست حجت سمجھتے تھے۔

حافظ محمد عبداللہ غازیپوری رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۳۷ھ) ایک مشہور اہلِ حدیث عالم نے بھی اجماعِ اُمت کا حجت ہونا تسلیم کیا ہے۔

دیکھئے ابراءاہل الحدیث والقرآن (ص ۳۲) اور الحدیث حضرو: ۱ص ۴

یاد رہے کہ کتاب وسنت کا وہی مفہوم معتبر ہے جو سلف صالحین اور علمائے اہلِ سنت سے بلا اختلاف ثابت ہے اور ادلۂ ثلاثہ کی غیر موجودگی میں اجتہاد (مثلاً آثارِ سلف صالحین سے استدلال وغیرہ) جائز ہے۔

سلف صالحین اور علمائے اہلِ سنت

سوال ہمارے اسلاف اور علمائے اہلِ سنت سے مراد کون لوگ ہیں؟

الجواب اسلاف سے مراد اہلِ سنت کے متفقہ سلف صالحین ہیں مثلاً:

۱: تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین

۲: تمام ثقہ وصدوق تابعین عظام مثلاً سعید بن المسیب، عامر الشعبی، علی بن الحسین عرف زین العابدین، سعید بن جبیر، سالم بن عبداللہ بن عمر، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، محمد بن سیرین، نافع مولیٰ ابن عمر اور ابن شہاب الزہری وغیرہم۔ رحمہم اللہ اجمعین

۳: تمام ثقہ وصدوق تبع تابعین، مثلاً مالک بن انس المدنی، عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی، شعبہ بن الحجاج، سفیان الثوری، جعفر بن محمد الصادق، زائدہ بن قدامہ، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، معمر بن راشد اور عبداللہ بن المبارک وغیرہم۔ رحمہم اللہ اجمعین

٤: دوسری اور تیسری صدی ہجری کے تمام ثقہ وصدوق عندالجمہور علمائے اہلِ سنت، مثلاً محمد بن ادریس الشافعی، یحییٰ بن سعید القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، احمد بن حنبل، محمد بن

اسماعیل البخاری، علی بن المدینی ، یحییٰ بن معین ، وکیع بن الجراح ، عبداللہ بن وھب المصری ،ابوبکر بن ابی شیبہ، مسلم بن الحجاج النیسابوری ، ابوداود السجستانی ، ابوعیسیٰ الترمذی ، بقی بن مخلد ، اسحاق بن راھویہ ، ابوزرعہ الرازی ، ابوحاتم الرازی ، ابوبکر الحمیدی ، عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی ، ابن ماجہ اور قاسم بن محمد القرطبی وغیرہم۔ رحمہم اللہ اجمعین

یہ سب اکابر علمائے اہلِ سنت اور اہلِ حق تھے۔

۵: چوتھی صدی ہجری کے تمام ثقہ وصدوق علماء، مثلاً محمد بن اسحاق بن خزیمہ النیسابوری ، محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری ، احمد بن شعیب النسائی ، علی بن عمر الدارقطنی ، ابوعوانہ الاسفرائنی ، محمد بن جریر بن یزید الطبری ، عمر بن احمد بن عثمان عرف ابن شاہین البغدادی ، ابوسلیمان حمد الخطابی ، محمد بن الحسین الآجری اور محمد بن حبان بن احمد البستی وغیرہم۔

رحمہم اللہ اجمعین

٦: پانچویں صدی کے تمام ثقہ وصدوق علماء مثلاً ابن عبدالبر اندلسی ، احمد بن الحسین البیہقی ، ابونصر عبیداللہ بن سعید السجزی الوائلی ، خطیب بغدادی ، ابن حزم ، ابوبکر برقانی ، ابوعمر احمد بن محمد بن عبداللہ الطلمنکی الاثری ، ابونعیم الاصبہانی ، ابویعلیٰ الخلیلی اور ابوعثمان الصابونی وغیرہم۔

رحمہم اللہ اجمعین

۷: چھٹی صدی ہجری کے تمام ثقہ وصدوق علماء مثلاً حسین بن مسعود البغوی ، قوام السنۃ اسماعیل بن محمد الانصاری ، عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی ، ابوبکر بن العربی ، ابوطاہر السلفی ، ابوسعد السمعانی ، عبدالحق اشبیلی ، ابوالقاسم السہیلی ، ابن عساکر الدمشقی اور ابوالفرج ابن الجوزی وغیرہم۔ رحمہم اللہ اجمعین

۸: ساتویں صدی ہجری کے تمام ثقہ وصدوق علماء ، مثلاً ضیاء مقدسی ، ابن القطان الفاسی ، ابن الاثیر الجزری ، عبدالعظیم المنذری ، ابن سید الناس ، ابوعبداللہ محمد بن القرطبی ، ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی ، ابوشامہ المقدسی ، ابن نقطہ البغدادی اور نووی وغیرہم۔

رحمہم اللہ اجمعین

۹: آٹھویں صدی ہجری کے تمام ثقہ وصدوق علماء، مثلاً ابوالحجاج المزی، ابن تیمیہ، ابن دقیق العید، ذہبی، ابن کثیر، ابن قیم، ابن سید الناس، ابو حیان محمد بن حیان بن یوسف الاندلسی، ابن عبدالہادی اور حسین بن محمد بن عبداللہ الطیبی وغیرہم۔ رحمہم اللہ اجمعین

۱۰: نویں صدی ہجری کے تمام ثقہ وصدوق علماء، مثلاً ابن حجر عسقلانی، عبدالرحیم عراقی، نورالدین ہیثمی، بلقینی، ابن ناصر الدین، ابوزرعہ ابن العراقی، السبط ابن العجمی، تقی الدین محمد بن احمد الفاسی، احمد بن ابی بکر البوصیری اور ابوالخیر محمد بن محمد عرف ابن الجزری الدمشقی وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین

یہ سب سلف صالحین تھے اور مروجہ تقلید (کہ تمام مسلمانوں پر ائمہ اربعہ میں سے صرف ایک امام کی تقلید واجب ہے کے نظریے) کے قائل و فاعل نہیں تھے بلکہ کتاب وسنت اور اجماع کے قائل و فاعل تھے۔

تنبیہ: کتاب وسنت اور اجماع کے صریح مخالف ہر شخص کی بات مردود ہے اور خیر القرون کے اکابر علماء کو بعد والے تمام علماء پر اور تعارض کے وقت اوثق کو ثقہ وصدوق پر ہمیشہ ترجیح حاصل ہے۔

جمہور سے مراد کون لوگ ہیں؟

سوال آپ کی اکثر تصانیف میں جمہور کا ذکر آتا ہے۔ جمہور سے مراد کون لوگ ہیں؟ آپ کے نزدیک جمہور میں کون کون سے محدثین اور علماء شامل ہیں؟

(عبدالمتین۔ آسٹریلیا)

الجواب اسماء الرجال میں جمہور سے مراد ثقہ وصدوق صحیح العقیدہ محدثین کرام کی اکثریت ہے، مثلاً ایک کے مقابلے میں دو جمہور ہیں۔

مسئلہ سمجھانے کے لئے ایک مثال پیشِ خدمت ہے:

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ایک بنیادی راوی فلیح بن سلیمان المدنی رحمہ اللہ ہیں۔

ان پر درج ذیل محدثین نے ضعیف وغیرہ کی جرح کی ہے:

☆ یحیٰ بن معین، ابو حاتم الرازی، نسائی، ابو احمد الحاکم الکبیر، علی بن المدینی، ابو کامل مظفر بن مدرک، ابو زرعۃ الرازی، عقیلی، ابن الجوزی اور بیہقی رحمہم اللہ

(کل ۱۰ عدد)

امام ابو داود کی طرف منسوب جرح باسند صحیح ثابت نہیں، لہٰذا ان کا حوالہ پیش کرنا غلط ہے۔

اور درج ذیل محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، یعنی ثقہ وصحیح الحدیث وغیرہما قرار دیا ہے:

☆ بخاری، مسلم، بیہقی، ابن خزیمہ، ترمذی، حاکم، ابن عدی، ذہبی، ابن حبان، دارقطنی، ابن حجر العسقلانی، ابن الجارود، ابو عوانہ، ابو نعیم الاصبہانی، ضیاء المقدسی، بغوی اور ابن شاہین وغیرہم رحمہم اللہ (کل ۱۷ عدد) (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب: تحقیقی مقالات ۴/ ۳۶۸۔۳۷۰)

[تنبیہ: بیہقی نے ان کی ایک روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور ایک کو منکر کہا ہے جس کی تطبیق یہ ہے: " صحيح الحديث في غير ما انكر عليه "]

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ فلیح بن سلیمان جمہور یعنی اکثر محدثین کے نزدیک ثقہ و صدوق ہونے کی وجہ سے صحیح الحدیث یا حسن الحدیث راوی ہیں اور ان پر جرح مردود ہے۔

میرے نزدیک سلف صالحین کے مختلف طبقات ہیں، مثلاً: صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور اتباع تبع تابعین یعنی تین سو سالہ زمانۂ خیر القرون، چھٹی صدی ہجری تک زمانۂ تدوینِ حدیث اور اس کے بعد نویں صدی ہجری تک کے علمائے اسلام۔ صحابہ کے بعد ہر طبقے کے ہر فرد کے لئے صحیح العقیدہ اور ثقہ وصدوق عندالجمہو رہونا ضروری ہے۔

یاد رہے کہ ضعیف و مجروح، نیز اہلِ بدعت یعنی گمراہوں کو جمہور میں ہرگز شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ ان لوگوں کا وجود اور عدم وجود ایک برابر ہے۔ (۱۸/ اگست ۲۰۱۳ء)

آیت: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر

سوال سوال یوں ہے کہ ترمذی کی روایت ۳۰۹۵ جس کی سند کچھ اس طرح ہے:

حدثنا الحسين بن يزيد الكوفي: حدثنا عبد السلام بن حرب عن غطيف بن أعين عن مصعب بن سعد عن عدي بن حاتم قال: أتيت النبي ﷺ و في عنقي صليب من ذهب فقال: ياعدي! اطرح عنك هذا الوثن:"

شیخ صاحب! سوال یہ ہے کہ بعض احباب اس روایت کو صحیح/حسن بتلاتے ہیں۔ کیا شیخ البانی نے اس کو صحیح ترمذی ۳۰۹۵ میں ذکر کیا ہے؟ جبکہ انوار الصحیفہ فی الاحادیث الضعیفۃ من السنن الاربعہ صفحہ ۲۸۰ روایت نمبر ۳۰۹۵ میں غطیف کو ضعیف لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اس کے ضعف کی کیا وجوہات ہیں؟ اور کیا اس روایت کے کوئی صحیح یا حسن شاہد ہیں؟

اس سلسلے میں ابوالبختری کا قول جو حسن درجے کا ہے جامع بیان العلم وفضلہ میں اس بارے میں کیا لکھا ہے۔ (میں نے سنا ہے کہ روایت حسن ہے، واللہ اعلم) اور اس کی جلد نمبر اور رقم (شمار) نمبر بھی بتائیے اور کیا واقعی وہ سند حسن ہے؟ اس بارے میں تفصیلاً جوابی لفافے میں جواب دیجئے، ان شاء اللہ۔ جزاک اللہ خیراً (سائل: زعیم پشاور)

الجواب آیت: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی تشریح میں دو روایات ہیں:

۱) مرفوع

سیدنا عدی بن حاتم الطائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میں نے سونے کی ایک صلیب گردن میں لٹکا رکھی تھی، تو آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار پھینکو۔ اور میں نے آپ کو سورۃ التوبہ کی آیت: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ پڑھتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا: انھوں نے ان کی عبادت نہیں کی لیکن

جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اسے حلال سمجھتے اور جسے حرام قرار دیتے تو یہ اُسے حرام سمجھتے تھے۔ (سنن ترمذی: ۳۰۹۵، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/۱۱۶، التاریخ الکبیر للبخاری ۷/۱۰۶، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۷/۹۲ ح ۲۱۸۔۲۱۹ تفسیر ابن جریر ۵/۸۶۴ ح ۱۶۶۴۰۔۱۶۶۴۱، اور السلسلۃ الصحیحۃ ۷/۸۶۱ ح ۳۲۹۳)

اس روایت کی سند میں غطیف بن اعین ضعیف راوی ہے۔

۱: دارقطنی نے اسے الضعفاء والمتروکون (۴۳۰) میں ذکر کیا۔

۲: ابن الجوزی نے اسے الضعفاء والمتروکین (۲/ ۲۴۷ ت ۲۶۸۶) میں ذکر کیا۔

۳: ذہبی نے اسے دیوان الضعفاء والمتروکین میں درج کیا۔ (۲/۲۳۰ت ۳۳۳۳)

۴: ابن حجر نے فرمایا: ''**ضعیف**'' (تقریب التہذیب: ۵۳۶۴)

ان کے مقابلے میں ابن حبان نے اسے کتاب الثقات (۷/ ۳۱۱) میں ذکر کیا اور امام ترمذی کا قول مختلف فیہ ہے۔ کئی نسخوں میں صرف غریب کا لفظ ہے۔ (دیکھئے تحفۃ الاشراف ۷/ ۲۸۴ ت ۹۸۷۷، الاحکام الکبریٰ لعبد الحق الاشبیلی ۴/ ۱۱۷، اور تہذیب الکمال ۶/ ۱۳، وغیرہ)

بعض نسخوں میں حسن غریب کا لفظ ہے۔ اگر اسے ثابت مانا جائے تو یہ دو توثیقیں ہیں جو جمہور کی جرح کے مقابلے میں مرجوح ہیں، لہٰذا یہ راوی ضعیف ہی ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس روایت کے دو شواہد ذکر کیے ہیں:

۱: عامر بن سعد عن عدی بن حاتم (الکافی الشاف ۲/ ۲۶۴)

اس کی سند میں واقدی کذاب ہے اور واقدی تک سند نامعلوم ہے۔

۲: عطاء بن یسار عن عدی بن حاتم (ایضاً) اس کی سند نامعلوم ہے۔

بے سند روایتیں مردود ہوتی ہیں، لہٰذا شیخ البانی رحمہ اللہ کا دوسری سند کے ساتھ ملا کر اسے ''حسن ان شاء اللہ'' قرار دینا عجوبہ ہے۔

۲) موقوف

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا ان لوگوں نے ان احبار و رہبان کی عبادت کی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا: نہیں!، جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اُسے حلال سمجھتے تھے اور جب وہ کسی چیز کو اُن پر حرام قرار دیتے تو یہ اُسے حرام سمجھتے تھے۔

تفسیر عبدالرزاق (۱۰۷۳) تفسیر ابن جریر الطبری (۸۶۵/۵ ح ۱۶۶۴۳) السنن الکبریٰ للبیہقی (۱۱۶/۱۰، شعب الایمان: ۹۳۹۴ بلون آخر، دوسرا نسخہ: ۸۹۴۸) جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر (۲/۲۱۹ ح ۹۴۹) اور السلسلۃ الصحیحۃ (۸۶۵/۷)

یہ سند انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ابوالبختری سعید بن فیروز الطائی کی سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں۔ حافظ علائی نے لکھا ہے: ''سعید بن فیروز أبو البختري الطائي كثير الإرسال عن عمر و علي و ابن مسعود و حذيفة وغيرهم رضي الله عنهم.'' (جامع التحصیل ص ۱۸۳)

شیخ البانی نے بھی اس سند کا مرسل (یعنی منقطع) ہونا تسلیم کیا ہے۔ (حوالہ مذکورہ ص ۸۶۵)

اور یہ معلوم ہے کہ مرسل و منقطع روایت مردود کی ایک قسم ہے۔

تفسیر سعید بن منصور میں لکھا ہوا ہے:

حدثنا سعيد قال: نا هشيم ، قال: نا العوام بن حوشب ، عن حبيب بن أبي ثابت ، قال: حدثني أبو البختري الطائي ، قال: قال لي حذيفة: أرأيت قول الله عز وجل اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله؟ فقال حذيفة: أما إنهم لم يصلوا لهم ، ولكنهم كانوا ما أحلوا لهم من حرام استحلوه ، وما جرموا عليهم من الحرام حرموه فتلك ربوبيتهم " (۲۴۵/۵، ۲۴۶)

اس روایت کی سند ابوالبختری الطائی تک صحیح ہے، لیکن سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ ''لي'' کا لفظ کاتب یا ناسخ کی خطا ہے۔☆ اس کے علاوہ باقی تمام کتابوں میں یہ روایت سماع کی تصریح کے بغیر ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سعید بن منصور رحمہ اللہ نے یہ روایت اسی طرح ''قال لي'' کے ساتھ بیان کی تھی تو پھر موقوف سند صحیح ہے۔ واللہ اعلم

....

☆ غالب گمان یہی ہے کہ یہ ''قال لي حذيفة'' کی بجائے ''قيل لحذيفة'' ہے، جیسا کہ جامع البیان للطبری (۸۶۴/۵) میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔ ندیم ظہیر

تنبیہ: جامع بیان العلم وفضلہ (۲/ ۲۱۹ ح ۹۴۸) میں اس مفہوم کی ایک روایت (صحیح سند کے ساتھ) ابوالاحوص سلام بن سلیم الحنفی الکوفی سے عن عطاء بن السائب عن ابی البختری کی سند کے ساتھ مروی ہے، یعنی یہ صرف ابوالبختری کا اپنا قول ہے۔

ابوالاحوص کا شمار عطاء بن السائب کے قدیم شاگردوں میں نہیں۔(دیکھئے اختصار علوم الحدیث بتحقیقی ص ۱۶۶) لہٰذا یہ مقطوع سند بھی ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

آپ نے اس تحقیق سے دیکھ لیا کہ یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف و مردود ہی ہے اور اسی بات کو انوار الصحیفہ میں اختصار پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل الفاظ کے ساتھ لکھا گیا ہے: " **غطیف: ضعیف** (تق: ٥٣٦٤) **و للحدیث شاهد موقوف عند الطبري في تفسیره** (١٠/ ٨١) **و سنده ضعیف منقطع** " (ص ۲۸۱)

اگر کوئی کہے کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے احبار ورہبان کو اس طرح سے رب بنا لیا کہ اللہ کی نافرمانی میں ان کی اطاعت کی، جسے احبار ورہبان نے حلال قرار دیا تو اسے حلال سمجھا اور جسے انھوں نے حرام قرار دیا تو اسے حرام سمجھا، چاہے یہ تحلیل وتحریم وحی الٰہی اور آثارِ انبیاء کے سراسر خلاف تھی۔ (دیکھئے تفسیر ابن جریر ۵/ ۸۶۳، اور تفسیر بغوی ۲/ ۲۸۵ وغیرہما)

ضعیف روایات کو خوامخواہ جمع تفریق کر کے حسن لغیرہ قرار دینا متقدمین محدثین سے ہرگز ثابت نہیں اور نہ متاخرین کا اس (ضعیف + ضعیف) پر کلیتاً عمل ہے۔

اپنی مرضی کی روایات کو حسن لغیرہ بنا دینا اور مخالفین کی کئی سندوں والی روایات کو ضعیف، شاذ اور منکر قرار دے کر رد کر دینا دوغلی پالیسی کے سوا کچھ نہیں۔ (۱۶/ مئی ۲۰۱۳ء)

گناہ کا ارادہ اور عمل

سوال اگر کوئی بندہ کسی بھی گناہ کے کام کا پکا ارادہ کرتا ہے، لیکن وہ عملی طور پر گناہ کا کام نہیں کر سکتا یا کرنے کا موقع نہیں ملتا تو کیا ایسے شخص کا گناہ اللہ کے ہاں لکھا جائے

گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (محمد فیاض دامانوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے نبی ﷺ سے اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے بیان کیا:

پس جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس نیکی پر عمل نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں ایک پوری نیکی (کا ثواب) لکھ دیتا ہے اور اگر وہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں دس سے لے کر سات سو گنا یا اس سے زیادہ نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

اور جو شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے، لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے، پھر اگر وہ اس بُرائی پر عمل کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک بُرائی لکھ دی جاتی ہے۔ (صحیح بخاری: ۶۴۹۱، صحیح مسلم: ۱۳۱)

اس صحیح متفق علیہ حدیثِ قدسی سے ثابت ہوا کہ سوال مذکور میں اس شخص کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ درج نہیں ہوتا اور یاد رہے کہ بُرائی کے ارادوں سے بھی بچنا ضروری ہے، تاکہ آدمی اس بُرائی میں کہیں مبتلا نہ ہو جائے۔

اگر کسی شخص کے دل و دماغ میں بُرائی کا ارادہ آ جائے یا شیطانی وسوسے جنم لیں تو اسے فوراً توبہ و استغفار کرنا چاہئے اور درج ذیل آیت پڑھنی چاہئے۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (الحدید: ۳)

(دیکھئے سنن ابی داود: ۵۱۱۰ وسندہ حسن)

[۹/ فروری ۲۰۱۲ء]

نماز سے متعلق مسائل

حالتِ سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیاں ملانا؟

سوال حالتِ سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملا کر رکھنا چاہیے یا نارمل ہی رہنے دیا جائے؟ (ایک سائل)

الجواب ایک حدیث میں آیا ہے کہ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''أن النبي ﷺ كان إذا سجد ضمّ أصابعه. ''نبی ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنی انگلیاں ملا لیتے تھے۔ (صحیح ابن خزیمہ: ۶۴۲، صحیح ابن حبان، الاحسان: ۱۹۱۷، دوسرا نسخہ: ۱۹۲۰، المستدرک للحاکم ۱/۲۲۷ ح ۸۲۶ وقال: ''صحیح علی شرط مسلم'' ووافقہ الذہبی فی تلخیصہ، السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۱۱۲، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۲/۱۹ ح ۲۶ وقال الہیثمی فی مجمع الزوائد ۲/۱۳۵: ''إسناده حسن'' سنن الدارقطنی ۱/۳۳۹ ح ۱۲۶۸، البدر المنیر لابن الملقن ۳/۶۶۸ وقال: ''هذا الحديث صحيح''، الاوسط لابن المنذر ۳/۱۶۹، اصل صفة الصلوة علی النبي ﷺ للالباني ۲/۷۲۶۔۷۲۲ وقال: ''هو إسناد حسن'')

اگرچہ بہت سے علماء نے اسے صحیح یا حسن کہا ہے لیکن ہشیم بن بشیر الواسطی مدلس تھے اور یہ روایت عن سے ہے، ہمارے علم کے مطابق اس روایت کی کسی سند میں سماع کی تصریح نہیں، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ دیکھئے بلوغ المرام (۲۳۷ بتحقیقی)

اگر کوئی (مثلاً شیخ عبدالرحمٰن عزیز یا محمد اشتیاق اصغر) کہے کہ آپ نے تسہیل الوصول إلیٰ تخریج صلوٰۃ الرسول (طبع اول ص ۲۶۷، طبع ۲۰۰۵ء ص ۲۱۴) میں اس روایت کو صحیح لکھا ہے اور نمازِ نبوی (ص ۱۸۰) میں اس سے استدلال کیا ہے۔ (دیکھئے عبدالرحمٰن عزیز کی کتاب صحیح نمازِ نبوی ص ۱۸۱)

تو عرض ہے کہ راقم الحروف نے بار بار اعلان کیا ہے کہ میری صرف وہی کتاب معتبر ہے، جسے مکتبۃ الحدیث حضرو یا مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد/ لاہور سے شائع کیا گیا ہے یا اُس کتاب کے آخر میں میرے دستخط ہیں۔ مثلاً دیکھئے مقدمۃ القول المتین فی الجہر بالتامین (ص ۱۲، دوسرا نسخہ ص ۱۹، نوشتہ ۲۲/ دسمبر ۲۰۰۳ء) اور ماہنامہ الحدیث حضرو: ۲۷ ص ۶۰

(نوشتہ ۱۵/ جون ۲۰۰۶ء)

اس واضح اعلان کے بعد بعض الناس کا راقم الحروف کے خلاف نماز نبوی نامی کتاب یا صلوٰۃ الرسول کی تخریج کے حوالے پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

ہر صاحبِ انصاف کے نزدیک معقول عذر مقبول ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرے دستخطوں کے بغیر بھی ''نماز نبوی صحیح احادیث کی روشنی میں۔ تصحیح وتخریج سے مزین جدید ایڈیشن'' مطبوعہ دارالسلام میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔ (دیکھئے ص ۲۲۴ تا ۲۲۶)

امام ہشیم کی روایتِ مذکورہ کی تحقیق کے بعد عرض ہے کہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں آیا ہے: ''كان النبي صلی اللہ علیہ وسلم ... و إذا سجد وجه أصابعه قبل القبلة'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو اپنی انگلیوں کا رخ قبلے کی طرف کرتے۔ (نصب الرایہ ۳۷۴/۱، السنن الکبری للبیہقی ۱۱۳/۲، اصل صفۃ الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم للالبانی ۶۳۹/۲ وقال: وسندہ صحیح کما فی الدرایہ [۷۹ |])

اس روایت کی سند صحیح نہیں بلکہ دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: ابواسحاق السبیعی مدلس تھے اور روایت عن سے ہے۔ (دیکھئے طبقات المدلسین: ۳/۹۱)

دوم: زکریا بن ابی زائدہ مدلس تھے اور روایت عن سے ہے۔ (دیکھئے الفتح المبین ص ۳۸)

اس کا ایک ضعیف شاہد کتاب الاوسط لابن المنذر (۱۶۹/۳، فیہ حارثہ بن محمد وھو ضعیف) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۲۶۴/۱ ح ۲۷۱۲) وغیرہما میں بھی موجود ہے۔

جو لوگ حسن لغیرہ کو حجت بنائے بیٹھے ہیں، اُن کی شرط پر یہ تین ضعیف روایتیں ایک دوسرے سے مل کر حسن لغیرہ بن جاتی ہیں۔!

اسی ضعیف روایت پر اگر عمل کیا جائے، ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو اگر قبلہ رُخ کیا جائے تو تقریباً ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور علیحدہ کرنے کی صورت میں اُن کا رخ قبلے سے پھر سکتا ہے۔

امام محمد بن سیرین (ثقہ تابعی) نے فرمایا: لوگ یہ پسند کرتے تھے کہ سجدے میں ہاتھوں کی انگلیاں ملائی جائیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۲۶۰ ح ۲۶۷۱ وسندہ صحیح)

امام حفص بن عاصم (ثقہ تابعی) نے عبدالرحمٰن بن القاسم (ثقہ تبع تابعی) سے فرمایا: اے بھتیجے! سجدے میں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر انھیں قبلہ رُخ کر دے کیونکہ چہرے کے ساتھ ہاتھ (بھی) سجدہ کرتے ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۲۶۰ ح ۲۶۷۳ وسندہ صحیح)

امام سفیان ثوری سجدے میں انگلیاں ملاتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ ۱/۲۶۰ ح ۲۶۷۴ وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنی ہتھیلیوں کو سجدے میں قبلہ رُخ کرنے کے قائل تھے۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۲۶۴ ح ۲۷۱۳ وسندہ صحیح، ۲۷۱۸، ۲۷۱۹ وسندہ صحیح)

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ سجدے میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر قبلہ رخ رکھنا صحیح وراجح ہے۔ واللہ اعلم (۸/نومبر ۲۰۰۹ء)

پانچ فرض نمازوں کی رکعتیں اور سنن ونوافل

سوال محترم حافظ صاحب! ایک دیوبندی ''بھائی'' نے ہم سے یہ سوال کیا ہے کہ آپ ہمیں نماز پنجگانہ کی رکعات کی تعداد احادیث صحیحہ سے دلیل کے ساتھ بتادیں تو ہم مان جاتے ہیں کہ مسلک اہلحدیث صحیح مسلک ہے جبکہ ہمارے پاس فقہ حنفی میں نماز پنجگانہ کی رکعات کی تعداد موجود ہے۔ اور ہمارے امام ابوحنیفہؒ کی کاوشوں سے ہی ان رکعات کی تعداد علم میں آئی ہے اور پڑھی جاتی ہیں۔ (جن میں عشاء کی ۱۷ رکعات بھی شامل ہیں)

چنانچہ گزارش ہے کہ آپ صحیح حدیث کی روشنی میں مکمل تفصیل اور تخریج کے ساتھ یہ مسئلہ لکھ دیں۔ براہ کرم لکھتے وقت صرف حدیث نمبر نہ لکھیں بلکہ مکمل تخریج کے ساتھ لکھیں۔

نیز نفلی رکعات کی تعداد بھی لکھ دیں۔ (خالد اقبال سوھدروی، وزیر آباد)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((فأَخبِرهُم أَنَّ اللّٰهَ فرض عليهم خمسَ صلواتٍ في يومهم و ليلتهم .))

''پھر اُنھیں بتادو: بے شک اللہ نے اُن پر اُن کے دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔'' (صحیح بخاری ج۲ص ۱۰۹۶، کتاب التوحید باب نمبر۱، ح ۷۳۷۲، صحیح مسلم ج۱ص ۳۷ ح ۱۹، ترقیم دارالسلام: ۱۲۱، کتاب الایمان باب الدعاء الی الشھادتین وشرائع الاسلام)

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: '' **كان أول ما افترض على رسول الله ﷺ الصلوٰة ركعتان ركعتان إلا المغرب فإنها كانت ثلاثًا . ثمّ أتمّ الله الظهر والعصر والعشاء الآخرة أربعًا في الحضر ، و أقرّ الصلوٰة على فرضها الأول في السفر .** '' رسول اللہ ﷺ پر پہلے جو نماز فرض ہوئی وہ دو دو رکعتیں تھیں سوائے مغرب کے، پس بے شک وہ تین (رکعتیں) تھیں۔ پھر اللہ نے ظہر، عصر اور عشاء کو حضر (یعنی اپنے علاقے) میں چار رکعتیں پورا کر دیا اور سفر میں نماز اپنے پہلے فرض پر ہی مقرر رہی۔ (مسند احمد ج۶ص ۲۷۲ ح ۲۶۳۳۸ وسندہ حسن لذاتہ)

اس حدیث سے درج ذیل باتیں ثابت ہیں:

۱: نمازِ فجر دو رکعت فرض ہے۔

۲: نمازِ ظہر اپنے علاقے میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں فرض ہے۔

۳: نمازِ عصر اپنے علاقے میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں فرض ہے۔

۴: نمازِ مغرب تین رکعتیں فرض ہے۔

۵: نمازِ عشاء اپنے علاقے میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں فرض ہے۔

دیوبندی نے نمازِ پنجگانہ کی رکعات کا جو مطالبہ کیا، وہ اس حدیث سے ثابت ہو گیا اور یاد رہے کہ ان رکعاتِ مذکورہ پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ دیکھئے مراتب الاجماع لابن حزم (ص ۲۴۔ ۲۵) اور میری کتاب توضیح الاحکام (ج۱ص ۴۰۸)

دیوبندی کا یہ کہنا '' ہمارے پاس فقہ حنفی میں نماز پنجگانہ کی رکعات کی تعداد موجود ہیں۔'' غلط ہے، کیونکہ فقہ حنفی تو امام ابوحنیفہ کے اجتہاد کا نام ہے اور حنفیوں کے پاس فقہ میں امام ابوحنیفہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ ابن فرقد شیبانی اور قاضی ابو یوسف دونوں جمہور

محدثین کے نزدیک ضعیف و مجروح تھے اور ان سے بھی یہ دیوبندی دعویٰ ثابت نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ کی وفات کے بہت بعد پیدا ہونے والے قدوری، سرخسی اور ملا مرغینانی وغیرہم کے حوالے فضول ہیں اور انھیں فقہِ حنفی کہنا غلط ہے۔

مذکورہ دیوبندی سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ وہ صحیح سند کے ساتھ امام ابوحنیفہ سے پانچ نمازوں کے فرائض کی تعداد، سنن کی تعداد اور نوافل ثابت کر دیں، اور اگر نہ کر سکیں تو پھر اہلِ حدیث یعنی اہلِ سنت کے خلاف پروپیگنڈا کرنا چھوڑ دیں۔

جب امام ابوحنیفہ پیدا نہیں ہوئے تھے تو لوگ کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟

انھیں کہیں کہ وہ صحیح سند کے ساتھ امام ابوحنیفہ سے عشاء کی ۱۷ رکعات بھی ثابت کریں۔ یہ لوگ امام ابوحنیفہ کا نام لے کر، اُن کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کر کے اہلِ حدیث (اہلِ سنت) کو دھوکا دیتے ہیں۔

سنتوں کی تعداد درج ذیل ہے:

۱: صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۷ ح ۱۱۸۰، ابواب التطوع باب الرکعتین قبل الظہر)

۲: ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں۔ (صحیح بخاری، دیکھئے سابقہ فقرہ نمبر ۱)

ظہر کی نماز کے بعد دو رکعتیں (صحیح بخاری، دیکھئے سابقہ فقرہ نمبر ۱)

ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں بھی ثابت ہیں۔

دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۵۷ ح ۱۱۸۲، ابواب التطوع باب الرکعتین قبل الظہر)

۳: عصر سے پہلے دو رکعتیں۔ (سنن ابی داود: ۱۲۷۲، وسندہ حسن)

عصر سے پہلے چار رکعتوں کی فضیلت بھی ثابت ہے۔ (دیکھئے سنن الترمذی، کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی الأربع قبل العصر ح ۴۳۰ وقال: ''ھذا حدیث حسن غریب'' وسندہ حسن)

۴: مغرب کے بعد دو رکعتیں

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۸ ح ۹۳۷، کتاب الجمعہ باب الصلوٰۃ بعد الجمعۃ وقبلہا)

۵: عشاء کے بعد دو رکعتیں۔ (صحیح بخاری، دیکھئے سابقہ فقرہ نمبر۴)

((إلا أن تطوع)) سوائے اس کے جو تم نفل پڑھو۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۱۲ ح ۴۶ کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام) کی رُو سے (دو دو کر کے) جتنے نوافل پڑھیں جائز ہے۔

دیوبندی کو کہیں کہ ہم نے آپ کے سوال کا جواب صحیح حدیث اور اجماع سے دے دیا ہے، لہٰذا آپ اب مسلک اہلِ حدیث قبول کر لیں۔

اگر وہ مسلکِ حق قبول نہیں کرتے تو پھر اپنے دعوے کے مطابق امام ابوحنیفہ سے صحیح سند کے ساتھ درج ذیل باتیں ثابت کریں:

ا: نمازِ پنجگانہ کے فرائض کی تعداد

۲: سُنن کی تعداد

۳: نوافل

۴: عشاء کی ۱۷ رکعات

یاد رہے کہ بے سند کتابوں مثلاً قدری، مبسوط، ہدایہ اور فتاویٰ شامی وغیرہ کے حوالوں کی کوئی ضرورت نہیں اور ضعیف و مجروح راویوں مثلاً قاضی ابو یوسف اور محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی وغیرہما کا کوئی حوالہ پیش نہ کریں۔

دیوبندیوں اور بریلویوں کا یہ کہنا کہ "ہماری نماز امام ابوحنیفہ سے ثابت ہے" بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔ کیا امام ابوحنیفہ نے کہا تھا کہ اے بریلویو! اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھو اور اے دیوبندیو! تم نہ پڑھو۔

اے بریلویو! تم جنازے کے بعد دعا کرو اور اے دیوبندیو! تم یہ دعا نہ کرو۔

اے دیوبندیو! تم ولا الضالین ظاء کے ساتھ پڑھو اور اے بریلویو! تم ولا الضالین دال کے ساتھ پڑھو۔

اگر صحیح متصل سند ہے تو اسے پیش کرو ورنہ یاد رکھو کہ امام ابوحنیفہ تمھاری ان باتوں سے بری ہیں، لہٰذا خواہ مخواہ اُن کا نام لے کر اہلِ حدیث یعنی اہلِ سنت کو دھوکا نہ دو۔ آخر ایک دن

اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش بھی ہونا ہے، اُس دن کیا جواب دو گے؟!

و ما علینا إلا البلاغ (۳۰/مئی ۲۰۱۰ء)

نمازِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک بیٹھنا، پھر دو رکعتیں پڑھنا

سوال رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " من صلّی الصبح في جماعة ثم قعد یذکر اللّٰہ حتی تطلع الشمس ثم صلّی رکعتین کانت له کأجر حجة وعمرة." "جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، پھر بیٹھ کر سورج طلوع ہونے تک ذکر کرتا رہا، پھر اس نے دو رکعتیں پڑھیں، اس کے لئے حج اور عمرے جتنا اجر (ثواب) ہوگا۔ (صحیح الترغیب: ۴۶۴)

(۲) دوسری حدیث: " من صلّی الصبح ثم جلس في مجلسه حتی تمکنه الصلوة کان بمنزلة عمرة و حجة متقبلتین. "

جس نے صبح کی نماز پڑھی پھر اپنی مجلس میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ نماز پر قابو ہوا (یعنی اس نے نماز پڑھی) وہ قبول شدہ حج اور عمرے کے قائم مقام ہے۔ (صحیح الترغیب: ۴۶۸)

☆ جو آدمی نماز فجر پڑھ کر جس جگہ اس نے نماز پڑھی ہے وہیں بیٹھا رہے، اگر وہ جگہ تبدیل کرے تو کیا اسے یہ ثواب حاصل ہوگا؟ (محمد رمضان سلفی، عارف والا)

الجواب علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الترغیب میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے: " رواه الترمذي وقال : حديث حسن غريب " (ج ۱ ص ۳۱۸)

سنن ترمذی (۵۸۶) میں یہ روایت بحوالہ ابوظلال (ھلال بن ابی ھلال القسملی) عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ بعض اختلافِ الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

ابوظلال کے بارے میں حافظ ہیثمی نے کہا: " و ضعفه الجمهور "

اور جمہور نے اسے ضعیف کہا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۳۸۴)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا: ضعیف. (تقریب التہذیب: ۷۳۴۹)

جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی کو مقارب الحدیث کہنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ایسا راوی ضعیف ہی رہتا ہے، لہٰذا یہ روایت ثابت نہیں، نیز اس کے تمام شواہد ضعیف و مردود ہیں اور جمع تفریق کر کے اسے حسن لغیرہ بنا دینا غلط ہے۔

(۲) یہ روایت الترغیب والترہیب اور صحیح الترغیب میں بحوالہ الاوسط للطبرانی مذکور ہے۔

الاوسط للطبرانی (۲۷۹/۶۔۲۸۰ ح ۵۵۹۸) کے راوی فضل بن موفق کے بارے میں امام ابوحاتم الرازی نے فرمایا: ''ضعیف الحدیث، کان شیخًا صالحًا قرابة لابن عیینة و کان یروي أحادیث موضوعة. ''وہ حدیث میں ضعیف ہے، نیک آدمی تھا، سفیان بن عیینہ کا رشتہ دار تھا، اور وہ موضوع حدیثیں بیان کرتا تھا۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۶۸/۷)

معلوم ہوا کہ یہ روایت موضوع ہے اور اس کا راوی نیک ہونے کے باوجود ضعیف تھا۔ موضوع روایت کو حسن لغیرہ کہہ دینا بہت بڑے دل گردے کا کام ہے۔

فائدہ: امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ موضوع روایت کے لئے راوی کا کذاب ہونا شرط نہیں بلکہ (قرائن کے ساتھ) ضعیف راوی کی روایت بھی موضوع ہوسکتی ہے، بشرطیکہ محدثین کرام اسے موضوع قرار دیں۔

☆ مذکورہ اجر و ثواب والی روایات ضعیف و مردود ہیں، لہٰذا اس سوال کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تنبیہ: شیخ البانی رحمہ اللہ نے السلسلۃ الصحیحہ (۳۴۰۳) میں روایتِ مذکورہ کے دو شاہد ذکر کیے ہیں:

۱: المعجم الکبیر للطبرانی (۲۰۹/۸ ح ۷۷۴۱)

اس میں عثمان بن عبدالرحمٰن بن مسلم الحرانی الطرائفی کا استاد موسیٰ بن عَلی (عین کی زبر کے ساتھ، الخشنی) نامعلوم ہے اور اُس سے موسیٰ بن عُلی بن رباح (عین کی پیش کے ساتھ) مراد لینا بلا دلیل ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

طرائفی مذکور کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ مجہول لوگوں سے منکر روایتیں بیان کرتا تھا۔

دیکھئے الکامل لابن عدی (۱۸۲۰/۵۔۱۸۲۱، دوسرا نسخہ ۲۹۵/۶۔۲۹۸)
خود طرانفی پر سات نے جرح کی ہے اور سات نے توثیق کی ہے۔ واللہ اعلم
خلاصہ یہ کہ یہ سند موسیٰ بن علی (؟) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

۲: المعجم الکبیر للطبرانی (۱۴۷/۸ ح ۷۶۴۹)

اس کی سند میں احوص بن حکیم ہے، جس کے بارے میں حافظ ابن حجر نے فرمایا:
"**ضعیف الحفظ .. و کان عابدًا**" (تقریب التہذیب: ۲۹۰)
حافظ ہیثمی نے فرمایا:" **و ضعفه الجمهور** " اور جمہور نے اسے ضعیف کہا ہے۔
(مجمع الزوائد ج ۳ ص ۴۲)

ان ضعیف روایتوں کے بل بوتے پر شیخ البانی رحمہ اللہ نے روایتِ مذکورہ کو اپنے السلسلۃ الصحیحہ میں ذکر کیا ہے۔ (ج ۷ ص ۱۱۹۵ ح ۳۴۰۳) !!

فائدہ: سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (عام طور پر) جب فجر کی نماز پڑھتے، اپنی جائے نماز پر بیٹھے رہتے حتیٰ کہ سورج اچھی طرح طلوع ہو جاتا تھا۔
(صحیح مسلم: ۶۷۰، دارالسلام: ۱۵۲۶، سنن ابی داود: ۱۲۹۴، وسندہ صحیح)

طلوعِ آفتاب کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کا بہت زیادہ ثواب ہے، جیسا کہ صحیح مسلم (۷۲۰، دارالسلام: ۱۶۷۱) کی حدیث سے ثابت ہے۔ والحمدللہ (۸/ اپریل ۲۰۱۰ء)

نمازِ با جماعت کے لئے کس وقت کھڑے ہونا چاہیے؟

سوال مولانا محمد منیر سیالکوٹی صاحب حفظہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "اور اقامت کے وقت مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے بارے میں کوئی وقت مقرر نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے قد قامت الصلوٰۃ کے وقت کھڑے ہونے کی روایت ہے۔ حضرت سعید بن میسّب رحمہ اللہ مؤذن کے اللہ اکبر کہتے ہی کھڑے ہونے کے قائل تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حی علی الفلاح کے الفاظ پر، اور امام مالک رحمہ اللہ لوگوں کی طاقت پر چھوڑتے ہیں کہ جو جب

اُٹھ سکے۔ اُٹھ جائے۔ کیونکہ ان میں کوئی ضعیف ہوگا۔ اور کوئی ثقیل۔ اور کھڑے ہونے کا وقت بھی مقرر نہیں ہے۔ حنابلہ قد قامت الصلوٰۃ کے وقت اور شافعیہ ختم ہونے پر کھڑے ہونے کے قائل ہیں۔ (فتح الباری ۲/۱۲۰، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۱/۳۲۵)

اور بظاہر امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہی اقرب الی السنۃ ہے۔'' (فقہ الصلوٰۃ ج ۲ ص ۱۷۹)

آپ براہِ کرم راجح بات واضح فرمائیں کہ نمازی (مقتدی) اقامت سے قبل کھڑے ہوں (صف بندی کے لئے) یا اقامت کے بعد؟ (محمد صدیق تلیاں، سمندر کٹھ ایبٹ آباد)

الجواب سوال میں مذکورہ روایات کی تحقیق علی الترتیب درج ذیل ہے:

۱: حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب اثر امام ابن المنذر وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ۲/۱۲۰ تحت ح ۶۳۷)

امام ابن المنذر کی کتاب: الاوسط میں یہ اثر درج ذیل سند و متن کے ساتھ موجود ہے:

'' وحدثونا عن الحسن بن عيسى قال :أخبرنا ابن المبارك قال: أخبرنا أبو يعلى قال: رأيت أنس بن مالك ، إذا قيل : قد قامت الصلاة و ثب فقام . ''

(۴/۱۶۶ ث ۱۹۵۸، دوسرا نسخہ ۴/۱۸۷ ح ۱۹۴۷)

اس روایت میں '' و حدثونا '' کے قائلین نامعلوم ہیں، لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

اور ''وغیرہ'' کا قائل معلوم نہیں، السنن الکبریٰ (۲/۲۱) میں یہ اثر بے سند ہے، لیکن حافظ ابن عبدالبر نے اسے اپنی سند کے ساتھ ابوبکر الاثرم کی کتاب سے ''و حدثنا عثمان بن أبي شيبة قال: حدثنا ابن المبارك عن أبي يعلى قال: رأيت أنس ابن مالك إذا قيل : قد قامت الصلوٰة ، قام فوثب '' کی سند و متن سے روایت کیا ہے۔

(التمہید ج ۹ ص ۱۹۳، دوسرا نسخہ ج ۳ ص ۱۰۲)

اثرم تک ابن عبدالبر کی سند میں نظر ہے اور اگر یہ امام ابن المبارک سے ثابت ہو جائے تو عرض ہے کہ اس کا راوی ابو یعلیٰ سلمہ بن وردان اللیثی المدنی ضعیف ہے۔

(دیکھئے تقریب التہذیب: ۲۵۱۴)

مختصر یہ کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ روایت ضعیف ہے۔

۲: امام سعید بن المسیب بن حزن رحمہ اللہ والی روایت تمہید (لابن عبدالبر) میں ہے۔

(ج ۹ ص ۱۹۳، دوسرا نسخہ ۳/۱۰۲)

اس کی سند کئی وجہ سے ضعیف ہے، مثلاً کلثوم بن زیاد المحاربی قاضی دمشق جمہور کے نزدیک ضعیف ہے۔ (دیکھئے لسان المیزان بحاشیتی ۴/۴۸۹، دوسرا نسخہ ۵/۵۵۷)

۳: امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب قول اُن سے ثابت نہیں ہے اور غیر ثابت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا راوی ابن فرقد (صاحبِ کتاب الاصل ۱/۱۸۔۱۹) بذاتِ خود جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف و مجروح ہے۔

۴: امام مالک رحمہ اللہ کا قول ان کی مشہور کتاب موطأ امام مالک (روایۃ یحییٰ ۱/۷۱، روایۃ ابی مصعب زہری: ۱۸۶) میں موجود ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: ''و ذهب الأكثرون إلى أنهم إذا كان الإمام معهم في المسجد لم يقوموا حتى تفرغ الإقامة'' اکثر کا یہ مذہب ہے کہ اگر امام مسجد میں موجود ہو تو لوگ اقامت ختم ہونے سے پہلے کھڑے نہ ہوں۔ (فتح الباری ۲/۱۲۰)

امام ترمذی نے فرمایا: ''و قال بعضهم إذا كان الإمام في المسجد فأقيمت الصلوة فإنما يقومون إذا قال المؤذن: قد قامت الصلاة، وهو قول ابن المبارك'' اور بعض نے کہا: جب امام مسجد میں ہو اور نماز کی اقامت ہو جائے تو لوگ اس وقت کھڑے ہوں گے جب اقامت کہنے والا قد قامت الصلوٰۃ کہے اور یہی قول عبداللہ بن المبارک کا ہے۔ (سنن الترمذی: ۵۹۲)

امام ترمذی نے عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کے جو اقوال سنن ترمذی میں نقل کئے ہیں، ان کی صحیح سندیں اپنی کتاب العلل (الصغیر) میں ذکر کر دی ہیں۔

(دیکھئے ص ۱، دوسرا نسخہ ص ۸۸۹ مطبوعہ دارالسلام مع سنن الترمذی)

امام احمد بن حنبل نے فرمایا: اگر امام مسجد میں ہو تو لوگ اس وقت کھڑے ہوں جب وہ

(اقامت کہنے والا) قد قامت الصلوۃ کہے۔ امام اسحاق بن راہویہ نے اس کی مکمل تائید فرمائی ہے۔ (مسائل احمد واسحاق، روایۃ اسحاق بن منصور الکوسج ۱/۱۲۷۔ ۱۲۸ فقرہ:۱۷۹)

امام ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری رحمہ اللہ نے فرمایا: " إن كان الإمام معهم في المسجد قاموا إذا قام و إن كانوا ينتظرون خروجه و مجيئه قاموا إذا رأوه ولا يقوموا حتى يروه (لحديث) أبي قتادة ... " اگر امام مسجد میں ان کے ساتھ ہو تو جب وہ کھڑا ہو لوگ کھڑے ہو جائیں اور اگر وہ امام کے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو جب اسے دیکھیں کھڑے ہو جائیں اور اگر اسے نہ دیکھیں تو کھڑے نہ ہوں، اس کی دلیل (سیدنا) ابوقتادہ (رضی اللہ عنہ) کی حدیث سے ہے... (الاوسط نسخہ جدیدہ ج ۴ ص ۱۸۸)

ان آثار کو مد نظر رکھتے ہوئے عرض ہے کہ جب اقامت کہی جائے یعنی قد قامت الصلوۃ کے الفاظ پڑھے جائیں تو لوگ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جائیں، اور اگر امام یا اقامت کہنے والے کے ساتھ ہی کھڑے ہو جائیں (بشرطیکہ امام مسجد میں موجود ہو) تو یہ بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم (۱۵/ نومبر ۲۰۱۰ء)

بے وضو پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ ضروری ہے

سوال غسل فرض تھا مگر بھول کر چند نمازیں بغیر غسل کے صرف وضو کر کے پڑھ لی جائیں تو کیا یاد آنے پر ان نمازوں کو دہرایا جائے گا یا صرف استغفار کر لیا جائے؟

(اعجاز احمد، گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

الجواب اس مسئلے میں کوئی صریح حدیث مجھے معلوم نہیں۔

امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے فرمایا: "ثنا عبد الله بن عمر عن نافع أن ابن عمر صلّى بأصحابه ثم ذكر أنه مسح ذكره فتوضأ ولم يأمرهم أن يعيدوا ،قال ابن مهدي قلت لسفيان :علمت أن أحدًا قال:يعيدون؟ قال :لا إلا حماد" ہمیں عبداللہ بن عمر (بن حفص بن عاصم العمری) نے نافع سے حدیث بیان کی کہ ابن عمر

(رضی اللہ عنہ) نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی، پھر انھیں یاد آیا کہ ہاتھ آلۂ تناسل (شرمگاہ) کو لگ گیا تھا، لہٰذا انھوں نے وضو کیا اور لوگوں کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔

عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا: میں نے سفیان (ثوری) سے پوچھا: کیا آپ کے علم میں ہے کہ کسی نے یہ کہا ہو: لوگ نماز دوبارہ پڑھیں گے؟ انھوں نے فرمایا: حماد (بن ابی سلیمان) کے علاوہ کوئی نہیں۔ (سنن دارقطنی ۱/ ۳۶۵ ح ۱۳۵۹، وسندہ حسن)

اس روایت میں عبداللہ العمری نیک، صدوق اور جمہور کے نزدیک مضعف ہونے کی وجہ سے ضعیف راوی ہیں، لیکن خاص نافع سے اُن کی روایت حسن ہوتی ہے۔

امام عثمان بن سعید الدارمی نے امام یحییٰ بن معین سے پوچھا: نافع سے ان کی روایت کس طرح ہے؟ انھوں نے فرمایا: ''صالح'' اچھی ہے۔

(تاریخ عثمان بن سعید الدارمی: ۵۲۳، تاریخ بغداد ۱۰/ ۲۰ ت ۵۱۳۵)

امام ترمذی نے العمری عن نافع والی روایت کو ''هذا حديث حسن'' کہا۔ (ح ۸۵۴)

امام مسلم نے العمری عن نافع کی سند سے ایک حدیث بیان کی۔ (صحیح مسلم: ۲۱۳۲)

امام بخاری اور امام ابن خزیمہ نے العمری عن نافع کی روایت میں شک کا اظہار کیا۔

(دیکھئے جزء رفع الیدین: ۸۳، صحیح ابن خزیمہ قبل ح ۱۴۳۱، ۱۸۶۰)

جمہور کی خاص توثیق کی وجہ سے عبداللہ العمری نافع سے روایت میں حسن الحدیث ہیں، لہٰذا یہ سند حسن ہے۔ امام عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۸ھ) نے فرمایا:

''وهو هذا المجتمع عليه ،الجنب يعيد و لا يعيدون ،ماأعلم فيه اختلافاً ''

اور اس بات پر اجماع ہے کہ جُنبی (حالتِ جنابت میں پڑھی ہوئی نماز) دوبارہ پڑھے گا اور وہ (اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے) اپنی نمازیں نہیں دھرائیں گے، مجھے اس بارے میں کسی اختلاف کا کوئی علم نہیں ہے۔ (سنن دارقطنی ۱/ ۳۶۵ ح ۱۳۵۷، وسندہ صحیح)

یہاں اجماع سے مراد صحابۂ کرام کا اجماع ہے، جس کی مخالفت حماد بن ابی سلیمان (تابعی صغیر وصدوق حسن الحدیث) کے سوا کسی سے ثابت نہیں۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/ ۴۰۱)

البتہ بعد میں سفیان ثوری (تبع تابعی) نے بھی وہی موقف اختیار کرلیا جو حماد کا تھا۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۴۵ ح ۴۵۷۷ وسندہ حسن)

خلاصہ یہ کہ اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے بے وضو نماز یا نمازیں پڑھ لے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ یہ نمازیں دوبارہ پڑھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر غلطی سے بے وضو نماز پڑھنے والا امام ہو تو مقتدیوں کا کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی نمازیں دوبارہ پڑھیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جمہور سلف صالحین کے فہم کی روشنی میں مقتدیوں کی نماز ہوگئی، انھیں یہ نمازیں دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔☆

بعض علماء نے اس مسئلے پر سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

(دیکھئے المحلیٰ لابن حزم ۴/ ۲۱۶ مسئلہ ۴۸۹)

[۴/ اپریل ۲۰۱۱ء]

جمع بین الصلاتین اور سنتیں؟

سوال اگر اشد مجبوری و شرعی عذر کی وجہ سے سفر کے علاوہ (حضر) کی حالت میں دو نمازیں جمع کرنی پڑیں تو کیا دونوں نمازوں کی سنتیں ادا کرنا ہوں گی؟ (ایک سائلہ)

الجواب ایسی حالت میں صرف فرض پڑھنے پڑیں گے اور سنتیں ادا نہیں ہوں گی۔ (دلیل کے لئے دیکھئے صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب تاخیر الظہر الی العصر ح ۵۴۳)

[۸/ جون ۲۰۱۱ء]

☆ سیدنا شرید الثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حالت جنابت میں نماز پڑھادی، پھر انھوں نے (خود) نماز دہرائی لیکن ان (مقتدیوں) کو نماز دہرانے کا حکم نہیں دیا۔ (السنن الکبریٰ ۲/ ۳۹۹، ۴۰۰، سنن الدارقطنی ۱/ ۳۶۴ ح ۱۳۵۶ وسندہ حسن)

المغنی لابن قدامہ (۲/ ۹۹، ۱۰۰) میں مذکور ہے: ''اگر امام بے وضو یا جنبی حالت میں جماعت کرادے، جبکہ وہ اس سے لاعلم ہو اور مقتدی بھی اس کی اس کیفیت سے آگاہ نہ ہوں تو ان کی نماز صحیح ہے اور امام کی نماز باطل ہے۔ اجماع صحابہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔'' (ندیم ظہیر)

نمازِ تراویح کے بعض مسائل اور طریقۂ وتر

سوال انگلینڈ کی اہلِ حدیث مساجد میں رمضان المبارک میں یہ معمول ہے کہ

۱: بعض لوگ امام کے ساتھ تراویح کی نماز ادا کرتے ہیں اور وتر چھوڑ دیتے ہیں۔

۲: اور بعض لوگ امام کے ساتھ وتر ادا کر کے امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت علیحدہ سے ادا کرتے ہیں۔

۳: اور بعض لوگ امام کے ساتھ صرف فرض ادا کرتے ہیں اور یہ لوگ رات کے آخری حصے میں چار رکعت یا آٹھ رکعت امام کے ساتھ ادا کر کے آخر میں وتر پڑھتے ہیں اور یہ نماز باقی نمازوں کی نسبت قدرے لمبی ہوتی ہے اور اس نماز کو یہ لوگ قیام کا نام دیتے ہیں۔

آیا یہ قیام کا طریقہ نبی ﷺ کے زمانے میں تھا؟

کیا یہ جائز، ناجائز بات ہے یا افضل، غیر افضل کا مسئلہ ہے؟

بعض لوگ اس کے جائز ہونے کے لئے سعودی علماء اور (انگلینڈ کے) مقامی علماء کے حوالے دیتے ہیں۔ براہِ مہربانی اس مسئلہ کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں مع حوالہ جات تحریر فرمائیں اور اس کے علاوہ تین رکعت وتر پڑھنے کا صحیح طریقہ بھی بیان فرمادیں۔

(محمد فیاض دامانوی، بریڈفورڈ، انگلینڈ)

الجواب آپ کے سوال کی تینوں شقوں کا جواب درج ذیل ہے:

۱: ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِجْعَلُوْا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا.))

"رات کو اپنی آخری نماز وتر بناؤ۔"

(صحیح بخاری، کتاب الوتر باب لیجعل آخر صلاتہ وتراً ح ۹۹۸)

اس مفہوم کی مؤید دوسری روایات بھی ہیں اور غالباً یہ لوگ ان سے استدلال کرتے ہیں، یعنی رات کے بالکل آخری حصے میں اذانِ فجر سے پہلے یہ نمازِ وتر پڑھتے ہوں گے۔ واللہ اعلم

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے: ''جس شخص کو یہ ڈر ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں سو یا رہ جائے گا تو وہ شروع میں ہی وتر پڑھ لے اور جسے یہ امید ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں اٹھ جائے گا تو اسے آخری حصے میں وتر پڑھنا چاہیے اور رات کی آخری نماز میں (فرشتوں کی) حاضری ہوتی ہے اور یہ افضل ہے۔'' (ح ۷۵۵، ترقیم دارالسلام: ۱۷۶۶)

ایک ہی رات میں وتر پر وتر پڑھنے کو نقضِ وتر کا مسئلہ کہا جاتا ہے، یعنی یہ لوگ دوبارہ وتر پڑھتے ہیں اور اپنے خیال میں اس عمل سے پہلے وتر کو توڑ دیتے ہیں اور ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ رات کے آخری حصے میں (تیسری بار) وتر پڑھتے ہوں گے۔ واللہ اعلم

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اگر ایک وتر پڑھ لیتے اور پھر قیامِ لیل کرنا چاہتے تو دوبارہ ایک وتر پڑھ کر سابقہ وتر کو جفت بنا دیتے، پھر قیامِ لیل فرماتے اور آخر میں (تیسری مرتبہ) وتر پڑھتے تھے۔

(مثلاً دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۲۸۲ ح ۶۷۲۶ وسندہ صحیح، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/ ۳۶ ح ۴۸۲۵ وسندہ حسن)

نیز اس مسئلے پر سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل واجتہاد بھی تھا۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۲۸۴ ح ۶۷۲۵ وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے نقضِ وتر کے بارے میں فرمایا: میں یہ کام، اپنی رائے سے کرتا ہوں، میں اسے کسی سے روایت نہیں کرتا۔ (مسند علی بن الجعد: ۴۳۷ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ: ۴۵۰)

یہی مسئلہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔

(دیکھئے الاوسط لابن المنذر ۵/ ۱۹۷ ح ۲۶۷۱ وسندہ حسن ۵/ ۱۹۶ ح ۲۶۶۷ وسندہ حسن)

یہ مسئلہ امام عروہ بن الزبیر اور امام مکحول وغیرہما رحمہم اللہ سے بھی ثابت ہے۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۲۸۲ ح ۶۷۲۹، ۶۷۳۲)

لیکن ان آثار کے مقابلے میں صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا وتران في ليلة .)) ایک رات میں دو دفعہ وتر نہیں۔ (سنن ابی داود: ۱۴۳۹، وسندہ صحیح)

اس حدیث کے راوی سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ بھی صرف ایک دفعہ وتر پڑھنے کے قائل تھے۔

(دیکھئے سنن ابی داود: ۱۴۳۹، وحسنہ الترمذی: ۴۷۰ وصححہ ابن خزیمہ: ۱۱۰۱، وابن حبان: ۶۷۱)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے (ایک قول میں) فرمایا: جب تم پہلی رات میں وتر پڑھ لو تو آخری حصہ میں (دوبارہ) وتر نہ پڑھو۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۸۴ ح ۶۷۴۴ وسندہ حسن)

امام شعبی رحمہ اللہ نقضِ وتر کے قائل نہیں تھے۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۸۵ ح ۶۷۴۴ وسندہ صحیح)

امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے فرمایا: "ولا ینقض وترہ" اور نقضِ وتر نہیں کرنا چاہیے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۳۶ وسندہ حسن)

خلاصۃ التحقیق: اس مسئلے میں راجح بات یہ ہے کہ ایک دفعہ وتر پڑھ لینے کے بعد دوبارہ وتر نہ پڑھا جائے اور اگر کوئی شخص وتر پڑھنے کے بعد بھی آخری رات میں نفل نماز پڑھنا چاہتا ہے تو صرف دو رکعتیں پڑھ لے اور بہتر یہ ہے کہ یہ دو رکعتیں بھی نہ پڑھے بلکہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ اگر کوئی شخص وتر کے بعد بھی نوافل پڑھنا چاہتا ہے تو یہ حرام نہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ صحیح حدیث پر عمل کرتے ہوئے رات کی آخری نماز صرف وتر کو بنایا جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ سیدنا ابو ذر الغفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (رمضان کے) روزے رکھے، پھر آپ نے ہمیں (تراویح کی) نماز نہیں پڑھائی حتی کہ جب (رمضان کے) مہینے کی سات راتیں رہ گئیں تو آپ نے ہمیں ایک تہائی رات تک (قیامِ رمضان کی) نماز پڑھائی، پھر چھٹی رات کوئی قیام نہیں فرمایا اور پانچویں رات آدھی رات تک قیام فرمایا۔ پس ہم نے آپ سے کہا:

یا رسول اللہ! اگر آپ آج کی باقی رات بھی ہمیں نماز پڑھا دیتے تو؟

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ((إنّه من قام مع الإمام حتی ینصرف کتب له قیام لیلة.)) "جس شخص نے امام کے ساتھ قیام کیا حتی کہ وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو اس شخص کے لیے ساری رات کا قیام (یعنی ثواب) لکھا جاتا ہے۔"

(سنن ترمذی: ۸۰٦ وقال: ''حسن صحیح'' وسندہ صحیح)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ امام کے ساتھ (مکمل) تراویح (مع وتر) پڑھنے والے کو ساری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تراویح کی انفرادی نماز سے، امام کے ساتھ نماز تراویح پڑھنا افضل ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا:

''میں اسے پسند کرتا ہوں کہ امام کے ساتھ نماز (تراویح) اور وتر پڑھے جائیں۔''

پھر انھوں نے حدیث مذکور (ہی) سے استدلال کیا۔ (مسائل ابی داود ص ٦٢ باب التراویح)

اور اسی پر امام احمد بن حنبل کا عمل تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ.

ثابت ہوا کہ مذکور لوگوں کا عمل مرجوح ہے۔ واللہ اعلم

۲: اسے نقض الوتر کہا جاتا ہے اور اس کا مفصل ذکر جواب کی شق نمبر ا کے تحت گزر چکا ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ عمل مرجوح ہے اور بہتر وہی ہے جو میں نے نمبر ا کے تحت بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم

۳: یہ عمل صراحت کے ساتھ نبی ﷺ سے ثابت نہیں، لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو پیش نظر رکھ کر یہ اجتہاد کرتے ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول صحیح بخاری میں موجود ہے۔

(کتاب صلوۃ التراویح باب فضل من قام رمضان ح ۲۰۱۰)

سنن ترمذی وغیرہ کی مرفوع صحیح حدیث (جسے شق نمبر ا کے تحت بیان کر دیا گیا ہے) سے یہی ظاہر ہے کہ اول شب ہی امام کے ساتھ مکمل قیام مع وتر کر لیا جائے اور یہی افضل، بہتر و راجح ہے۔

یہ اختلاف جائز ناجائز کا اختلاف نہیں بلکہ افضل و غیر افضل کا اور راجح و مرجوح کا اختلاف ہے جس میں ہر صحیح العقیدہ فریق کو حسبِ اجتہاد ثواب ملے گا۔ ان شاء اللہ

سعودی عرب (یعنی جزیرۃ العرب) کے علماء ہوں یا مقامی و غیر مقامی علماء ہوں، سب کو چاہیے کہ سلف صالحین کے فہم کی روشنی میں قرآن و حدیث اور اجماع سے استدلال کریں اور فریقِ مخالف کو بھی اپنی دلیل بیان کرنے اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا موقع دیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یا أیها الناس! ألا إنّ ربکم واحد وإنّ أبا کم واحد، ألا لا فضل لعربي علی عجمي ولا لعجمي علی عربي ولا أحمر علی أسود ولا أسود علی أحمر إلا بالتقویٰ.))

"اے (ساری دنیا کے) لوگو! سن لو کہ یقیناً تمھارا رب ایک ہے اور یقیناً تمھارا باپ ایک ہے۔ (یعنی سیدنا آدم علیہ السلام)

سن لو! کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے۔ کسی سرخ کو کسی کالے پر فضیلت نہیں اور نہ کسی کالے کو کسی سرخ پر فضیلت ہے، سوائے تقویٰ کے ذریعے سے۔" (مسند احمد ۵/ ۴۱۱ ح ۲۳۴۸۹ وسندہ صحیح)

فضیلت تو ایمان، اعمال صالحہ، علم اور تقویٰ میں ہے۔

[تین رکعت وتر پڑھنے کا صحیح طریقہ]

اب تین رکعت وتر پڑھنے کا صحیح طریقہ پیشِ خدمت ہے:

۱: دو رکعت پڑھ کر (تشہد، درود اور دعا کے بعد) دونوں طرف سلام پھیر دیا جائے اور بعد میں دوسری تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کے ساتھ ایک رکعت وتر پڑھا جائے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (وتر کی) جفت (دو) اور وتر (ایک) رکعت کو سلام کے ساتھ جدا (علیحدہ) کرتے تھے اور یہ سلام ہمیں سناتے تھے۔

(صحیح ابن حبان، الاحسان ۴/ ۷۰ ح ۲۴۲۶ وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ خود بھی اسی طرح وتر پڑھتے تھے۔ (دیکھئے صحیح البخاری: ۹۹۱)

صحیح مسلم کی حدیث: ((یسلّم بین کل رکعتین ویوتر بواحدۃ.))

آپ ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرتے اور (آخر میں) ایک وتر پڑھتے تھے۔ (۲۵۴/۱ ح ۷۳۶) کے عموم سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا جائے اور آخر میں ایک وتر پڑھا جائے۔

تین وتر کا یہ طریقہ سب سے افضل اور راجح ہے۔

۲: اگر دوسری رکعت پر سلام نہ پھیرا جائے اور تین وتر اکٹھے پڑھے جائیں تو یہ عمل بھی جائز ہے، بشرطیکہ دوسری رکعت میں مغرب کی طرح تشہد کے لیے نہ بیٹھا جائے۔

ایک سلام سے تین وتر کے جواز کی دلیل وہ روایت ہے، جس میں آیا ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (خلیفہ راشد) نے ایک سلام سے تین وتر پڑھائے۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ۲۹۳/۱ وسندہ حسن وصححہ النیموی فی آثار السنن: ۶۱۸، نیز دیکھئے میری کتاب: ہدیۃ المسلمین ص ۶۵ ح ۲۷)

مشہور ثقہ تابعی عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تین وتر پڑھتے تو ان میں بیٹھتے نہیں تھے اور صرف آخری رکعت میں تشہد پڑھتے تھے۔

(المستدرک للحاکم ۳۰۵/۱ وسندہ حسن واخطأ النیموی فضعفہ!، المستدرک المخطوط ج ۱ ص ۱۴۵ ب)

المستدرک علی الصحیحین کے مؤلف ابو عبداللہ الحاکم النیسابوری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ما أخبرناه أبو نصر أحمد بن سهل الفقيه ببخارا :ثنا صالح بن محمد ابن حبيب الحافظ :أنبأ شيبان بن أبي شيبة :ثنا أبان عن قتادة عن زرارة بن أوفى عن سعد بن هشام عن عائشة قالت :كان النبي ﷺ يوتر بثلاث ، لا يقعد إلا في آخرهن وهذا وتر أمير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه وعنه أخذ أهل المدينة ."

عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: نبی ﷺ تین وتر پڑھتے تھے، آپ ان میں صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے اور یہی وتر امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہے اور انھی سے اہلِ مدینہ نے لیا ہے۔ (المستدرک المخطوط ج ۱ ص ۱۴۵ ب)

یہی روایت اسی سند و متن کے ساتھ "إلا في آخرهن" تک ابو عبداللہ الحافظ الحاکم

النیسابوری کے شاگرد حافظ ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی رحمہ اللہ نے بھی بیان کر رکھی ہے۔ (دیکھئے السنن الکبریٰ ج ۳ ص ۲۸ ح ۴۸۰۳ باب من أوتر بخمس أو ثلاث لا یجلس ولا یسلم إلا في الآخرة منهن)

اب اس روایت کے راویوں کا مختصر و جامع تعارف پیشِ خدمت ہے:

۱: **ابونصر احمد بن سہل الفقیہ البخاری رحمہ اللہ**

ان کے بارے میں حافظ ابویعلی خلیل بن عبداللہ بن احمد بن خلیل الخلیلی القزوینی رحمہ اللہ (متوفی ۴۴۶ھ) نے فرمایا: ''ثقة متفق علیه''

اور فرمایا: ہمیں حاکم ابوعبداللہ نے ان سے حدیث بیان کی اور انھوں نے ان کی تعریف بیان کی۔ (الارشاد فی معرفۃ علماء الحدیث ۳/ ۹۷۴ ت ۹۰۳)

حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی بیان کردہ حدیث کو امام مسلم کی شرط پر صحیح کہا۔

(المستدرک والتلخیص ۱/ ۴۴۲ ح ۱۶۱۴)

۲: **ابوعلی صالح بن محمد بن (عمرو بن) حبیب الحافظ البغدادی البخاری: جزرہ رحمہ اللہ**

امام دارقطنی نے فرمایا: ''وکان ثقة صدوقًا حافظًا عارفًا.'' (المؤتلف والمختلف ۲/ ۷۵۰)

نیز دیکھئے تاریخ بغداد (۹/ ۳۲۴) تاریخ دمشق لابن عساکر اور سیر اعلام النبلاء (۱۴/ ۲۳)

۳: **ابومحمد شیبان بن فروخ ابی شیبہ الحبطی الابلی رحمہ اللہ**

آپ صحیح مسلم کے راوی اور جمہور محدثین کے نزدیک حدیث میں ثقہ وصدوق ہونے کی وجہ سے حسن الحدیث ہیں۔

حافظ ذہبی نے ان کے نام کے ساتھ ''صح'' کی علامت لکھ کر فرمایا: ''أحد الثقات''

(میزان الاعتدال ۲/ ۲۸۵ ت ۳۷۵۹)

جس راوی کے ساتھ حافظ ذہبی ''صح'' کی علامت لکھیں تو ان کے نزدیک اس راوی پر جرح مردود ہوتی ہے اور راوی کی توثیق پر عمل ہوتا ہے۔

(دیکھئے لسان المیزان ۲/ ۱۵۹، دوسرا نسخہ ۲/ ۲۸۹، تحقیقی مقالات ۳/ ۱۸۲-۱۸۳)

۴: **ابو یزید ابان بن یزید العطار البصری رحمہ اللہ**

آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے راوی اور جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ وصدوق ہیں۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا: ''ثقة له أفراد'' (تقریب التہذیب: ۱۴۳)

حافظ ذہبی نے فرمایا: ''حافظ صدوق إمام ...بل هو ثقة حجة''

(میزان الاعتدال ۱/ ۱۶ ت ۲۰)

ان کے ساتھ بھی حافظ ذہبی نے ''صح'' کی علامت لکھ رکھی ہے۔

۵: **قتادہ بن دعامہ البصری رحمہ اللہ**

آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بنیادی راوی اور ثقہ مدلس تھے۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا: ''ثقة ثبت'' (تقریب التہذیب: ۵۵۱۸)

حافظ ذہبی نے ان کے ساتھ ''صح'' کی علامت لکھی اور فرمایا: ''حافظ ثقة ثبت لكنه مدلس و رمي بالقدر ...'' (میزان الاعتدال ۳/ ۳۸۵ ت ۶۸۶۴)

روایت مذکور میں قتادہ کے سماع کی تصریح نہیں ملی، لیکن حنفی اصول پر یہ روایت صحیح ہے۔

ملا جیون (حنفی) نے لکھا ہے: ''حتى لا يقبل الطعن بالتدليس'' حتی کہ تدلیس کا طعن قابلِ قبول نہیں۔ (نور الانوار ص ۱۹۲، درسی نسخہ، مکتبۃ البشریٰ والا نسخہ ۱/ ۵۴۸)

ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے لکھا ہے:

اور قرون ثلاثہ میں ہمارے نزدیک تدلیس اور ارسال مضر نہیں۔

(اعلاء السنن ۱/ ۳۱۳، دوسرا نسخہ ۱/ ۳۳۶ ح ۳۳۱، الکواکب الدریہ ص ۴۷)

ظفر احمد تھانوی نے مزید لکھا ہے: میں نے کہا: اور اگر مدلس قرون ثلاثہ کے ثقہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تدلیس بھی اسی طرح مقبول ہوتی ہے جس طرح اس کی مرسل روایت مقبول ہوتی ہے۔ (قواعد فی علوم الحدیث ص ۱۵۹)

ماسٹر امین اوکاڑوی دیوبندی نے لکھا ہے:

''حالانکہ اسے معلوم ہے کہ احناف کے ہاں تو خیر القرون کی جہالت و تدلیس جرح

ہی نہیں اور شوافع کے ہاں متابعت سے یہ جرح ختم ہوگئی...'' (تجلیات صفدر ج ۳/ ۳۲۴)

احمد یار نعیمی بدایونی بریلوی نے لکھا ہے: ''ایک چیز کو بعض عیب سمجھتے ہیں۔ بعض نہیں۔ دیکھو تدلیس۔ ارسال۔ گھوڑے دوڑانا۔ مذاق۔ نوعمری۔ فقہ میں مشغولیت کو بعض لوگوں نے راوی کا عیب جانا ہے۔ مگر حنفیوں کے نزدیک ان میں سے کچھ بھی عیب نہیں۔ (نور الانوار بحث طعن علی الحدیث)'' (جاء الحق حصہ دوم ص ۷ قاعدہ نمبر ۷)

ثابت ہوا کہ حنفیہ و دیوبندیہ اور بریلویہ کے اصول سے قتادہ رحمہ اللہ کی یہ روایت صحیح ہے۔

اہلِ حدیث کے نزدیک اس روایت کے معنوی اور آثار سلف صالحین سے شواہد موجود ہیں، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ ان شاء اللہ

۶: **قاضی ابو حاجب زرارہ بن اوفی العامری البصری رحمہ اللہ**

آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے راوی تھے اور حافظ ابن حجر نے فرمایا: ''ثقة عابد''

(تقریب التہذیب: ۲۰۰۹)

۷: **سعد بن ہشام بن عامر الانصاری المدنی رحمہ اللہ**

آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے راوی تھے اور مکران کے علاقے میں شہید ہوئے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ثقة'' (تقریب التہذیب: ۲۲۵۸)

۸: **ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا**

آپ نے دیکھ لیا کہ مستدرک والی روایت کے سارے راوی ثقہ و صدوق ہیں اور صرف تدلیس کا اعتراض ہے، چنانچہ اہلِ حدیث کے نزدیک یہ سند ضعیف ہے لیکن حنفیوں، دیوبندیوں اور بریلویوں تینوں کے نزدیک یہ حدیث اور اس کی سند بالکل صحیح ہے۔

مستدرک کی اس روایت کا ایک شاہد درج ذیل ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لا توتروا بثلاث، أوتروا بخمس أو بسبع ولا تشبهوا بصلاة المغرب.))

'' تین وتر نہ پڑھو، پانچ یا سات پڑھو اور مغرب کی نماز سے مشابہت نہ کرو۔'' (صحیح ابن حبان،

الاحسان ۴/ ۷۰ ح ۲۴۲۰ وسندہ صحیح، وصححہ الحاکم فی المستدرک ۱/ ۳۰۴ ح ۱۱۳۷۔۱۱۳۸، ووافقہ الذہبی)

اس روایت کی مفصل تحقیق کے لیے دیکھئے میری کتاب: تحقیقی مقالات (ج ۴ ص ۱۴۴۔۱۴۶)

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا ہے:

اس اور نمازِ مغرب کے ساتھ تشبیہ سے سابقہ ممانعت کے درمیان جمع وتوفیق یہ ہے کہ تین سے ممانعت کو دو تشہدوں (والی تین رکعتوں) پر محمول کیا جائے۔ (فتح الباری ۲/ ۴۸۱)

نیز دیکھئے حنابلہ کی کتاب: الشرح الممتع علیٰ زاد المستقنع (۴/ ۱۲)

اس کا دوسرا شاہد اسی مضمون کے شروع میں بحوالہ المستدرک امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کے عمل سے گزر چکا ہے۔

دیوبندیہ و بریلویہ جس طریقے سے تین وتر پڑھتے ہیں، اس کا کوئی ثبوت ہمارے علم کے مطابق نبی کریم ﷺ یا کسی صحابی سے باسند صحیح و حسن لذاتہ موجود نہیں۔

آخر میں بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ صرف ایک وتر پڑھنا بھی جائز ہے۔

(دیکھئے سنن ابی داود: ۱۴۲۲، سنن نسائی: ۱۷۱۲، اور ہدیۃ المسلمین ص ۶۲ ح ۲۶)

[۱۴/ فروری ۲۰۱۲ء]

دو سجدوں کے درمیان بائیں ہاتھ سے گھٹنا پکڑنا؟

سوال دو سجدوں کے درمیان بائیں ہاتھ سے گھٹنے کو مضبوطی سے پکڑ لیں یا ران پر رکھیں؟ احناف ہاتھ ران پر رکھنے کا کہتے ہیں جبکہ ہمارا (یعنی اہل حدیث کا) عمل گھٹنے پکڑنے کا ہے، دلیل کی نشاندہی کر دیں۔ (شمس الرحمن۔ کراچی)

الجواب اس بارے میں کوئی صریح صحیح حدیث میرے علم میں نہیں، تاہم دو سجدوں کے درمیان کچھ دیر بیٹھنا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ (صحیح بخاری: ۸۲۰، صحیح مسلم: ۴۷۱/ ۱۰۵۷)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "و بین السجدتین حتی یقول

القائل :قدنسي "اورآپ (ﷺ) دوسجدوں کے درمیان (بیٹھتے تھے) حتیٰ کہ کہنے والا کہتا تھا: آپ بھول گئے ہیں۔ (صحیح البخاری:۸۲۱،صحیح مسلم:۴۷۲؍۱۰۶۰)

صحیح بخاری (۶۲۵۱) کی ایک بالکل صحیح اور محفوظ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا:((ثم اسجد حتی تطمئن ساجدًا، ثم ارفع حتی تطمئن جالسًا ثم اسجد حتی تطمئن ساجدًا، ثم ارفع حتی تطمئن جالسًا.))

''پھر اطمینان کے ساتھ سجدہ کر، پھر سجدے سے اٹھ کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جا، پھر اطمینان کے ساتھ سجدہ کر، پھر سجدے سے اٹھ کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جا۔''

ان احادیث سے دوسجدوں کے درمیان بیٹھنا ثابت ہے۔

تمام صحیح العقیدہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ دوسجدوں کے درمیان دونوں رانوں پر دونوں ہاتھ رکھنے چاہئیں اور اجماع شرعی حجت ہے۔

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں آیا ہے کہ "وسجد فوضع يديه حذو أذنيه ثم جلس فافترش رجله اليسرى ثم وضع يديه اليسرى على ركبته اليسرى ووضع ذراعه اليمنى على فخذه اليمنى ثم أشار بسبابته ووضع الابهام على الوسطى و قبض سائر أصابعه ثم سجد فكانت يداه حذاء أذنيه." اور آپ نے سجدہ کیا تو دونوں ہاتھ کانوں کے پاس رکھے، پھر آپ بیٹھ گئے تو بایاں پاؤں بچھایا، پھر بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر رکھا اور دائیں ذراع (بازو) اپنے دائیں ران پر رکھا، پھر شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا ور درمیانی انگلی پر انگوٹھا رکھا اور ساری انگلیاں بند کر لیں۔ پھر سجدہ کیا تو آپ کے دونوں ہاتھ دونوں کانوں کے قریب (رکھے ہوئے) تھے۔ (مسند احمد ۴؍۳۱۷ ح۱۸۸۵۸)

اس روایت کی سند میں سفیان بن سعید الثوری راوی مدلس ہیں اور سند عن سے ہے، لہٰذا یہ روایت اصول حدیث کی رُو سے ضعیف ہے۔ جو لوگ اصولِ حدیث کے مخالف یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہر مدلس کی عن والی روایت صحیح ہوتی ہے، الا یہ کہ کسی خاص روایت میں

تدلیس ثابت ہو جائے یا سفیان ثوری مدلس کی عن والی روایت بھی صحیح ہوتی ہے تو ان لوگوں کے اصول کی رو سے یہ روایت صحیح ہے، لہٰذا انھیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔!

ہمارے نزدیک یہ روایت ضعیف و مردود ہی ہے اور اس باب میں اصل اعتماد اجماع پر ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ بائیں گھٹنے کو مضبوطی سے پکڑنا چاہیے یا ہاتھ رکھ دینے چاہئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی صریح دلیل مجھے معلوم نہیں، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جمہور صحیح العقیدہ مسلمانوں کے عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں رانوں یا دونوں گھٹنوں پر اس حالت میں دونوں ہاتھ رکھ دیے جائیں۔ واللہ اعلم (۲/فروری ۲۰۱۳ء)

نمازِ ظہر سے پہلے چار سنتوں کے احکام

سوال ظہر کی فرض رکعات سے پہلے چار رکعات سنت کے متعلق کیا احکام ہیں؟ اگر چار رکعات سنت فرض رکعات سے پہلے نہ پڑھ سکیں تو کیا حکم ہے؟

(عبدالمتین۔ آسٹریلیا)

الجواب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ (صحیح بخاری:۱۱۸۲)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، پھر باہر جا کر لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ الخ (صحیح مسلم ۷۳۰/۱۶۹۹)

سیدنا عبداللہ بن السائب بن صیفی المخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ زوال کے بعد، ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، پھر فرماتے: ''اس وقت آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ (دربارِ الٰہی میں) میرا نیک عمل بلند (یعنی پیش) کیا جائے۔'' (سنن الترمذی:۴۷۸ وقال: ''حسن غریب'' وسندہ صحیح)

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر سے پہلے چار

رکعتیں اور بعد میں دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(سنن الترمذی: ۵۹۸۔ ۵۹۹ ملخصاً وقال: "ھذا حدیث حسن" وسندہ حسن)

رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ((من حافظ علٰی أربع رکعات قبل الظهر و أربع بعدها حرّمه اللّٰه علی النار.)) "جو شخص ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد چار رکعتوں کی حفاظت کرے (یعنی یہ رکعتیں ہمیشہ پڑھے تو) اللہ تعالیٰ نے اسے آگ پر حرام قرار دیا ہے، یعنی وہ جہنم کی آگ میں داخل نہیں ہوگا۔" (سنن الترمذی: ۴۲۸ وقال: "ھذا حدیث حسن صحیح غریب من ھذا الوجہ" وسندہ حسن، شرح السنۃ للبغوی ۳/ ۴۶۴ ح ۸۸۹ ونقل عن الترمذی قولہ: "حسن غریب" واقرہ، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۳/ ۲۳۵ ح ۴۵۳، مسند الشامیین ل: ۱۵۲۴)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے اور اس کے بہت سے شواہد بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے۔

اس سند کے ایک راوی ابو عبدالرحمٰن قاسم بن عبدالرحمٰن الدمشقی قولِ راجح میں جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق ہیں۔

عینی حنفی نے لکھا ہے: "وثقه الجمهور" إلخ

(عمدۃ القاری ۷/ ۲۴۶ ح ۱۱۰۳، دیکھئے میری کتاب تحقیقی مقالات ۲/ ۴۰۰)

قاسم بن عبدالرحمٰن کے شاگرد علاء بن حارث بن عبدالوارث الدمشقی صحیح مسلم کے راوی اور ثقہ وصدوق ہیں۔ جمہور کی توثیق کے ساتھ بعض کی طرف سے ان پر دو اعتراضات بھی کیے گئے ہیں:

۱: **اختلاط** (یہ اعتراض ثابت نہ ہونے کی وجہ سے باطل ومردود ہے۔)

اس اعتراض کا راوی ابو عبید الآجری مجہول الحال ہے۔

۲: **قدریت** (یہ ان سے باسند صحیح ہرگز ثابت نہیں کہ وہ تقدیر کے منکر تھے)

جمہور کی توثیق کے بعد ایسا (قدریت وغیرہ کا) اعتراض مردود ہوتا ہے اور اس

اعتراض کا روایتِ حدیث کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں۔

تنبیہ: اس باب میں اور روایات بھی موجود ہیں۔

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں۔ (دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۱۹۹ ح ۵۹۴۲ وسندہ صحیح، ۵۹۴۵ ملخصاً وسندہ صحیح)

عبدالرحمٰن بن عبد: القاری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ ظہر سے پہلے (نفل) نماز پڑھ رہے ہیں، پس انھوں نے پوچھا: اے امیر المومنین! یہ کیا (کونسی) نماز ہے؟ آپ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: یہ رات کی نماز (میں سے) ہے۔ (تہذیب الآثار لابن جریر الطبری، مسند عمر القسم الثانی ص ۹۶ ح ۲۶۳ ۲۸ وسندہ صحیح)

یعنی یہ رات کی (تہجد کی) نماز رہ گئی تھی، جو میں اب پڑھ رہا ہوں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے حزب (یعنی اوراد واذکار) یا اس کے کسی حصے سے سو یا رہ جائے تو نمازِ فجر اور نمازِ ظہر کے درمیان اسے پڑھ لے، اسے اسی طرح ثواب ملے گا جیسا کہ رات کو پڑھا ہے۔'' (صحیح مسلم: ۷۴۷، دار السلام: ۱۷۴۵)

اس حدیث سے امام ابن خزیمہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر تہجد کی نماز رہ جائے تو دن کو، حدیث میں مذکورہ وقت میں پڑھ لیں۔ (دیکھئے صحیح ابن خزیمہ ۲/ ۱۹۵ قبل ح ۱۱۷۱)

جاہلیت میں مسلمان ہونے والے عظیم ثقہ و عابد تابعی عمرو بن میمون الاودی رحمہ اللہ (م ۷۴ھ) نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور صبح سے پہلے دو رکعتیں کسی حال میں بھی ترک نہیں کیا کرتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ: ۵۹۴۳ وسندہ صحیح)

ابوالاحوص سلام بن سلیم الحنفی مولاھم الکوفی کا حصین بن عبدالرحمٰن السلمی سے سماع ان کے اختلاط سے پہلے کا ہے، ان کی حصین سے روایات صحیح مسلم (۱۲۸۳، ۳۰۹۴، ۱۶۲۳، ۴۱۸۱) میں ہیں۔

ان تمام روایات و آثار کا خلاصہ یہ ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں (نوافل یا سنتیں) پڑھنا بالکل صحیح ہے۔ یاد رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ظہر سے پہلے دو

رکعتیں پڑھتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۱۱۸۰ واللفظ لہ، صحیح مسلم: ۲۹/۷۲۹ [۱۶۹۸])

اس سے ثابت ہوا کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے صرف دو سنتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر دو اذانوں کے درمیان (نفل) نماز ہے۔" پھر آپ نے (تیسری یا چوتھی دفعہ) فرمایا: ((لمن شاء)) "جس کی مرضی ہو۔" (صحیح بخاری: ۶۲۷ واللفظ لہ، صحیح مسلم: ۸۳۸ [۱۹۴۰۔۱۹۴۱])

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی یہ دو رکعتیں (یا چار رکعتیں کسی وجہ سے) نہ پڑھ سکے تو جائز ہے۔

تنبیہ: چار سنتیں دو دو کر کے پڑھنا مسنون اور بہتر ہے، جیسا کہ "صلوٰۃ اللیل والنھار مثنی مثنی" والی صحیح حدیث سے ثابت ہے، نیز سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ (دیکھئے توضیح الاحکام یعنی فتاویٰ علمیہ ۱/ ۴۲۴)

حسن بصری رحمہ اللہ کا بھی ایسا ہی فتویٰ ہے، اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی اسی پر عامل تھے۔ (ایضاً ص ۴۲۵ بحوالہ مسائل احمد و اسحاق روایۃ الکوسج: ۳۳۳، ۴۰۵)

اگر چار رکعتیں دو دو کے بجائے صرف ایک سلام سے پڑھ لی جائیں تو بھی جائز ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے عمل سے ثابت ہے۔

(دیکھئے مصنف عبدالرزاق: ۴۲۲۵، الاوسط لابن المنذر ۵/ ۲۳۶ وسندہ حسن)

سوال کی دوسری شق کا جواب یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: نبی ﷺ جب ظہر سے پہلے چار رکعتیں نہ پڑھ پاتے تو انھیں بعد میں پڑھ لیتے تھے۔

(سنن ترمذی: ۴۲۶ وقال: "حسن غریب" وسندہ صحیح)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ چار رکعتیں نماز ظہر کے بعد دو سنتوں کے بعد پڑھتے تھے۔ (سنن ابن ماجہ: ۱۱۵۸)

یہ روایت قیس بن الربیع ضعیف راوی (ضعفہ الجمہور) کی وجہ سے ضعیف ہے، لہٰذا ان سنتوں کی مذکورہ ترتیب ضروری نہیں۔

اگر کوئی شخص ظہر کی پہلی چار یا دو سنتیں نمازِ ظہر کے بعد (کسی وجہ سے) نہ پڑھ سکے تو بھی "لمن شاء" والی حدیث کی رُو سے جائز ہے۔ واللہ اعلم (۱۸/ اگست ۲۰۱۳ء)

نمازِ عید کے بعد تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكَ کہنا؟

سوال کیا نمازِ عید کے بعد ایک دوسرے کو "تقبل اللّٰہ منا و منك" کہنا ثابت ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اس بارے میں دو مرفوع روایتیں مروی ہیں:

۱: سیدنا واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت

(الکامل لابن عدی ج ۶ ص ۲۲۷۴، دوسرا نسخہ ۷/ ۵۲۴ وقال: "ھذا منکر..." المجروحین لابن حبان ۲/ ۳۰۱، دوسرا نسخہ ۲/ ۳۱۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/ ۳۱۹، العلل المتناہیہ لابن الجوزی ۱/ ۴۷۶ ح ۸۱۱ وقال: "ھذا حدیث لا یصح..." التدوین فی اخبار قزوین ۱/ ۳۴۲، ابو بکر الازدی الموصلی فی حدیثہ ق ۲/۳، بحوالہ سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ للالبانی ۱۲/ ۳۸۵۔ ۳۸۶ ح ۵۶۶۶)

یہ روایت محمد بن ابراہیم بن العلاء الشامی کی وجہ سے موضوع ہے۔ محمد بن ابراہیم مذکور کے بارے میں امام دارقطنی نے فرمایا: کذاب (سوالات البرقانی للدارقطنی: ۴۲۳)

حافظ ابن حبان نے کہا: وہ شامیوں پر حدیث گھڑتا تھا۔ (المجروحین ۲/ ۳۰۱، دوسرا نسخہ ۲/ ۳۱۹)

صاحب المستدرک حافظ حاکم نے کہا: اس نے ولید بن مسلم اور سوید بن عبدالعزیز سے موضوع حدیثیں بیان کیں۔ (المدخل الی الصحیح ص ۲۰۸ ت ۱۹۱)

۲: سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/ ۳۱۹، ۳۲۰، امالی ابن شمعون: ۲۷۷، المجروحین لابن حبان ۲/ ۱۴۹، دوسرا نسخہ ۲/ ۱۳۳، العلل المتناہیہ ۲/ ۵۷۔ ۵۸ ح ۹۰۰ وقال: "ھذا حدیث لیس بصحیح" تاریخ دمشق لابن عساکر ۳۶/ ۶۹)

اس کے راوی عبدالخالق بن زید بن واقد کے بارے میں امام بخاری نے فرمایا:

"منکر الحدیث" (کتاب الضعفاء للبخاری بتحقیقی: ۲۴۴)

امام بخاری نے فرمایا: میں جسے منکر الحدیث کہوں تو میں اُس سے روایت بیان کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ (التاریخ الاوسط ۲/۱۰۷، دوسرا نسخہ، ہامش التاریخ الاوسط ۳/۵۸۲)

معلوم ہوا کہ یہ روایت سخت ضعیف ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ مکحول اور سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کے درمیان واسطہ نہ ہونے کی وجہ سے منقطع بھی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کو سند کے لحاظ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ (دیکھئے فتح الباری ۲/۴۴۶ تحت ح ۹۵۲)

ان مردود روایات کے بعد اب بعض آثار کی تحقیق درج ذیل ہے:

۱: طحاوی نے کہا: "وحدثنا يحي بن عثمان قال: حدثنا نعيم قال: حدثنا محمد ابن حرب عن محمد بن زياد الألهاني قال: كنا نأتي أبا أمامة و واثلة بن الأسقع في الفطر والأضحى ونقول لهما: تقبل الله منا ومنكم فيقولان: ومنكم و منكم" محمد بن زیاد الالہانی (ابوسفیان الحمصی: ثقہ) سے روایت ہے کہ ہم عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں ابوامامہ اور واثلہ بن اسقع (رضی اللہ عنہما) کے پاس جاتے تو کہتے: "تقبل الله منا و منكم" اللہ ہمارے اور تمھارے (اعمال) قبول فرمائے، پھر وہ دونوں جواب دیتے: اور تمھارے بھی، اور تمھارے بھی۔ (مختصر اختلاف الفقہا للطحاوی، اختصار الجصاص ۴/۳۸۵ وسندہ حسن)

اس سند میں یحییٰ بن عثمان بن صالح اور نعیم بن حماد دونوں جمہور کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے حسن الحدیث تھے اور باقی سند صحیح ہے۔

اس روایت کو ابن الترکمانی نے بغیر کسی حوالے کے نقل کر کے "حديث جيد" کہا اور احمد بن حنبل سے اس کی سند کا جید ہونا نقل کیا ہے۔ دیکھئے الجوہر النقی (۳/۳۱۹۔۳۲۰)

۲: قاضی حسین بن اسماعیل المحاملی نے کہا: "حدثنا المهنى بن يحي قال: حدثنا مبشر بن إسماعيل الحلبي عن إسماعيل بن عياش عن صفوان بن عمرو عن عبدالرحمٰن بن جبير بن نفير عن أبيه قال: كان أصحاب النبي ﷺ إذا التقوا يوم العيد يقول بعضهم لبعض: تقبل الله منا و منك"

جبیر بن نفیر (رحمہ اللہ تابعی) سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ کے صحابہ عید کے دن ایک

دوسرے سے ملاقات کرتے تو ایک دوسرے کو تقبل اللہ منا و منك کہتے تھے۔

(الجزء الثانی من کتاب صلوۃ العیدین مخطوط مصور ص ۲۴ ب وسندہ حسن)

اس روایت کی سند حسن ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔

دیکھئے فتح الباری (۲/۴۴۶ تحت ح ۹۵۲)

۳: صفوان بن عمرو السکسکی (ثقہ) سے روایت ہے کہ میں نے عبداللہ بن بسر المازنی (رضی اللہ عنہ) خالد بن معدان (رحمہ اللہ) راشد بن سعد (رحمہ اللہ) عبدالرحمن بن جبیر بن نفیر (رحمہ اللہ) اور عبدالرحمن بن عائذ (رحمہ اللہ) وغیرہم شیوخ کو دیکھا وہ عید میں ایک دوسرے کو تقبل اللہ منا و منك کہتے تھے۔ (تاریخ دمشق لابن عساکر ۲۶/۱۰۶، ترجمہ صفوان بن عمرو، وسندہ حسن)

۴: علی بن ثابت الجزری رحمہ اللہ (صدوق حسن الحدیث) نے کہا: میں نے (امام) مالک بن انس (رحمہ اللہ) سے عید کے دن لوگوں کے تقبل اللہ منا و منك کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ہمارے ہاں (مدینے میں) اسی پر عمل جاری ہے، ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ (کتاب الثقات لابن حبان ج ۹ ص ۹۰ وسندہ حسن)

۵: امام شعبہ بن الحجاج رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ مجھے عید کے دن یونس بن عبید ملے تو کہا: تقبل اللہ منا و منك. (کتاب الدعا للطبرانی ج ۲ ص ۱۲۳۴ ح ۹۲۹ وسندہ حسن)

اس روایت کے راوی حسن بن علی المعمری اُن روایات میں صدوق حسن الحدیث تھے، جن میں اُن پر انکار نہیں کیا گیا تھا اور اس روایت میں بھی اُن پر انکار ثابت نہیں ہے۔

نیز دیکھئے لسان المیزان بحاشیتی (ج ۲ ص ۴۱۴۔۴۱۵)

۶: طحاوی نے اپنے استاذوں اور معاصرین بکار بن قتیبہ، امام مزنی، یونس بن عبدالاعلیٰ اور ابوجعفر بن ابی عمران کے بارے میں کہا کہ جب انھیں عید کی مبارکباد دی جاتی تو وہ اسی طرح جواب دیتے تھے۔ (مختصر اختلاف العلماء ج ۴ ص ۳۸۵)

ان آثار سے معلوم ہوا کہ عید کے دن ایک دوسرے کو تقبل اللہ منا و منك کہنا (اور مبارکباد دینا) جائز ہے۔ (۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

دعائے قنوت میں مزید دعائیں

سوال دعائے قنوت کے بعد وتر میں مزید کوئی دعا (قرآنی، مسنون، یا اپنی کوئی) کی جا سکتی ہے؟ جیسے حرم میں امام کعبہ کرتے ہیں؟ (ایک سائلہ)

الجواب قنوتِ وتر میں اللهم اهدني فيمن هديت إلخ والی دعا ثابت ہے، لیکن اس میں کوئی خاص دعا مقرر نہیں کہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی جائز نہیں، جیسا کہ امام محمد بن نصر المروزی رحمہ اللہ نے فرمایا: " و ليس فيه شئ موقت " اور اس میں کوئی خاص دعا مقرر نہیں ہے۔ (مختصر قیام اللیل ص ۳۰۱)

لہٰذا قنوتِ نازلہ سے استدلال کرتے ہوئے بعض اوقات دوسری دعائیں مانگنا بھی جائز ہے، جیسا کہ حرمین وغیرہما میں اس پر عمل ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ مسنون دعا ہی مانگی جائے۔ واللہ اعلم

اس مسئلے کے جواز کی صریح دلیل کے لئے دیکھئے صحیح ابن خزیمہ (۲/ ۱۵۵۔ ۱۵۶ ح ۱۱۰۰، وسندہ صحیح موقوف)

نمازِ جنازہ سے متعلق مسائل

میت دفن کرنے کے بعد قبر پر اجتماعی دعا

سوال کیا میت دفن کرنے کے بعد قبر پر میت کے لئے اجتماعی دعا کرنا کتاب و سنت سے ثابت ہے؟

(۲) رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا: ((استغفروا لأخیکم .)) انفرادی ہے یا اجتماعی؟

(۳) نیز السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۴ ص ۵۶) میں کتاب الجنائز باب مایقال بعد الدفن میں ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں: "رأیت عبداللّٰہ بن عباس لما فرغ من قبر عبد اللّٰہ بن السائب فقام الناس عنه قام ابن عباس فوقف علیه و دعا له "

(۴) اسی طرح مصنف عبدالرزاق میں وارد آثار کتاب الجنائز باب: الدعاء للمیت حین یفرغ منه. کی اسنادی حیثیت پر روشنی ڈالیں۔ (محمد رمضان سلفی، عارف والا)

الجواب سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "کان النبي ﷺ إذا فرغ من دفن المیّت و قف علیه فقال: ((استغفروا لأخیکم و سلوا له بالتثبیت فإنه الآن یُسأل .)) جب نبی ﷺ میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو وہاں کھڑے رہتے، پھر فرماتے: "اپنے بھائی کے لئے دعائے استغفار کرو اور اُس کے لئے (اللہ سے) ثابت قدمی کا سوال کرو، کیونکہ اب اس سے سوال جواب ہوں گے۔"

(سنن ابی داود: ۳۲۲۱ باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف، وسندہ حسن وصححہ الحاکم ۱/۳۷۰ ح ۱۳۷۲ ووافقہ الذہبی)

اس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہیں:

۱: دفن کے بعد میت کے لئے دعا

۲: اجتماعی دعا

حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ نے حدیث مذکور کے بعد لکھا ہے:

''اس طرح قبر پر اختیار ہے ہاتھ اُٹھا کر دعا کرے یا بغیر ہاتھ اُٹھائے ہاں ہاتھ اٹھانا آداب دُعا سے ہے اس لئے اٹھانا بہتر ہے مگر لازم نہ سمجھے۔ اور اگر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے تو اس پر اعتراض نہ کرے...'' (فتاویٰ اہلحدیث ج ۲ ص ۱۳۱)

(۲) چونکہ اس حدیث میں جمع کا صیغہ ہے، لہٰذا یہ دعا اجتماعی ہے۔

(۳) اس اثر کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ابن ابی ملیکہ (رحمہ اللہ) نے فرمایا: میں نے دیکھا، جب (سیدنا) عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) عبداللہ بن السائب (رضی اللہ عنہ) کی قبر سے فارغ ہوئے تو لوگ ان کے پاس کھڑے ہو گئے (اور) ابن عباس (رضی اللہ عنہ نے بھی) کھڑے ہو کر ان (عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ) کے لئے دعا فرمائی۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، المعرفۃ والتاریخ لامام یعقوب بن سفیان الفارسی ج ۱ ص ۲۲۲ وسندہ صحیح)

اس روایت (اثر) کی سند صحیح ہے۔

(۴) مصنف عبدالرزاق کے باب مذکور میں ہے:

" أخبرنا معمر عن أيوب قال: وقف ابن المنكدر على قبر بعد أن فرغ منه فقال: اللهم ثبته، هو الآن يسأل. "

(محمد) بن المنکدر (رحمہ اللہ) قبر (یعنی دفن) سے فارغ ہوئے تو فرمایا: اے اللہ! اسے ثابت قدم رکھ، اس سے اب سوال جواب ہوں گے۔ (ج ۳ ص ۵۰۹ ح ۶۵۰۴)

اس کی سند صحیح ہے اور اس باب کی باقی تمام اسانید کی یہاں سندیں ضعیف ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں عبداللہ بن ابی بکر (بن محمد بن عمرو بن حزم رحمہ اللہ) سے روایت ہے کہ (سیدنا) انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) قبر پر مٹی ڈالے جانے کے بعد کھڑے ہو جاتے، پھر میت کے لئے دعا کرتے تھے۔ (ج ۳ ص ۳۳۰ ح ۱۱۷۰۵ ملخصاً وسندہ صحیح)

احنف بن قیس رحمہ اللہ نے بھی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کی۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۳۳۱/۳ ح ۱۱۷۰۸ و سندہ حسن، خالد هو ابن سمير حسن الحديث)

ایوب السختیانی رحمہ اللہ قبر پر کھڑے ہو کر میت کے لئے دعا کرتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۳۳۱ ح ۱۱۷۱۰، وسندہ صحیح)

یہ آثار اور حدیث مرفوع اس بات کی دلیل ہے کہ قبر پر دفن کے بعد اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح سے دعا کرنا صحیح ہے۔

میت والوں کے لئے تین دن کھانا تیار کرنا

سوال میت کے گھر والوں کے لئے کتنے دن کھانا پکا کر بھیجنا جائز ہے؟ (۲) عموماً تین دن مشہور ہے۔ کتاب وسنت اور آثار سلف صالحین سے تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں۔ (محمد رمضان سلفی، عارف والا)

الجواب سیدنا عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اصنعوا لآل جعفر طعامًا فإنه قد أتاهم أمر يشغلهم .))

''آلِ جعفر کے لئے کھانا تیار کرو، کیونکہ ایسی بات ہوگئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔'' (سنن ابی داود: ۳۱۳۲ وسندہ حسن وصححہ الترمذی: ۹۹۸، الحاکم ۱/۳۷۲ والذہبی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت والوں کے لئے ان کے رشتہ داروں، دوستوں اور ہمدردوں کو مصیبت کے وقت کھانا تیار کر کے بھیجنا چاہئے۔ بہتر یہی ہے کہ کھانا عام مناسب ہو اور تمام تکلفات سے اجتناب کیا جائے۔

چونکہ عام میت پر سوگ اور غم صرف تین دن کے لئے ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (۱۲۷۹، نیز دیکھئے صحیح مسلم: ۹۳۸ بعد ۱۴۹۱) کی حدیث سے ثابت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آلِ جعفر کو تین (دن رات) کی مہلت دی تھی، پھر اس کے بعد آپ تشریف لائے اور فرمایا: ((لا تبكوا على أخي بعد اليوم .))

آج کے بعد میرے بھائی پر نہ رونا، یعنی اس کا سوگ نہ کرو۔

(سنن ابی داود: ۴۱۹۲ وسندہ صحیح وصححہ النووی علی شرط البخاری ومسلم، ریاض الصالحین: ۱۶۴۲)

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر معلوم ہوا کہ اہلِ میت کے لئے تین دن رات تک کھانا تیار

کر کے بھیجنا صحیح اور جائز ہے۔

تنبیہ: یہ معلوم نہیں کہ متاخرینِ حنفیہ میں سے طحطاوی حنفی (!) نے صرف ایک رات دن کا کھانا بھیجنے کا کس دلیل سے فتویٰ دے رکھا ہے؟!

(طحطاوی کے حوالے کے لئے دیکھئے شیخ فضل الرحمن بن محمد کی کتاب: جنازے کے مسائل ص۱۸۳)

نبی کریم ﷺ کی نمازِ جنازہ

سوال نبی کریم ﷺ کا جنازہ کس طرح پڑھا گیا اور اس نمازِ جنازہ کی کیفیت کیا تھی؟ (اعجاز احمد، گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

الجواب سیدنا سالم بن عبید (الاشجعی رضی اللہ عنہ جو اصحاب صفہ میں سے تھے) سے مروی ایک لمبی روایت میں آیا ہے کہ لوگوں نے (سیدنا) ابوبکر (الصدیق رضی اللہ عنہ) سے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں! تو لوگوں نے جان لیا کہ یہ سچ ہے۔ پھر لوگوں نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں! لوگوں نے کہا: کیسے پڑھی جائے گی؟ انھوں نے فرمایا:

"یدخل قوم فیکبّرون ویصلّون ویدعون ثم یخرجون ثم یدخل قوم فیکبّرون ویصلّون ویدعون ثم یخرجون حتی یدخل الناس."

ایک جماعت (حجرے میں) داخل ہوگی، پھر وہ تکبیر کہیں گے، نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور دعا کریں گے، پھر باہر نکل جائیں گے، پھر دوسری جماعت داخل ہوگی تو تکبیر کہیں گے اور نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور دعا کریں گے، پھر باہر نکل جائیں گے حتیٰ کہ دوسرے لوگ داخل ہو جائیں۔ لوگوں نے کہا: اے رسول اللہ کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ کو (زمین میں) دفن کیا جائے گا؟ انھوں نے کہا: جی ہاں! لوگوں نے پوچھا: کہاں؟ انھوں نے فرمایا: اس مکان میں جہاں اللہ نے آپ کی روح قبض فرمائی، کیونکہ اللہ نے پاک مکان میں ہی آپ کی روح

قبض فرمائی ہے تو لوگوں نے جان لیا کہ انھوں (سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ) نے سچ فرمایا ہے۔الخ (کتاب الشمائل للترمذی بتحقیقی: ۳۹۷ وسندہ صحیح، السنن الکبری للنسائی ۴/۲۶۳ ح ۷۱۱۹، الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم ۳/ ۱۳۔۱۴ ح ۱۲۹۹، المعجم الکبیر للطبرانی ۷/ ۵۷ ح ۶۳۶۷، التمہید لابن عبدالبر ۲۴/ ۳۹۷۔ ۳۹۸ وقال: ہو محفوظ...الخ)

اس حدیث کی سند صحیح ہے، اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

سلمہ بن نبیط بن شریط پر اختلاط کا الزام "یقال" یعنی صیغۂ تمریض کی وجہ سے ثابت نہیں، دوسرے یہ کہ ان سے عبداللہ بن داود کی روایت کو امام ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ روایت مذکورہ پر اختلاط کا اعتراض غلط ہے۔ (دیکھئے صحیح ابن خزیمہ: ۱۵۴۱، ۱۶۲۴)

یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں مختصراً بعض متن کے ساتھ موجود ہے۔ (ح ۱۲۳۴)

اور بوصیری نے کہا: "هذا إسناد صحيح، رجاله ثقات" (زوائد ابن ماجہ: ۴۰۳)

ہیثمی نے کہا: "و رجاله ثقات" (مجمع الزوائد ۵/ ۱۸۳)

اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہیں، مثلاً:

۱: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

۲: یہ نماز جنازہ بغیر امام کے، انفرادی اور گروہ در گروہ کی صورت میں پڑھی گئی تھی۔

۳: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے، یعنی آپ نے موت کا مزہ چکھا۔

۴: نبی جہاں فوت ہوتے تھے، وہیں ان کی قبر بنتی تھی۔

۵: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے جسم مبارک کو حجرۂ عائشہ کی پاک و مقدس زمین میں دفن کیا۔

۶: سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن و دفن اور جنازے کا پورا علم تھا۔

۷: سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام میں سب سے بڑے عالم تھے۔

۸: جب علم نہ ہو تو عالم سے مسئلہ پوچھ کر اس پر عمل کرنا چاہئے۔ وغیر ذلک

سیدنا سالم بن عبید رضی اللہ عنہ کی روایت مذکورہ کی تائید میں سیدنا ابو عسیم رضی اللہ عنہ کی بیان

کردہ روایت بھی پیشِ خدمت ہے:

امام ابن سعد نے فرمایا: "أخبرنا عفان بن مسلم والأسود بن عامر قالا: أخبرنا حماد بن سلمة قال: أخبرنا أبو عمران الجونی: أخبرنا أبو عسیم شهد ذلك قال: لما قبض رسول الله ﷺ قالوا: كيف نصلّي عليه؟ قالوا: ادخلوا من ذاالباب أرسالاً أرسالاً فصلّوا عليه واخرجوا من الباب الآخر."

ابو عسیم (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ وہ اس وقت (جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے) حاضر تھے، انھوں نے فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو لوگوں نے کہا: آپ کی نماز جنازہ کس طرح پڑھی جائے؟ انھوں نے جواب دیا: اس دروازے سے گروہ در گروہ داخل ہو جاؤ، پھر آپ کا جنازہ پڑھو اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤ۔

(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۸۹ وسندہ صحیح)

اس روایت کی سند سیدنا ابو عسیم رضی اللہ عنہ تک صحیح ہے۔

فائدہ: ابو عسیم کو ابو عسیب بھی کہا جاتا ہے۔ رضی اللہ عنہ

(دیکھئے مسند احمد ۵/ ۸۱ ح ۲۰۷۶۶ وسندہ صحیح ورواہ مطولاً)

حافظ ابن عبدالبر نے فرمایا: "وأما صلوة الناس عليه أفذاذاً فمجتمع عليه عند أهل السير وجماعة أهل النقل لا يختلفون فيه" اور رہا لوگوں کا انفرادی طور پر ٹولیوں کی صورت میں آپ کی نمازِ جنازہ پڑھنا تو سیرت نگاروں اور ناقلینِ حدیث کا اس پر اجماع ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ (التمہید ج ۲۴ ص ۳۹۷، نسخہ مرتبہ ج ۶ ص ۵۵۲)

امام ابو عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: "فقد صلّى الناس على رسول الله ﷺ أفراداً لا يؤمهم أحد وذلك لعظم أمر رسول الله ﷺ وتنافسهم في أن لا يتولى الإمامة في الصلوة عليه واحد وصلوا عليه مرة بعد مرة."

پس لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ انفرادی طور پر پڑھی، کوئی ان کی امامت نہیں کرتا تھا۔ یہ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا مقام عظیم ہے اور (دوسرے یہ کہ) انھوں نے

آپ کی نمازِ جنازہ میں امامت کے بارے میں اختلاف کیا کہ کوئی ایک امامت نہ کرے اور انھوں نے ایک دوسرے کے بعد آپ کی جنازہ پڑھی۔

(کتاب الام ج ۱ ص ۲۷۵ باب الصلاۃ علی المیت)

امام شافعی رحمہ اللہ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی مسلسل انفرادی نمازِ جنازہ آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ اس نمازِ جنازہ کی واضح کیفیت کسی صحیح حدیث میں نہیں ملی، لہٰذا عموم سے استدلال کرتے ہوئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح جنازہ پڑھا گیا ہوگا جس طرح فوت شدہ مسلمانوں پر پڑھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس نمازِ جنازہ میں دعائے مغفرت نہیں پڑھی گئی بلکہ صرف درود پڑھا گیا تھا (!) لیکن اس قول کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔ (۱۳ اپریل ۲۰۱۱ء)

میّت کا چہرہ قبلہ رُخ کرنا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر میت کو سیدھا لٹا کر اس کی گردن کو موڑ کر قبلہ کی طرف منہ کر دیتے ہیں (قبر میں) جبکہ میں نے فتاویٰ اسلامیہ مترجم جلد دوئم طبع دار السلام میں شیخ ابن عثیمین کا جواب پڑھا ہے کہ میت کو دائیں پہلو پر قبلہ رخ دفن کیا جائے اسی طرح احکام الجنائز مترجم ص ۱۸۳ مسئلہ نمبر ۱۵۲ میں لکھا ہے میت کو قبر میں دائیں کروٹ لٹایا جائے گا۔ محترم شیخ! ہمارے ہاں پاکستان میں میت کو قبر میں سیدھا لٹایا جاتا ہے، لہٰذا کتاب وسنت کے مطابق مسئلہ کی صحیح وضاحت فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً (محمد رمضان سلفی عارف والا)

الجواب اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق (اجماع) ہے کہ میت کا رُخ قبر میں قبلے کی طرف ہونا چاہئے۔

(دیکھئے المحلی لابن حزم ج ۵ ص ۱۷۳ مسئلہ: ۶۱۵، احکام الجنائز للالبانی ص ۱۵۱ فقرہ ۱۰۴)

اس کی تائید میں دو حدیثیں بھی مروی ہیں، جن کی تحقیق درج ذیل ہے:

۱: '' قبلتكم أحياءً و أمواتاً '' تمھارے زندہ اور فوت شدہ لوگوں کا قبلہ۔

(ابوداود ۲۸۷۵، نسائی ۴۰۱۷، المستدرک للحاکم ۱/ ۵۹ ح ۲۵۹)

اس کی سند یحییٰ بن ابی کثیر کے عن کی وجہ سے ضعیف ہے اور السنن الکبریٰ للبیہقی (۳/ ۴۰۹) میں اس کے ضعیف شواہد بھی ہیں جن کے ساتھ یہ ضعیف ہی ہے۔

۲: سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ اور استقبال القبلہ کی وصیت

(الاوسط لابن المنذر ۵/ ۳۲۰، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/ ۳۸۴، المستدرک للحاکم ۱/ ۳۵۳۔۳۵۴ ح ۱۳۰۵)

اسے یحییٰ بن عبداللہ بن ابی قتادہ (وثقہ ابن حبان والحاکم وغیرھما) نے عن ابیہ (عبداللہ بن ابی قتادہ) کی سند سے بیان کیا ہے، لیکن مستدرک الحاکم میں اسے سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردیا گیا ہے، جیسا کہ نصب الرایہ (۲/ ۲۵۲) اور اتحاف المہرۃ (۴/ ۱۳۳ ح ۴۰۵۴) وغیرہما سے ظاہر ہے، اور یہ اضافہ وہم (غلط) ہے۔ (دیکھئے ارواء الغلیل ۳/ ۱۵۳ ح ۶۸۹)

اس روایت میں نعیم بن حماد پر اعتراض باطل و مردود ہے، لیکن یہ سند مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ السنن الکبریٰ للبیہقی (۳/ ۳۸۴ فیہ ابن شہاب الزہری وعنعن) میں اس کا ضعیف و مرسل شاہد بھی ہے اور اسے ''مرسل جید'' کہنا محل نظر ہے۔

مشہور تابعی امام حسن بصری رحمہ اللہ یہ پسند کرتے تھے کہ میت کو موت کے وقت قبلہ رخ کرنا چاہئے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۲۳۹ ح ۱۰۸۷۲، وسندہ صحیح)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: '' إن جعل شقه إلى القبلة فذاك. و أراه قال: وإن شاؤا مستلقيًا على قفاه.... '' اگر اس کا پہلو قبلہ رخ کیا جائے تو یہ (بہتر) ہے، اور (ابوداود نے کہا:) میرا خیال ہے کہ انھوں نے فرمایا: اور اگر چاہیں تو وہ پشت کے بل لیٹا ہوا اور اس کا چہرہ قبلہ رخ کردیا جائے۔ (مسائل ابی داود ص ۱۳۸)

مختصر یہ کہ مریوں کی طرح اگر دائیں پہلو قبلہ رخ لٹا دیا جائے تو جائز ہے اور اگر عام لوگوں کے مسلسل عمل یعنی پشت پر لیٹی ہوئی میت کا صرف چہرہ قبلہ رخ کردیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم (۵/ اپریل ۲۰۱۱ء)

عورتوں کا قبرستان میں جانا؟

سوال کیا عورت قبرستان جا سکتی ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (محمد ذیشان سبحانی، سیالکوٹ)

الجواب عبداللہ بن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک دن عائشہ (رضی اللہ عنہا) قبرستان سے آئیں تو پوچھا گیا: اے ام المومنین! آپ کہاں سے آئی ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) کی قبر سے آئی ہوں، تو پوچھا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع نہیں فرمایا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: "نعم! کان نهى ثم أمر بزيارتها" جی ہاں! آپ نے منع فرمایا تھا، پھر (بعد میں) زیارت کا حکم دے دیا تھا۔ (مستدرک الحاکم ۱/ ۳۷۶ ح ۱۳۹۲، وسندہ صحیح، السنن الکبریٰ للبیہقی ۴/ ۷۸ ح ۶۹۹۹، نیز دیکھئے التمہید لابن عبدالبر ۳/ ۲۳۳)

اس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہیں:

۱: قبروں کی زیارت سے ممانعت والا حکم منسوخ ہے۔

۲: عورتوں کے لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کی قبروں پر (کبھی کبھار) جانا جائز و غیر ممنوع ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كنتُ نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها))

"میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، پس (اب) ان کی زیارت کیا کرو۔"

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۱۴ ح ۹۷۷، ترقیم دارالسلام: ۲۲۶۰)

اس حدیث کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں لہٰذا ان کے لئے زیارت القبور جائز ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو کہ ایک قبر کے قریب (بیٹھی) رو رہی تھی تو آپ نے فرمایا: ((اتقي الله

واصبري .))"تو اللہ سے ڈر اور صبر کر۔" (صحیح بخاری:۱۲۵۲، صحیح مسلم:۹۲۶، دارالسلام:۲۱۴۱)

اس حدیث سے بھی عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت کا جواز ثابت ہے اور دوسرے دلائل مثلاً سیدہ اُم عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث وغیرہ سے بھی یہی ظاہر ہے کہ عورتوں کے لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کی قبروں کی زیارت کے لئے کبھی کبھار جانا منع نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور کبھی کبھار کی شرطیں کیوں لگائی ہیں؟ تو اس کی وضاحت درج ذیل ہے:

۱: صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ((زوّارات القبور)) "یعنی کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں، پر لعنت فرمائی ہے۔" (سنن ترمذی:۱۰۵۶، وقال: "هذا حدیث حسن صحیح" وسندہ حسن)

زوّارات مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی عورتوں کے لئے کثرت سے قبروں کی زیارت منع بلکہ حرام ہے۔

تنبیہ: ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ((زائرات القبور)) پر لعنت فرمائی ہے۔ (سنن ترمذی:۳۲۰ وقال: "حدیث حسن" سنن ابی داود:۳۲۳۶، سنن النسائی:۲۰۴۵)

اس روایت کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: ابو صالح مولیٰ ام ہانی جمہور کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔

دوم: ابو صالح نے اس روایت کو اختلاط کے بعد بیان کیا تھا، لہٰذا اس روایت کو حسن قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

۲: سیدنا عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے، آپ نے ایک عورت کو دیکھا جو یہ نہیں سمجھتی تھی کہ آپ نے اسے پہچان لیا ہے، پھر جب آپ راستے کے درمیان پہنچے تو کھڑے ہو گئے حتیٰ کہ وہ عورت قریب آ گئی، دیکھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) تھیں۔ آپ نے انھیں فرمایا: اے فاطمہ! اپنے گھر سے کیوں باہر آئی ہو؟ انھوں نے جواب دیا: میں اس میت والوں کے

گھر گئی تھی، تاکہ تعزیت کروں اور مغفرت کی دعا کروں۔ آپ نے فرمایا: ''شاید تو اُن کے ساتھ کُدیٰ (قبرستان) تک بھی گئی ہے؟'' انھوں (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) نے جواب دیا: میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں کہ وہاں (قبرستان تک) گئی ہوں اور میں نے آپ کو اس کے بارے میں (منع کرتے ہوئے) سنا ہے۔ الخ (سنن ابی داود: ۳۱۲۳ وسکت علیہ، سنن النسائی: ۱۸۸۱، واللفظ لہ و قال النسائی: ''ربیعۃ ضعیف'' قلت: بل وثقہ الجمہور فھو حسن الحدیث والسند حسن)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے اور ربیعہ بن سیف المعافری کو جمہور محدثین نے ثقہ وصدوق قرار دیا ہے، لہٰذا امام نسائی کا انھیں ضعیف قرار دینا جمہور کی توثیق کے بعد معتبر نہیں ہے۔

اس حدیث سے صاف ثابت ہے کہ عورتوں کے لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ غیر لوگوں کی قبروں کی زیارت جائز نہیں ہے۔

ان روایات کے بعد آخر میں، عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت کے بارے میں خلاصۃ التحقیق درج ذیل ہے:

۱: عورتوں کے لئے اپنے قریبی رشتہ داروں مثلاً بھائی، بیٹا اور شوہر وغیرہ کی قبروں پر کبھی کبھار جانا جائز ہے۔

۲: غیر لوگوں کی قبروں پر عورتوں کا جانا حرام ہے۔

۳: جو عورتیں ''باوں'' مزاروں، درباروں اور پیروں کی قبروں پر جاتی ہیں، یہ جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔

۴: عورتوں کا کثرت سے قبروں کی زیارت کرنا حرام ہے۔

۵: قبروں کی زیارت کے لئے جانے کے کئی مقاصد ہیں، مثلاً:

اول: مُردوں کے لئے دعائے مغفرت ورحمت کی جائے۔

دوم: موت اور آخرت کو یاد کیا جائے۔

۶: قبروں پر جا کر قبر والوں سے دعائیں و مرادیں مانگنا، اپنی حاجات میں انھیں پکارنا، مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا، نیز صفاتِ الٰہیہ مختصہ بذاتِ باری تعالیٰ کو اموات کے ساتھ منسوب کرنا کفر، شرک اور ظلمِ عظیم ہے۔ (۲۱/ ستمبر ۲۰۱۱ء جامعۃ الامام البخاری، سرگودھا)

پردیس میں تعزیتِ اموات

سوال ہمارا کوئی عزیز، رشتہ دار پاکستان میں فوت ہو جاتا ہے تو ہم لوگ انگلینڈ میں تین دن تک تعزیت کے لئے بیٹھتے ہیں اور تین دن رشتہ داروں کی طرف سے کھانا بھی آتا ہے۔ ہمارا یہ کام کہاں تک درست ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (محمد فیاض دانوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب زید بن حارثہ، جعفر اور عبداللہ بن رواحہ (رضی اللہ عنہم) کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے۔ آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آرہے تھے۔ (صحیح بخاری: ۱۲۹۹، صحیح مسلم: ۹۳۵ ترقیم دارالسلام: ۲۱۶۱)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اہلِ میت کا تعزیت والوں کے لئے (تین دن تک) بیٹھنا جائز ہے۔

سیدنا جعفر بن ابی طالب الطیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نبی ﷺ نے آلِ جعفر کو تین دن کی مہلت دی، پھر ان کے پاس جا کر فرمایا: ''آج کے بعد میرے بھائی پر نہ رونا۔''

(سنن ابی داود: ۴۱۹۲ و سندہ صحیح)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تین دن سے زیادہ سوگ کرنا اور اس کے لئے بیٹھنا جائز نہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِصْنَعُوْا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَإِنَّهُ قَدْ أَتَاهُمْ أَمْرٌ يَشْغَلُهُمْ .)) ''آلِ جعفر کے لئے کھانا تیار کرو، کیونکہ ان پر ایسی بات آگئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔''

(سنن ابی داود: ۳۱۳۲ و سندہ حسن و توثیق ۱۱ ذ ۹ م ج ۱ ص ۵۰۸)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت والوں کے رشتہ دار یا دوست ہمدرد وغیرہ ان کے لئے (تین دن تک) کھانا تیار کر کے بھیج سکتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ اگر دوست رشتہ دار کسی ضروری کام میں بہت مصروف ہوں تو ان کے پاس کھانا پانی بھیجنے کے ساتھ ان کی تواضع کرنا جائز بلکہ بہت بہتر ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں آپ کے سوال کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:

۱: آپ لوگوں کا اپنے کسی قریبی رشتہ دار پر غم کے لئے تین دن تک بیٹھنا جائز ہے۔

۲: لوگوں کی طرف سے ان دنوں میں جو کھانا بھیجا جاتا ہے وہ بھی جائز ہے۔

میت دفن کرنے کے بعد قبر کے پاس سورۃ البقرۃ پڑھنا؟

سوال مجھے ایک ...دوست نے ایک حدیث میسج (Message) کی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جب تم میں سے کوئی مر جائے تو اس کو بند نہ رکھو بلکہ قبر کی طرف اسے جلدی لے جاؤ اور چاہئے کہ دفن کے بعد اس کے سرہانے پڑھا جائے سورۃ بقرہ کا اول بقرہ کا آخر پاؤں کی طرف پڑھا جائے۔ مشکوۃ حدیث نمبر ۱۶۲۵ جلد ۱''

آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ اس حدیث کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آیا یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ (محمد یعقوب مہلو تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک)

الجواب یہ روایت مشکوۃ کے ہمارے نسخے میں بحوالہ شعب الایمان للبیہقی مذکور ہے۔ (ج ا ص ۵۵۹ ح ۱۷۱۷)

شعب الایمان میں اس کی سند درج ذیل ہے:

''أخبرنا علي بن احمد بن عبدان: أخبرنا أحمد بن عبيد الصفار: حدثنا أبو شعيب الحراني: حدثنا يحيى بن عبد الله البابلتي: حدثنا أيوب بن نهيك الحلبي مولى آل سعد بن أبي وقاص قال: سمعت عطاء بن أبي رباح: سمعت عبد الله بن عمر، سمعت النبي صلی اللہ علیہ وسلم يقول...''

(ح ۹۲۹۴، نسخہ جدیدہ محققہ ۸۸۵۴)

یہ روایت ابو شعیب کی سند کے ساتھ المعجم الکبیر للطبرانی (۱۲/۴۴۴ ح ۱۳۶۱۳) اور

القراءة عند القبور للخلال (ح ۲) میں بھی مذکور ہے۔

اس سند میں دو راوی مجروح ہیں:

۱: یحییٰ بن عبداللہ بن الضحاک البابلتی کے بارے میں حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا: "ضعیف" (تقریب التہذیب: ۷۵۸۵)

بیہقی نے فرمایا: "ضعیف" (السنن الکبریٰ ۴/ ۲۹۵)

حافظ ذہبی نے فرمایا: "واہٍ" یعنی ضعیف ہے۔ (المغنی فی الضعفاء ۲/ ۵۲۱ ت ۷۰۰۳)

ہیثمی نے فرمایا: "وهو ضعيف" (مجمع الزوائد ۳/ ۴۴)

ان کے علاوہ متقدمین میں سے ابو حاتم الرازی اور ابن عدی وغیرہما نے بھی اس البابلتی پر جرح کی ہے۔

۲: ایوب بن نہیک الحلبی کے بارے میں ابو حاتم الرازی نے فرمایا: "هو ضعيف الحديث"

ابوزرعة الرازی نے فرمایا: "هو منكر الحديث" (کتاب الجرح والتعدیل ۲/ ۲۵۹ ت ۹۳۰)

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا: "وهو منكر الحديث قاله أبو زرعة..." (فتح الباری ۲/ ۴۰۹ تحت ح ۹۳۰)

حافظ ذہبی نے فرمایا: "تركوه" یعنی وہ متروک ہے۔

(دیوان الضعفاء ۱/ ۱۰۶ ت ۵۳۵، المغنی فی الضعفاء ۱/ ۱۵۱ ت ۸۳۷)

ہیثمی نے فرمایا: "وفيه أيوب بن نهيك وهو متروك ضعفه جماعة و ذكره ابن حبان في الثقات و قال: يخطئ" (مجمع الزوائد ۲/ ۱۸۴)

جمہور کی جرح کے بعد ایوب بن نہیک کا کسی کتاب الثقات میں مذکور ہونا شاذ و غلط ہے اور جمہور کا فیصلہ ہی مقدم ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آپ کی مسئولہ روایت سخت ضعیف و مردود ہے، نیز اس باب میں موقوف روایت بھی عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج کے مجہول الحال ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (۱۱/ اگست ۲۰۱۲ء)

میت دفن کرنے کے بعد کوئی تلقین ثابت نہیں

سوال ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ "جب میت کے دفن سے فارغ ہو جاؤ تو قبر پر کھڑے ہو کر

1: اللہ سے اپنے بھائی کے لیے مغفرت چاہو۔

2: اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو۔

میت کو دفن کر چکنے کے بعد قبر پر یہ پڑھو:

سورۃ البقرۃ آیات ا تا ۵ ا بار

سورۃ البقرۃ آیات ۲۸۵ تا ۲۸۶ ا بار

میت کو جب دفن کر چکو تو قبر پر کھڑے ہو کر کہو:

یا فُلانُ قُلْ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ۳ بار

یا فُلانُ قُلْ رَبِّیَ اللّٰہُ وَ دِیْنِی الْاِسْلَامُ وَنَبِیِّی مُحَمَّدٌ"

کیا مذکورہ باتیں کتاب وسنت سے ثابت ہیں؟ تحقیق سے جواب دیں۔ (نعیم اقبال۔اٹلی)

الجواب اس عبارت میں تین باتوں کا ذکر ہے:

1: مغفرت چاہنا اور ثابت قدمی کی دعا مانگنا۔

یہ دونوں باتیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث سے ثابت ہیں۔

(دیکھئے سنن ابی داود: ۳۲۲۱ وسندہ حسن وصححہ الحاکم ۱/ ۳۷۰ ووافقہ الذہبی)

2: سورۃ البقرۃ کی پہلی اور آخری آیات کا عند القبر پڑھنا۔

یہ روایت السنن الکبریٰ للبیہقی (۴/ ۵۶۔۵۷) وغیرہ میں موقوفاً مروی ہے اور اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج مجہول الحال راوی ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

اس مفہوم کی ایک مرفوع روایت بھی مروی ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی: ۹۲۹۴، المشکوٰۃ: ۱۷۱۷)

لیکن اس کی سند ایوب بن نہیک اور یحییٰ بن عبداللہ البابلتی دو مجروحین کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔

۳: یافلان والی روایت بلوغ المرام (ح ۴۷۱) میں بحوالہ سعید بن منصور مذکور ہے اور اس کی سند میں اشیاخ من أھل حمص سارے کے سارے مجہول ہیں۔

(دیکھئے بلوغ المرام مترجم طبع دارالسلام ج ۱ ص ۴۲۳)

المعجم الکبیر للطبرانی (۲۹۸/۸ ح ۷۹۷۹) میں اس کا ایک ضعیف شاہد بھی ہے، جس میں راویوں کی ایک جماعت مجہول ہے۔ (دیکھئے مجمع الزوائد ۳۲۴/۲)

اس روایت کو حافظ ابن حجر نے "وإسناده صالح و قد قواه الضياء في أحكامه" لکھا ہے۔ (التلخیص الحبیر ۲/ ۱۳۵۔۱۳۶ ح ۷۹۶)

حالانکہ اس کی سند میں محمد بن ابراہیم بن العلاء الحمصی بھی ہے، جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خود لکھا ہے: "منكر الحديث" (تقریب التہذیب ۵۶۹۸)

خلاصہ یہ کہ قبر پر دفن کرنے کے بعد کسی قسم کی تلقین کرنا ثابت نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور وفات سے پہلے تلقین ثابت ہے، لہٰذا شرعی حدود و قیود کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ (۱۹/ رجب ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۰ جون ۲۰۱۲ء)

روزہ، صدقہ فطر اور زکوٰۃ کے مسائل

روزوں کی قضا یا فدیہ؟

سوال اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن وسنت کی دعوت وتبلیغ اور اسلام کی حفاظت کے لئے دراز عمر عطا فرمائے، آمین۔ شیخ صاحب! میں نے اپنے استاد محترم شیخ القرآن والحدیث علامہ عبدالسلام صاحب رستمی السلفی سے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص وفات پا جائے اور ان پر رمضان کے روزوں کی قضا باقی ہو تو اس میت کے ورثاء اس کے لئے روزے رکھ سکتے ہیں، اور اگر کوئی شخص اس میت کے لئے فدیہ دے تو یہ بھی جائز ہے۔ ہاں میت کے لئے روزے رکھنا حدیث مرفوع سے ثابت ہے اور فدیہ والی روایت موقوف ہے۔

لیکن شیخ الحدیث مولانا گوہر رحمن رحمہ اللہ نے فتاویٰ تفہیم المسائل جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۱۴۲ پر دو احادیث نقل کی ہیں کہ ''میت کے لئے نہ کوئی نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ روزے رکھ سکتا ہے۔''

یہ تو ٹھیک ہے کہ نماز کا نہ کوئی فدیہ احادیث میں ثابت ہے اور نہ کوئی شخص ایک میت کے لئے اس کی طرف سے نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص سخت بیمار ہو اور وہ رمضان کے روزے نہ رکھ سکے اور وفات ہو جائے تو اس کے لئے اس کا ولی روزے رکھ سکتا ہے اور شیخ گوہر رحمن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میت کی طرف سے اس کا وارث یا ولی روزے بھی نہیں رکھ سکتا۔

میں شیخ القرآن مولانا عبدالسلام صاحب حفظہ اللہ کی بیان کردہ دو احادیث نبوی ﷺ بھی آپ کے سامنے پیش کروں گا اور شیخ گوہر رحمن رحمہ اللہ کی بیان کردہ دو احادیث بھی پیش کروں گا۔

شیخ زبیر علی زئی صاحب! آپ مہربانی کر کے جانبین کے دلائل جانچ لیں، تطبیق کر دیں، جرح وتعدیل بھی کر دیں اور مسئلے کی راجح صورت بھی مدلل پیش کریں، کیونکہ اس

مسئلہ میں ظاہری تضاد نظر آتا ہے۔

شیخ القرآن علامہ عبدالسلام صاحب کے دو دلائل:

۱) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ((مَنْ مَّاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّه .))

جو شخص مر جائے اور اس پر روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔

(صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۶۲، صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۶۲)

۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میری ماں مر گئی اور اس پر ایک مہینہ کے روزے تھے، کیا میں اس کی طرف سے ان روزوں کو ادا کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تیری ماں پر کچھ قرض ہوتا تو کیا تو اس قرض کو اس کی طرف سے ادا کرتا؟ اس شخص نے جواب دیا ضرور! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قرض ادا کئے جانے کے زیادہ لائق ہے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۶۲)

شیخ گوہر رحمٰن رحمہ اللہ کے دو دلائل تفہیم المسائل سے:

۱) عن ابن عباس رضي الله عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يصلى أحد عن أحد ولا يصوم أحد عن أحد ولكن يطعم عنه .

کوئی شخص دوسرے کی جگہ نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے روزے رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کی جانب سے غریبوں کو کھانا کھلا دیا جائے یعنی فدیہ دیا جائے۔

(سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۲۵۷، مشکل الآثار جلد ۳ ص ۱۴۱، نصب الرایہ از امام زیلعی ج ۲ ص ۴۶۳، وقال ابن حجر: إسناده صحيح، الدرایہ ص ۱۷۷)

۲) عن ابن عمر رضي الله عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يصلين أحد عن أحد ولا يصوم أحد عن أحد إلا ان تصدقت واهديت .

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی جانب سے ہرگز نماز نہ پڑھے اور نہ اس

کی جانب سے روزے رکھے اِلا یہ کہ تو اس کے لئے صدقہ اور قربانی دے سکتا ہے۔
(سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۲۵۷، نصب الرایہ از امام زیلعی ج ۲ ص ۴۶۳، مشکل الآثار ج ۳ ص ۱۴۱، وقال ابن حجر: إسناده صحیح ،الدرایہ ص ۱۷۷)

مہربانی کر کے میرا یہ سوال ضرور ماہنامہ الحدیث حضرو میں شائع کریں۔

(قاری فضل احد، ملاکنڈ)

الجواب سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من مات و علیه صیام صام عنه و لیه .))

''جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزے ہوں، اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے گا۔'' (صحیح بخاری: ۱۹۵۲، صحیح مسلم: ۱۱۴۷، ترقیم دارالسلام: ۲۶۹۲)

اس حدیث میں ''اس پر روزے ہوں'' سے مراد نذر کے روزے ہیں، جس کی تین دلیلیں درج ذیل ہیں:

۱: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی تو کہا: اے اللہ کے رسول! میری ماں فوت ہو گئی ہے اور اس پر نذر کے روزے (باقی) ہیں، تو کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ آپ نے فرمایا: ''تمھارا کیا خیال ہے اگر تمھاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا کر دیتیں، تو یہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟'' اس نے کہا: جی ہاں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ((فصومي عن أملك .)) ''پس تم اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھو۔'' (صحیح مسلم: ۱۱۴۸، ترقیم دارالسلام: ۲۶۹۶)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ایک عورت نے سمندری سفر کیا تو ایک مہینہ روزے رکھنے کی نذر مانی، پھر وہ روزے رکھنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی تو اس کی بہن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے حکم دیا کہ وہ اس (اپنی بہن) کی طرف سے روزے رکھے۔ (السنن الصغریٰ للنسائی، کتاب الأیمان والنذور، من نذر أن یصوم ثم مات قبل أن یصوم ج ۷ ص ۲۰ ح ۳۸۴۷ عن ابن عباس رضي الله عنه وسنده صحیح، وصححه ابن

خزیمہ: ۲۰۵۴)

امام ابوداود نے اس مفہوم کی ایک روایت (ح ۳۳۰۸ وھو حدیث صحیح) پر "باب قضاء النذر عن المیت" کا باب باندھا ہے۔ (طبع دارالسلام ص ۴۷۹ـ۴۸۰)

ظاہر ہے کہ حدیث، حدیث کی تشریح کرتی ہے، لہٰذا حدیثِ مذکور سے مراد نذر کے روزے ہیں۔

۲: حدیثِ مذکور کی راویہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: "میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اُن پر رمضان کے روزے باقی تھے، کیا میں اُن کی طرف سے ان روزوں کی قضا رکھ سکتی ہوں؟" تو انھوں نے جواب دیا: نہیں، لیکن ان کی طرف سے ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دو، یہ اس کی طرف سے تمھارے روزے رکھنے سے بہتر ہے۔

(شرح مشکل الآثار للطحاوی طبعہ جدیدہ ۶/ ۱۷۸، وسندہ حسن وصححہ ابن الترکمانی فی الجوہر النقی ۴/ ۲۵۷)

راویۂ حدیث رضی اللہ عنہا کے اس فتوے سے یہی ظاہر ہے کہ میت کی طرف سے عام روزے نہیں رکھے جائیں گے، بلکہ صرف نذر کے روزے رکھنا جائز ہے۔

دوسری حدیث کے راوی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" لا یصلّي أحد عن أحد و لا یصوم أحد عن أحد و لکن یطعم عنه مکان کل یوم مدًّا من حنطة ." کوئی شخص کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور کوئی شخص کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے، لیکن ہر دن کے (روزے کے) بدلے میں اس کی طرف سے گندم کا ایک مُد کھانا کھلائے۔

(السنن الکبریٰ للنسائی ۲/ ۱۷۵ ح ۲۹۱۸ وسندہ صحیح وصححہ الحافظ ابن حجر في الدرایة ۱/ ۲۸۳ ح ۳۷۵)

ایک مُد ۵۳ تولے وزن کا ایک پیمانہ ہے۔

۳: امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ دونوں نے فرمایا: " إذا کان علی المیت نذر صیام یصوم عنه و إذا کان علیه قضاء رمضان أطعم عنه . "

اگر میت پر نذر کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے روزے رکھے اور اگر رمضان کی قضا باقی ہو تو اس کی طرف سے روزوں کا فدیہ کھلائے۔

(سنن ترمذی: ۷۱۸ واللفظ لہ، مسائل الامام احمد واسحاق، روایۃ اسحاق بن منصور الکوسج ۲۸۸/۱ فقرہ: ۶۷۹)

امام ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی (متوفی ۶۵۶ھ) نے فرمایا:

" وقال به أحمد والليث و أبو عبيد إلا أنهم خصصوه بالنذر . "

اور اس حدیث کے مطابق احمد (بن حنبل) لیث (بن سعد) اور ابوعبید کا قول ہے، الا یہ کہ انھوں نے اس حدیث کی تخصیص نذر کے روزوں کے ساتھ کی ہے۔

(المفہم ج ۳ ص ۲۰۸ تحت ح ۱۰۱۴)

حدیث ابن عباس، راویانِ حدیث کے فتاویٰ اور سلف صالحین کے فہم سے ثابت ہوا کہ جواب کے شروع میں مذکور حدیث سے مراد یہ ہے کہ میت کے ورثاء صرف اس صورت میں میت کی طرف سے روزے رکھ سکتے ہیں جب اس پر نذر کے روزے باقی ہوں، رہے رمضان کے روزے تو یہ میت کی طرف سے نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ہر روزے کے بدلے میں فدیہ کھلایا جائے گا۔

جناب گوہر رحمٰن صاحب نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب جس مرفوع روایت کا حوالہ سنن کبریٰ از بیہقی، مشکل الآثار، نصب الرایہ اور الدرایہ سے پیش کیا ہے تو عرض ہے کہ ان تمام کتابوں میں یہ روایت "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے الفاظ کے ساتھ نہیں، بلکہ صرف سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے، لہٰذا اسے مرفوع یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے طور پر بیان کرنا غلط ہے اور زیلعی حنفی نے بھی لکھا ہے کہ "غریب مرفوعًا" یعنی اس کا مرفوع ہونا معلوم نہیں ہے۔ (دیکھئے نصب الرایہ ۴۶۳/۲)

آپ نے گوہر رحمٰن صاحب کی بیان کردہ دونوں روایات "تفہیم المسائل حصہ اول" سے نقل کی ہیں، یہ میرے نسخے کے صفحہ ۱۲۳۔۱۲۴ پر ہیں۔ (طبع جنوری ۱۹۹۳ء)

گوہر رحمٰن صاحب کو بڑی غلطی لگی، انھوں نے موقوف کو مرفوع، یعنی صحابی کے فتوے

کو نبی ﷺ کی حدیث بنا ڈالا ہے۔

تنبیہ: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوے والی روایت کی سند صحیح ہے، جیسا کہ فقرہ نمبر ۲ کے تحت گزر چکا ہے۔

گوہر رحمٰن صاحب نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب مرفوع روایت مشکل الآثار، سنن کبریٰ از بیہقی، نصب الرایہ اور الدرایہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔

(تفہیم المسائل ج ا ص ۱۲۴)

حالانکہ ان چاروں کتابوں میں یہ مرفوع روایت موجود نہیں بلکہ عبدالرزاق وغیرہ نے اسے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول اور فتوے کے طور پر نقل کیا ہے۔ (دیکھئے نصب الرایہ ۲/ ۴۶۳)

اور حافظ ابن حجر نے فرمایا: ''الصحیح عن ابن عمر موقوف '' صحیح یہ ہے کہ یہ ابن عمر سے موقوف ہے۔ (الدرایہ ۱/ ۲۸۳ ح ۳۷۵)

فائدہ: مصنف عبدالرزاق والی روایت امام عبدالرزاق کی تدلیس (عن) کی وجہ سے ضعیف ہے۔ امام بیہقی نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ''لا یصوم أحد عن أحد ولکن تصدقوا عنه من ماله الصوم لکل یوم مسکیناً .''
کوئی شخص کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے، لیکن اس کی طرف سے صدقہ کرو، ہر دن کے روزے کے بدلے میں مسکین کو کھانا کھلاؤ۔ (السنن الکبریٰ ۴/ ۲۵۴ وسندہ صحیح)

اس روایت کی سند صحیح ہے اور امام مالک نے بغیر کسی سند کے متن میں اضافے والی روایت کو موطأ میں نقل کیا ہے۔ (۱/ ۳۰۳ ح ۶۸۱ وسندہ ضعیف، روایۃ یحییٰ بن یحییٰ)

امام ابو الجہم العلاء بن موسیٰ بن عطیہ الباہلی البغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ثنا لیث بن سعد عن نافع ان عبداللّٰه بن عمر کان یقول :" لا یصم أحد عن أحد ولا یحج أحد عن أحد " کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے روزہ نہ رکھے اور کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے حج نہ کرے۔ (جزء ابی الجہم: ۲۴ وسندہ صحیح)

اس کی سند صحیح ہے اور اس قول میں ''حج نہ کرے'' والی بات محلِ نظر ہے بلکہ احادیث

مرفوعہ صحیحہ کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ دوسرے کی طرف سے حج بدل کرنا جائز ہے، بشرطیکہ حج بدل کرنے والے نے پہلے خود فرض حج کیا ہو۔

حافظ ابن عبدالبر نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کی طرف سے فرض نماز نہیں پڑھے گا۔ (دیکھئے التمہید ۱۳۳/۹)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کے موقوف قول کو گوہر رحمٰن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرار دینا بھی غلط ہے۔ (۲۶/ دسمبر ۲۰۱۰ء)

روزے کی حالت میں سینگی لگوانا

سوال روزے کی حالت میں سینگی لگوانا کیسا ہے؟

ایک حدیث میں ہے کہ سینگی لگانے والے اور لگوانے والے دونوں نے افطار کیا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی؟ (نوید شوکت۔ڈربی، برطانیہ)

الجواب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: " احتجم النبي صلی اللہ علیہ وسلم وھو صائم." نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی۔ (صحیح البخاری: ۵۶۹۴)

سینگی یعنی پچھنے لگوانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے جسم پر پچھنے لگا کر سینگی وغیرہ کے ذریعے سے خون نکالنا تاکہ بیماری کا علاج ہو جائے۔

درج بالا حدیث سے ثابت ہوا کہ روزے کی حالت میں سینگی لگوانا جائز ہے۔

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أفطر الحاجم والمحجوم)) "سینگی لگانے والے اور سینگی لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔" (سنن ابی داود: ۲۳۶۷ وسندہ صحیح وصححہ ابن خزیمہ: ۱۹۶۲۔۱۹۶۳، وابن حبان: ۸۹۹ والحاکم علی شرط الشیخین ۱/ ۴۲۷ ووافقہ الذہبی)

اس مفہوم کی اور بھی بہت سی روایات ہیں، لیکن سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " أول ما کرھت الحجامة للصائم أن جعفر بن أبي طالب رضي اللہ عنه احتجم وھو صائم فمر به النبي صلی اللہ علیہ وسلم فقال: أفطر ھذان، ثم رخص

النبي ﷺ بعد في الحجامة للصائم و كان أنس يحتجم وهو صائم. "
میں نے سب سے پہلے اس وقت روزہ دار کے لئے سینگی لگوانا ناپسند کیا تھا جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی تو وہاں سے نبی ﷺ گزرے اور آپ نے فرمایا: "ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا ہے۔" پھر اس کے بعد نبی ﷺ نے روزہ دار کے لئے سینگی لگوانے کی اجازت دے دی اور انس (رضی اللہ عنہ) روزے کی حالت میں سینگی لگواتے تھے۔

امام دارقطنی نے فرمایا: اس کے سارے راوی ثقہ ہیں اور اس میں کوئی علت (قادحہ) نہیں۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۴/۲۶۸)

اس روایت کی سند میں عبداللہ بن المثنیٰ بن انس جمہور کے نزدیک موثق اور حسن الحدیث راوی ہیں۔ (دیکھئے تحقیقی مقالات ۵/۲۰۷)

خالد بن مخلد بھی موثق عندالجمہور اور حسن الحدیث ہیں، لہٰذا یہ سند حسن لذاتہ ہے اور حافظ ابن عبدالہادی وغیرہ کی اس پر جرح صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " لا بأس بالحجامة للصائم " روزے دار کے لئے سینگی لگوانے میں کوئی حرج نہیں۔ (صحیح ابن خزیمہ: ۱۹۸۱، وسندہ حسن)

اس اثر کے راوی امام نعیم بن حماد موثق عندالجمہور ہونے کی وجہ سے حسن الحدیث ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " الافطار مما دخل وليس مما خرج ... "
داخل ہونے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور نکلنے سے نہیں ٹوٹتا۔

(الاوسط لابن المنذر ۱/۱۸۵ ث ۸۱ وسندہ صحیح)

نیز دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۳/۵۱ ح ۹۳۱۹ من رخص للصائم أن يحتجم)

عکرمہ رحمہ اللہ نے فرمایا: روزے دار کے لئے سینگی لگوانے میں کوئی حرج نہیں۔

(ابن ابی شیبہ ۳/۵۳ ح ۹۳۳۳ ملخصاً وسندہ صحیح)

عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ روزے کی حالت میں سینگی لگواتے تھے۔

(ایضاً ح ۹۳۴۴ وسندہ صحیح)

اس باب کی تمام روایات کو مدنظر رکھ کر خلاصۃ التحقیق یہی ہے کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹنے والی روایت منسوخ ہے اور امام شافعی وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

نیز دیکھئے الاعتبار فی بیان الناسخ والمنسوخ من الآثار (ص ۱۴۱)

فائدہ: اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ روزے کی حالت میں علاج کے لئے جسم سے خون نکلوانے یا خون دینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن کمزوری کے ڈر کی وجہ سے بہتر یہی ہے کہ روزے کی حالت میں خون کا عطیہ نہ دیا جائے۔ واللہ اعلم

(۶/ اگست ۲۰۱۳ء بمطابق ۲۷/ رمضان ۱۴۳۴ھ)

صرف ہفتے کے دن کے نفلی روزے کا حکم؟

سوال صرف ہفتے والے دن کے نفلی روزے کا کیا حکم ہے؟

(نوید شوکت، ڈربی۔ برطانیہ)

الجواب سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ اور ان کی بہن صماء المازنیہ وغیرہما سے مروی ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہفتے کے دن کا روزہ نہ رکھو، سوائے اس دن کے جس میں تم پر روزہ فرض ہو اور اگر تمھیں صرف انگور کی ٹہنی کا چھلکا یا کسی درخت کی لکڑی ہی (کھانے کے لئے) ملے تو اسے چبالو۔'' (سنن ابی داود: ۲۴۲۱، سنن ترمذی: ۷۴۴ وقال: ''حسن''، سنن ابن ماجہ: ۱۷۲۶)

اس حدیث کی سند حسن لذاتہ ہے اور اسے ابن خزیمہ (۲۱۶۴) ابن حبان (بسند آخر: ۳۶۰۶) حاکم (۱/ ۴۳۵ ح ۱۵۹۲) اور ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، لیکن امام ابوداود نے فرمایا:

'' هذا الحديث منسوخ '' یہ حدیث منسوخ ہے۔

کئی علماء نے اس دعویٔ نسخ کا انکار کیا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات سے پہلے ''يوم السبت و الأحد'' ہفتے اور اتوار کا روزہ رکھتے تھے اور آپ نے فرمایا: ''یہ مشرکین (یہود ونصاریٰ) کی عید کے دن

ہیں اور میں اُن کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔'' (صحیح ابن خزیمہ: ۲۱۶۷، صحیح ابن حبان: ۳۶۰۷/ ۳۶۱۶)

اس حدیث کی سند حسن لذاتہ ہے اور اسے ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم (۱/ ۴۳۶ ح ۱۵۹۳) اور ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے۔

اس حدیث کے راوی عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب کو درج ذیل محدثین نے ثقہ وصدوق قرار دیا ہے:

۱: دارقطنی قال: ثقة (سوالات البرقانی: ۸۵ ملخصاً)

۲: ابن خزیمہ (تصحیح حدیثہ)

۳: ابن حبان (ایضاً)

۴: حاکم (ایضاً)

۵: ذہبی (ایضاً)

وقال فی الکاشف (۲/ ۱۱۴): '' ثقة''

محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب کو درج ذیل محدثین نے ثقہ وصدوق قرار دیا:

۱: ابن حبان (ذکرہ فی الثقات)

۲: ذہبی، قال فی الکاشف (۳/ ۷۳): '' ثقة''

۳: دارقطنی، قال: ثقة (سوالات البرقانی: ۸۵ ملخصاً)

۴: ابن خزیمہ (تصحیح حدیثہ)

۵: حاکم (ایضاً)

۶: ابن حجر العسقلانی، قال: صدوق (تقریب التہذیب: ۶۱۷۰)

باقی سند بالکل صحیح ہے۔

اس حدیث کو شیخ البانی کا محمد بن عمر بن علی کی وجہ سے ضعیف قرار دینا (الضعیفة: ۱۰۹۹) بہت ہی عجیب وغریب اور غلط ہے۔

اس حسن لذاتہ حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اتوار کے دن کا نفلی روزہ رکھنا

چاہے تو اس کے لئے ہفتے کے دن کا روزہ رکھنا بھی جائز ہے اور ابن خزیمہ، ابن حبان وابن شاہین وغیرہم نے یہی مفہوم سمجھا ہے۔

چونکہ واؤ ترتیب کے لئے ضروری نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص صرف ہفتہ یا صرف اتوار کا روزہ رکھنا چاہے تو بھی اس حدیث کی رُو سے جائز ہے۔

حاکم نیشاپوری نے اس حدیث کو سابق حدیث کے معارض قرار دیا ہے، لہٰذا معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ اسی دوسری بات کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم

محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی نے بھی لکھا ہے: ''وظاهره صوم كل على الانفراد والاجتماع'' اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں دنوں کا انفرادی اور اجتماعی روزہ رکھنا جائز ہے۔ (سبل السلام ص ۴۷۶ ح ۶۸۳)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ روزہ داود (علیہ السلام) کا روزہ ہے، آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔''

(صحیح بخاری: ۱۱۳۱، صحیح مسلم: ۱۱۵۹، ملخصاً)

اس حدیث سے صرف ہفتے کے دن روزہ رکھنے کا جواز ثابت ہے، اور بعض علمائے معاصرین نے بھی اس سے ایسا ہی استدلال کیا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ امام زہری نے ہفتے کے دن کے بارے میں فرمایا: اس کے روزے میں کوئی حرج نہیں۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ۲/۸۱)

اس روایت کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

۱: طحاوی کے استاد محمد بن حمید بن ہشام کا ثقہ وصدوق ہونا ثابت نہیں۔

۲: عبداللہ بن صالح کاتب اللیث سے صرف وہی روایت صحیح یا حسن ہوتی ہے جو حدیث کے ماہر ثقہ اماموں (حذاق) نے بیان کی ہو اور یہ اُن روایات میں سے نہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارے میں امام زہری نے فرمایا: یہ حمصی حدیث ہے۔ (المستدرک ۱/۴۳۶)

یہ سند محمد بن اسماعیل بن مہران النیسابوری کے اختلاط کی وجہ سے مشکوک ہے۔

تمام دلائل مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف ہفتے کے دن کا روزہ نہ رکھا جائے اور یہی بہتر ہے، اگر کوئی شخص مخالفتِ یہود وغیرہ کی وجہ سے یہ روزہ رکھ لے تو جائز ہے۔ واللہ اعلم (۵/ اگست ۲۰۱۳ء)

صدقۂ فطر اجناس کے بجائے قیمت (نقدی) کی صورت میں دینا؟

سوال کیا صدقۂ فطر اجناس کے بجائے قیمت میں دے سکتے ہیں؟ اور کتنے دن پہلے صدقۂ فطر دینا چاہیے؟ (نوید شوکت۔ ڈربی، برطانیہ)

الجواب سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کھانے (غلے) جو یا کھجور میں سے ایک صاع بطورِ صدقۂ فطر نکالتے تھے، پھر جب معاویہ (بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ) مدینے آئے تو انھوں نے کہا: میرا خیال ہے کہ شامی گندم کے دو مد (آدھا صاع) کھجور کے ایک صاع کے برابر ہیں، تو لوگوں نے اسے اختیار کر لیا۔

ابوسعید نے فرمایا: میں تو اسی طرح ایک صاع نکالتا رہوں گا۔

(صحیح بخاری: ۱۵۰۵۔ ۱۵۰۶، ۱۵۰۸، صحیح مسلم: ۹۸۵، سنن الترمذی: ۶۷۳ وقال: ھذا حدیث حسن صحیح)

اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدقۂ فطر اجناس سے ایک صاع نکالنا چاہیے۔ امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔

بعض اہلِ علم مثلاً: سفیان ثوری اور امام عبداللہ بن المبارک وغیرہما نے اجتہاد کرتے ہوئے نصف صاع گندم کا قول اختیار کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل صدقۂ فطر کی قیمت نکالنا ناپسند کرتے اور فرماتے تھے: مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی شخص قیمت دے گا تو اس کا صدقۂ فطر ہی جائز نہیں ہوگا۔

(مسائل عبداللہ بن احمد بن حنبل: ۸۰۹)

جبکہ دوسری طرف خلیفہ عمر بن عبدالعزیز الاموی رحمہ اللہ نے بصرے میں عدی کی طرف لکھ کر بھیجا کہ ہر انسان سے آدھا درہم لیا جائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۱۷۴ ح ۱۰۳۵۸، وسندہ صحیح)

قرہ بن خالد السدوسی کے پاس عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے اسی مفہوم کی کتاب (تحریر) پہنچی تھی۔ (ایضاً ح ۱۰۳۶۹، وسندہ صحیح)

زہیر بن معاویہ کی روایت ہے کہ ابو اسحاق السبیعی رحمہ اللہ (تابعی) نے فرمایا: میں نے فطرانہ رمضان میں لوگوں کو کھانے کی قیمت ادا کرتے ہوئے پایا ہے۔ (ایضاً ح ۱۰۳۷۱)

ان آثار کی رُو سے صدقۂ فطر میں نقدی (روپے وغیرہ) دینا جائز ہے اور یہ جواز بھی صرف ان لوگوں سے خاص سمجھنا چاہئے جو یورپ (مثلاً برطانیہ) اور امریکہ وغیرہما میں رہتے ہیں، تاکہ غریب ممالک (مثلاً پاکستان، ہندوستان) میں ان کے مسکین رشتہ داروں کے ساتھ تعاون اور طعمۃ للمساکین ہو جائے، ورنہ بہتر یہی ہے کہ اجناس مثلاً گندم، آٹا اور کھجور وغیرہ سے صدقۂ فطر ادا کیا جائے، اور پاکستان میں ہمارا اسی پر عمل ہے۔

نیز دیکھئے میری کتاب: توضیح الاحکام (۲/۱۶۴۔۱۶۵) [۶/ اگست ۲۰۱۳ء]

کئی سالوں کی بقیہ زکوٰۃ

سوال کسی کے پاس سونا چاندی تین چار سال سے اتنا ہے کہ اس پر زکوٰۃ دینا (ضروری) بنتی ہے، لیکن اس نے نہیں دی۔ اب سمجھ آ گئی اور وہ زکوٰۃ دینا چاہتی ہے تو کس ریٹ کے مطابق زکوٰۃ دے؟ موجودہ ریٹ یا پچھلے سالوں کی اُن کے ریٹ کے مطابق؟

الجواب موجودہ سال کی موجودہ ریٹ (سونے چاندی کی قیمت) کے مطابق اور سابقہ سالوں کی زکوٰۃ ان سالوں میں سونے چاندی کی قیمت کے مطابق ادا کرے اور سچے دل سے توبہ کرے، استغفار کرے اور بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

یاد رہے کہ ہر سال کی زکوٰۃ سے مراد اسلامی سال کی زکوٰۃ ہے، جو محرم سے شروع ہو کر ذوالحجہ کی آخری تاریخ پر ختم ہو جاتا ہے اور اسے قمری سال بھی کہتے ہیں، لہٰذا اس بات کا خاص خیال رکھیں اور انگریزی (شمسی) سال کا حساب لگا کر زکوٰۃ نہ دیں بلکہ چاند والے سال کا حساب لگا کر (مثلاً رمضان وغیرہ میں) زکوٰۃ دیں اور اس طرح شمسی سال کے مقابلے میں قمری سال میں چھتیس سال پر ایک سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔

نکاح وطلاق کے مسائل

ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا

سوال ایک لڑکی کسی مشکل میں ایک جاننے والے سے مدد حاصل کرتی ہے اور وہ شخص اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس لڑکی کو ڈرا دھمکا کر اس سے نکاح کر لیتا ہے۔ لڑکی نہ تو اس کی فیملی سے ہے نہ ہی علاقہ سے۔ دولت، حسن اور تعلیم میں بھی لڑکی لڑکے سے افضل ہے۔ نکاح کے دوران لڑکی کے خاندان میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ لڑکا پہلے سے شادی شدہ بھی ہے۔ لڑکی نکاح سے انکار کرتی ہے تو لڑکا اسے خاندان میں بے عزت کرنے اور جان سے مارنے کی دھمکی وغیرہ دیتا ہے۔ اس موقع پر لڑکی کو اپنے گھر اور علاقہ کا اتا پتہ معلوم نہیں اور وہ مکمل لڑکے کے کنٹرول میں ہے۔ وہ لڑکا اسے ایک ہی صورت میں گھر چھوڑ کے آنے پر راضی ہے: جب وہ نکاح کے لئے ہاں کرتی ہے۔ لڑکی کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ زبردستی نکاح کیا گیا اور وہ دل اور دماغ سے کبھی اس نکاح کو نہیں مانتی۔ آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ مندرجہ بالا صورت میں زبردستی کیا گیا نکاح جائز ہے یا ناجائز۔

الجواب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت بھی اپنے ولی کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔'' (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷/ ۱۰۵، وسندہ حسن والحدیث صحیح، سنن ابی داود: ۲۰۸۳، سنن الترمذی: ۱۱۰۲، وقال: ''ھذا حدیث حسن'' صحیح ابن حبان: ۴۰۷۴، وصححہ الحاکم علیٰ شرط الشیخین ۲/ ۱۶۸)

اس روایت کے بہت سے شواہد بھی ہیں، بلکہ علامہ سیوطی نے اسے متواتر قرار دیا ہے۔

(دیکھئے قطف الازھار: ۸۷)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' لا نکاح إلا بولي مرشد أو سلطان''

خیر خواہ ولی یا سلطان کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ (الاوسط لابن المنذر ۸/ ۲۶۴ ح ۷۱۸۳ وسندہ حسن)

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہم کا یہی قول ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ (دیکھئے سنن الترمذی: ۱۱۰۲)

لہٰذا ثابت ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں اس لڑکی کا نکاح نہیں ہوا۔ (۲۴/ مارچ ۲۰۱۳ء)

نکاح سے پہلے فریقین کی شرائط

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے کرام شرع دین متین اس مسئلے میں کہ اگر کوئی صاحب اپنے نکاح کے وقت مہر میں مبلغ بیس ہزار روپے دینا چاہتا ہے اور لڑکی والے ساتھ یہ شرط رکھیں کہ شادی کے بعد جب بھی اللہ رب العالمین آپ کو استطاعت دے تو لڑکی کو پانچ تولہ سونا بنا کر دیں گے۔ کیا یہ شرط از روئے قرآن وسنت صحیح ہے یا غلط ہے؟ مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔ (محمد نسیم سلفی، پشاور)

الجواب قرآنِ مجید میں ہے کہ مدین والے (نیک شخص) نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ﴾ ''میں چاہتا ہوں کہ دو بچیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کردوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو۔'' (القصص: ۲۷)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ لڑکی کے ولی کو نکاح کی شرائط کا اختیار حاصل ہے۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ﴾ ''اور تم پر کوئی گناہ نہیں اُس میں جس پر تم مقرر کیے ہوئے حق مہر کے بعد باہم راضی ہو جاؤ۔'' (النسآء: ۲۴)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((أحق ما أوفیتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج)) ''تم پر یہ ضروری ہے کہ وہ شرطیں پوری کرو، جن کے ساتھ تم نے نکاح کیے ہیں۔'' (صحیح بخاری: ۵۱۵۱، باب الشروط فی النکاح)

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ نکاح میں جائز شرطیں قائم کرنا جائز ہے اور امام بخاری کی تبویب بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ سوالِ مذکور کی شرط میرے علم کے مطابق نہ کسی آیت کے خلاف ہے اور نہ کسی حدیث کے خلاف ہے، لہٰذا قرآن وحدیث کی رُو سے بالکل جائز ہے۔ یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ شادی کرنے والے مرد یا اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کو

یہ شرط منظور ہے یا نہیں؟ اور اگر منظور نہیں تو ہو سکتا ہے کہ نکاح ہی رہ جائے۔ بہتر یہ ہے کہ فریقین آپس میں صلح صفائی سے معاملہ طے کرلیں اور اسی میں خیر ہے۔

وماعلینا إلاالبلاغ (۴/اپریل ۲۰۱۱ء)

کیا شادی کرنے سے غربت دور ہو جاتی ہے؟

سوال سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جاء رجل إلی النبي ﷺ يشكو إليه الفاقة، فأمره أن يتزوّج''

نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور فاقے کی شکایت کی، تو آپ (ﷺ) نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (ابومحمد خرم شہزاد، شیخوپورہ)

الجواب یہ روایت تاریخ بغداد میں درج ذیل سند سے موجود ہے:

''أخبرنا محمد بن الحسين القطان قال: نبأنا عبدالباقي بن قانع قال: نبأنا محمد بن أحمد بن نصر الترمذي قال: نبأ إبراهيم بن المنذر قال: نبأنا سعيد بن محمد مولى بني هاشم قال: نبأنا محمد بن المنكدر عن جابر.''

(ج ۱ص ۳۶۵ ت ۳۰۷ محمد بن احمد بن نصر الترمذی)

اس روایت کے راوی ابوعثمان سعید بن محمد بن ابی موسیٰ المدنی کے بارے میں محدثین کرام کی گواہیاں درج ذیل ہیں: ۱: امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حديثه ليس بشيء'' اس کی حدیث کوئی چیز نہیں۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۴/ ۵۸ ت ۲۵۷)

۲: حافظ ابن حبان البستی نے طویل کلام کے بعد فرمایا:

''لايجوز الاحتجاج بخبره إذا انفرد.''

جب یہ منفرد (اکیلا) ہو تو اس کی روایت سے حجت پکڑنا جائز نہیں۔

(کتاب المجروحین ج ۱ص ۳۲۶، دوسرا نسخہ ج ۱ص ۴۱۰)

۳: حافظ ابن الجوزی نے اس راوی کو کتاب الضعفاء والمتروکین میں ذکر کیا۔

(۳۲۵/۱ ت ۱۴۳۵)

۴: حافظ ذہبی نے اسے دیوان الضعفاء والمتروکین میں ذکر کیا۔ (۳۳۲/۱ ت ۱۶۴۷)

حافظ ذہبی نے شادی والی روایت مذکورہ کو ''لیس حدیثه بشيء'' کے تحت درج کیا، یعنی دوسرے الفاظ میں یہ روایت اُن (حافظ ذہبی) کے نزدیک منکر ہے۔

(دیکھئے میزان الاعتدال ۱۶۵/۲ ت ۳۲۶۲)

لسان المیزان میں بھی اس راوی کا ذکر بطورِ جرح مذکور ہے۔ (ج ۳ ص ۴۱، دوسرا نسخہ ۲۹۰/۳)

اس راوی کے بارے میں کوئی ادنیٰ لفظِ توثیق میری نظر سے نہیں گزرا اور درج بالا جرح کی رو سے سعید بن محمد المدنی سخت ضعیف و مجروح راوی ہے۔

اس روایت کا ایک اور راوی عبدالباقی بن قانع البغدادی بھی تحقیقِ راجح میں اختلاط کی وجہ سے ضعیف ہے۔ خلاصۃ التحقیق یہ ہے کہ روایت مذکورہ سخت ضعیف و مردود ہے۔

جمہور محدثین نے اس پر جرح کی اور خطیب بغدادی کے نامعلوم شیوخ کی توثیق کا یہاں کوئی اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم

بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ بعض خطیب حضرات ایک روایت بڑے مزے لے لے کر اور ترنم سے بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر غربت کی شکایت کی تو آپ نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا۔ شادی کے بعد وہ آیا اور کہا: میں پہلے سے زیادہ غریب ہو گیا ہوں۔ آپ ﷺ نے اسے دوسری شادی کا حکم دیا۔ وہ اور زیادہ غریب ہو گیا تو آپ ﷺ نے اسے تیسری شادی کا حکم دیا۔ پھر اسے چوتھی شادی کا حکم دیا تو اس نے چوتھی شادی بھی کر لی اور اس کے بعد اس کی غربت ختم ہو گئی، وہ امیر ہو گیا۔ ان الفاظ میں قصہ گو خطیبوں کی اس روایت کا مفہوم بیان کیا گیا ہے اور میرے علم کے مطابق یہ بالکل جھوٹی روایت ہے، اس کی کوئی سند یا حوالہ ہمیں کہیں نہیں ملا اور ظاہر یہی ہوتا ہے کہ اسے قصہ گو لوگوں یا جھوٹے مقررین میں سے کسی نے گھڑا ہے۔ واللہ اعلم (۱۴/ مئی ۲۰۱۲ء)

اگر شرائطِ نکاح میں طلاق کا اختیار بیوی کو دے دیا جائے تو؟

سوال ایک لڑکی (س) کی شادی ایک لڑکے (ف) کے ساتھ ہوئی۔ لڑکی والوں کے مطالبے کی وجہ سے نکاح نامے پر فریقین کی رضامندی کے ساتھ یہ شرط لکھ دی گئی کہ اس نکاح میں لڑکے (ف) نے لڑکی (س) کو (شریعت کے مطابق) تین طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے۔ اس نکاح نامے پر لڑکے اور گواہوں نے دستخط کر دیے۔
بعد میں ثابت ہوا کہ لڑکا دھوکا باز اور ظالم انسان ہے اور اس نے ایک بدکردار لڑکی سے ناجائز تعلقات قائم کئے اور پھر خفیہ شادی کر لی۔
کیا یہ لڑکی (س) اب اپنے اختیار کو استعمال کر کے اپنے شوہر کو شریعت کے مطابق طلاق دے سکتی ہے؟ (ایک سائل، نکیم موڑ لاہور)

الجواب جی ہاں! ایسی صورت میں "أمرك بيدك" کے حکم کی رو سے وہ طلاق کا حق استعمال کر کے ایسے بُرے شوہر سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "إذا قال الرجل لامرأته أمركِ بيدك أو استفلحي بأمرك أو وهبها لأهلها فقبلوها فهي واحدة بائنة"
اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے: تیرا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے، یا تم اپنے معاملے میں کامیاب ہو جاؤ، یا وہ اس (حق) کو اس بیوی کے گھر والوں کے حوالے کر دے، پھر وہ اسے قبول کر لیں تو یہ ایک (طلاق) بائن (نکاح کو ختم کر دینے والی) ہے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی ۹/ ۳۷۹ ح ۹۶۲۷ وسندہ حسن)

ابوالحلال العتکی رحمہ اللہ (ثقہ) سے روایت ہے کہ وہ (سیدنا) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے پاس وفد میں آئے تو کہا: ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اس کا اختیار دے دیا ہے؟
انھوں نے فرمایا: "فأمرها بيدها" پس اس عورت کا اختیار اس عورت کے ہی پاس ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۵/ ۶۲ ح ۱۸۰۷۱، وسندہ صحیح سنن سعید بن منصور ۱/ ۳۷۲ ح ۱۶۱۵)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو اس کا اختیار دے دیا تو انھوں نے فرمایا: ''القضاء ما قضت فإن تناکرا حلف''

وہ عورت جو فیصلہ کرے گی وہی فیصلہ ہے، پھر اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا انکار کریں تو مرد کو قسم دی جائے گی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ نسخہ محمد عوامہ ۹/۵۸۱ ح ۱۸۳۸۸، وسندہ صحیح، نیز دیکھئے سنن سعید بن منصور ۱/۳۷۴ ح ۱۶۲۰، وسندہ صحیح)

یہاں پر چونکہ یہ اختیار نکاح نامے پر شوہر کے دستخطوں اور گواہوں کے ساتھ لکھا ہوا ہے، لہٰذا یہاں کسی قسم کے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے کہ وہ عورت جو فیصلہ کرے گی وہی فیصلہ نافذ ہوگا۔

(دیکھئے سنن الترمذی: ۱۱۷۸، باب ما جاء فی أمرک بیدک)

ان آثار کو مدنظر رکھ کر یہی فیصلہ ہے کہ مذکورہ عورت (س) اگر اپنے آپ کو تین طہروں میں تین دفعہ طلاق دے گی تو طلاق نافذ ہو جائے گی اور س اور ف کے درمیان جدائی واقع ہو جائے گی۔

صورتِ مسؤلہ میں س کا شوہر ف پورا حق مہر ادا کرنے اور شروط پورا کرنے کا پابند ہوگا۔

چند مزید فوائد حسبِ مطالبہ پیشِ خدمت ہیں:

۱: جو عورت اپنے شوہر سے خلع لے لے تو یہ فسخ ہوتا ہے۔

(دیکھئے کتاب الام للامام الشافعی ج ۵ ص ۱۱۴، ماہنامہ الحدیث حضرو: ۶۸ ص ۹)

لہٰذا اگر وہ دونوں بعد میں دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو یہ جائز ہے۔

فسخ کا مطلب ہے کہ نکاح (بغیر طلاق کے) ٹوٹ گیا۔

۲: جو عورت اپنے شوہر سے خلع لے تو اس کی عدت ایک مہینہ ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہے۔

(دیکھئے سنن الترمذی: ۱۱۸۵م، الحدیث حضرو: ۶۸ ص ۷۔۸)

۳: ماں اپنی اولاد (بچے یا بچیوں) کی زیادہ حقدار ہے، بشرطیکہ وہ دوسرا نکاح نہ کرے،

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أنتِ أحق به مالم تنكحي)) "تو اس بچے کی زیادہ حقدار ہے جب تک تو دوسرا نکاح نہ کرے۔"

(سنن ابی داود: ۲۲۷۶، مستدرک الحاکم ۲/ ۲۰۷ وصححہ الحاکم ووافقہ الذہبی وھو حدیث حسن، مسند احمد ۲/ ۱۸۲، ۲۰۳)

بعض حالتوں میں بچوں کو اختیار بھی دیا جا سکتا ہے کہ اگر ماں کے ساتھ رہنا چاہیں تو رہیں اور اگر باپ کے ساتھ رہنا چاہیں تو رہیں۔

(دیکھئے سنن ابی داود: ۲۲۷۷ وسندہ صحیح، سنن الترمذی: ۱۳۵۷، وقال: حسن صحیح)

۴: اگر لڑکے یا لڑکی کی طرف سے ایک دوسرے کو دھوکا دیا گیا ہو اور دھوکے کی شادی کی گئی ہو تو حرام فعل ہے اور ایسا کرنے والا گناہگار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ومن غشنا فليس منا)) "اور جس نے ہمیں دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (صحیح مسلم: ۱۰۱/ ۲۸۳)

۵: نکاح کے وقت فریقین جو شرائط طے کریں، اُن کا پورا کرنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أحق ما أوفيتم من الشروط أنّ توفوا به ما استحللتم به الفروج.))

"تمام شرطوں میں وہ شرطیں سب سے زیادہ پوری کی جانے کے لائق ہیں جن کے ذریعے سے تم نے شرمگاہوں کو حلال کیا ہے۔ یعنی نکاح کی شرطیں ضرور پوری کرنی ہوں گی۔"

(صحیح بخاری: ۵۱۵۱، مترجم مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ ج ۶ ص ۵۵۶)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے داماد ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو فرمایا:

((حدثني فصدقني ووعدني فوفى لي.))

"اس نے میرے ساتھ باتیں کیں تو سچ کہا اور وعدہ کیا تو اسے پورا کیا۔" (صحیح بخاری: ۳۷۲۹)

وما علينا إلا البلاغ (۱/ فروری ۲۰۱۳ء)

متعۃ النساء حرام ہے

سوال ایک شیعہ نے سوال پوچھا ہے کہ متعہ حرام ہے تو لونڈی سے بغیر نکاح کئے ہم بستری کرنا، کیا جائز کام ہے؟ (محمد انور، راولپنڈی)

الجواب امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب اور حسن بن محمد بن علی بن ابی طالب دونوں سے روایت بیان کی، اُن دونوں نے اپنے والد (امام) محمد بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ (ابن الحنفیہ) سے روایت بیان کی، انھوں نے اپنے والد (سیدنا امیر المومنین) علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ

''أن رسول اللہ ﷺ نھی عن متعۃ النساء یوم خیبر.'' ''بے شک رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن عورتوں کے متعہ سے منع فرما دیا۔ (موطأ امام مالک روایۃ یحییٰ ۵۴۲/۲ ح ۱۱۷۸، روایۃ ابن القاسم بتحقیقی: ۲۴ وسندہ صحیح، الزہری صرح بالسماع، کتاب الام للشافعی ۷۹/۵ ح ۱۶۳۴، مسند احمد ۷۹/۱ ح ۵۹۲، صحیح بخاری: ۵۱۱۵ باختلاف یسیر وسندہ صحیح، صحیح مسلم: ۱۴۰۷، ترقیم دارالسلام: ۳۴۳۱)

اس حدیث کے راوی محمد بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ (عرف ابن الحنفیہ): ''ثقۃ عالم'' تھے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۶۱۵۷)

مامقانی شیعہ نے بھی انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ دیکھئے تنقیح المقال (ج ۱ ص ۱۳۳ ت ۱۰۴۳۳)

عبداللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ ثقہ تھے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۳۵۹۳)

انھیں ابن سعد، امام عجلی اور حافظ ابن حبان وغیرہم نے ثقہ کہا ہے۔ دیکھئے طبقات ابن سعد (۳۲۸/۵) تاریخ العجلی (۸۸۱) اور کتاب الثقات لابن حبان (۲/۷)

حسن بن محمد بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ ثقہ فقیہ تھے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۱۲۸۴)

انھیں امام عجلی (الثقات/ التاریخ: ۲۸۶) اور حافظ ابن حبان (الثقات ۱۲۲/۴) نے ثقہ قرار دیا۔ امام دارقطنی نے فرمایا: ''وھو صحیح الحدیث'' اور وہ صحیح حدیثیں بیان کرنے والے تھے۔ (المؤتلف والمختلف ۷۴۸/۲)

امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ نے عبداللہ اور حسن دونوں سے ''أخبرني'' کہہ کر سماع کی تصریح کر دی۔ (دیکھئے صحیح بخاری:۵۱۱۵)

اس صحیح حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سی صحیح حدیثوں سے شیعوں والے متعہ (متعۃ النساء) کا حرام ہونا ثابت ہے۔ مثلاً:

۱) سیدنا سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (فتح مکہ کے بعد) اوطاس والے سال تین (دن) متعہ کی اجازت دی، پھر اس کے بعد اس سے منع کر دیا۔

(صحیح مسلم:۱۴۰۵، ترقیم دارالسلام:۳۴۱۸)

۲) سیدنا سبرہ بن معبد الجہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یا أیها الناس !إني قد كنتُ أذنتُ لكم في الإستمتاع من النساء و إنّ اللّٰه قد حرّم ذلك إلى یوم القیامة .))'' اے لوگو! میں نے تمھیں عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور بے شک اللہ نے اُسے قیامت کے دن تک حرام قرار دیا ہے۔'' (صحیح مسلم:۱۴۰۶، ترقیم دارالسلام:۳۴۲۲)

یہ حدیث انھوں (سیدنا سبرہ رضی اللہ عنہ) نے (بیت اللہ) کے رکن اور دروازے کے پاس بیان کی تھی۔

۳) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نکاح، طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو حرام اور ختم کر دیا ہے۔

(صحیح ابن حبان، الاحسان: ۴۱۳۷ وسندہ حسن، دوسرا نسخہ: ۴۱۴۹، الموارد: ۱۲۶۷)

اس حدیث کے راوی مؤمل بن اسماعیل رحمہ اللہ جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے، لہٰذا ان پر جرح مردود ہے اور ان کی حدیث امام سفیان ثوری سے صحیح اور دوسروں سے حسن لذاتہ ہوتی ہے۔ (دیکھئے میری کتاب: علمی مقالات ج ۱ ص ۴۱۷۔۴۲۶)

٤) امام سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے (سیدنا) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے متعہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: حرام ہے۔ اُس نے کہا: فلاں تو

اس میں یہ کہتا ہے۔پس انھوں (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: "واللّٰہ!لقد علم أن رسول اللّٰہ ﷺ حرّمھا یوم خیبر و ما کنا مسافحین." "اللہ کی قسم!وہ جانتا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے اسے خیبر والے دن حرام قرار دیا تھا اور ہم زانی نہیں تھے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۷/۲۰۲ وسندہ صحیح)

۵) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تین دفعہ متعہ کی اجازت دی تھی، پھر اسے حرام کر دیا۔اللہ کی قسم!اگر مجھے کسی شادی شدہ شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ اُس نے متعہ کیا ہے تو میں اُسے رجم کروں گا...

(سنن ابن ماجہ:۱۹۶۳ وسندہ حسن، البحر الزخار للبزار:۱۸۳)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ متعۃ النساء کو جائز نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ صحیح روایت میں آیا ہے: علی رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی کا ذکر کیا گیا کہ وہ متعۃ النساء کو جائز سمجھتا ہے تو (سیدنا) علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: "إنك امرؤ تائه" "تو بیوقوف آدمی ہے۔(مسند ابی عوانہ ۲/۲۷۶ ح ۳۲۹۸ وسندہ صحیح، السنن الکبریٰ للبیہقی ۷/۲۰۲ وسندہ صحیح، نیز دیکھئے صحیح مسلم:۱۴۰۷، ترقیم دارالسلام:۳۴۳۲)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی عورتوں والے متعہ سے منع کیا۔ (دیکھئے صحیح مسلم:۱۴۰۵، دارالسلام:۳۴۱۷)

سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ بھی متعۃ النساء کے سخت مخالف تھے۔
دیکھئے صحیح مسلم (۱۴۰۶، دارالسلام:۳۴۲۹)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ پہلے متعۃ النساء کو جائز سمجھتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا، لہٰذا اُن کی طرف سے جواز کا فتویٰ منسوخ ہے۔

مشہور ثقہ تابعی امام ربیع بن سبرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ "ما مات ابن عباس حتی رجع عن ھذہ الفتیا" "ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے فوت ہونے سے پہلے اس (متعۃ النکاح کے) فتوے سے رجوع کر لیا تھا۔(مسند ابی عوانہ طبعہ جدیدہ ج ۳ ص ۲۷۳ ح ۴۲۸۴ وسندہ صحیح)

فائدہ: امام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا: "اشھدوا أني قد رجعتُ عنھا" "گواہ رہو کہ میں نے اس (متعۃ النکاح) سے رجوع کر لیا ہے۔

(مسند ابی عوانہ ۲/۲۷۹ ح ۳۳۱۳ وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے رجوع کرنے کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا متعۃ النساء کی حرمت پر اجماع ہو گیا۔ دیکھئے شرح معانی الآثار للطحاوی (۲۷/۲، دوسرا نسخہ ۲۷/۳)

مشہور ثقہ تابعی امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے فرمایا: ''نسخ المتعة الميراث''

متعہ کو میراث نے منسوخ کر دیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۹۲/۴ ح ۱۷۰۶۴، وسندہ صحیح)

امام مکحول الشامی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ایک آدمی نے ایک عورت سے خاص مقرر وقت تک کے لئے نکاح (یعنی متعہ) کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا: ''ذلك الزنا'' یہ زنا ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۲۹۴/۴ ح ۱۷۰۷۲، وسندہ صحیح)

یہ ہیں وہ روایات، اجماعِ صحابہ اور آثار جن کی بنا پر متعۃ النساء کو اہلِ سنت حرام کہتے ہیں۔

شیعہ (روافض، سبائیہ) کی کتبِ روایات میں بھی حُرمتِ متعہ کی روایات موجود ہیں۔

مثلاً ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا: ''حرم رسول الله صلى الله عليه و آله، لحوم الحمر الأهلية و نكاح المتعة'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے گھریلو گدھوں کے گوشت اور نکاحِ متعہ کو حرام قرار دیا۔ (الاستبصار فیما اختلف من الاخبار ج ۳ ص ۱۴۲، نیز دیکھئے زیدی شیعوں کی مسند زید ص ۲۷۱)

طوسی نے اس روایت کو التقیہ پر محمول کیا ہے لیکن ہمارے لئے طوسی کا کلام حجت نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان حجت ہے، لہٰذا یہ عبارت تقیے پر محمول نہیں بلکہ حرمتِ متعہ پر واضح دلیل ہے، نیز اس روایت کو طوسی کا شاذ قرار دینا بھی غلط ہے کیونکہ یہ روایت صحیح احادیث سے بالکل مطابق ہے۔

تنبیہ: شیعہ کا درج بالا حوالہ بطورِ الزام پیش کیا گیا ہے، ہمارے لئے اہلِ سنت کی کتبِ احادیث کی روایاتِ معتبرہ کافی ہیں اور شیعہ کتبِ روایات پر ان کے موضوع، مردود اور ضعیف ہونے کی وجہ سے کوئی اعتماد نہیں الا یہ کہ وہ روایات اہلِ حق کی بیان کردہ احادیثِ صحیحہ کے موافق ہوں۔

امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ نے فرمایا: '' ما رأیتُ قومًا أشبہ بالنصاریٰ من السبئیة '' میں نے (اپنے زمانے میں) سبائیوں سے زیادہ نصاریٰ سے مشابہ کوئی قوم نہیں دیکھی۔ اس اثر کے راوی امام احمد بن یونس رحمہ اللہ نے فرمایا: '' هم الرافضة '' وہ (یعنی سبائیوں سے مراد) رافضی ہیں۔ (الشریعۃ للآجری ص ۹۵۵ ح ۲۰۲۸ وسندہ صحیح)

اب سوال کے دوسرے حصے کا جواب پیشِ خدمت ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ ''اور وہ (مومنین) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے، پس اس میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ پھر جس نے اس کے علاوہ کوئی دوسری (چیز) طلب کی تو یہی لوگ سرکش ہیں۔'' (المومنون: ۵۔۷)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مالک کا اپنی زرخرید لونڈی سے جماع کرنا جائز ہے اور وہ اس کی بیوی کے حکم میں ہونے کی وجہ سے اس کے لئے حلال ہے۔

یاد رہے کہ سابقہ زمانوں میں لونڈیاں اور غلام ہوتے تھے۔ لونڈی کا خریدنا ہی اس کے ساتھ نکاح ہے الا یہ کہ اس کا مالک کوئی تخصیص کر دے۔

عصرِ حاضر میں اسلامی حکومت (خلافتِ اسلامیہ) کے خاتمے اور بعض وجوہ (اعذار) سے دنیا میں غلام اور لونڈیاں موجود نہیں ہیں۔ آیتِ مذکورہ کے الفاظ سے دو قسم کے ازدواجی تعلقات کا ثبوت واضح ہے: ① بیویاں ② لونڈیاں

ان کے علاوہ متعۃ النساء اور مشت زنی وغیرہ کا کوئی ثبوت نہیں، لہٰذا ﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ ﴾ کی رُو سے یہ حرام ہیں۔ متعۃ النساء بعض خاص مقامات پر عارضی طور پر جائز ہوا تھا پھر بعد میں اسے منسوخ کر کے قیامت تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔ (۱۴ جنوری ۲۰۱۰ء)

خلع والی عورت کی عدت ایک مہینہ ہے

سوال جو عورت اپنے شوہر سے خُلع لے، اُس عورت کی عدت کتنی ہے؟ کیا عام عورتوں کی طرح وہ نکاح ختم ہونے کے بعد تین حیض یا وضعِ حمل کے بعد دوسرے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے؟ دلیل اور تحقیق سے جواب دیں۔ جزاکم اللہ خیراً (ایک سائل)

الجواب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ثابت بن قیس (رضی اللہ عنہ) کی بیوی (قولِ مشہور میں حبیبہ بنت سہل رضی اللہ عنہا) نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اپنے شوہر سے خلع لیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ وہ ایک حیض کی عدت گزاریں۔

روایت کی تخریج کے لئے دیکھئے سنن الترمذی (۱۱۸۵م، وقال: ''حسن غریب'') سنن ابی داود (۲۲۲۹) اور المستدرک للحاکم (۲۰۶/۲ ح ۲۸۲۵ وصححہ الحاکم ووافقہ الذہبی فی تلخیصہ)

اس حدیث کی سند حسن لذاتہ ہے اور اسے امام عبدالرزاق کا مرسلاً بیان کرنا علتِ قادحہ (وجۂ ضعف) نہیں بلکہ زیادتِ ثقہ کی مقبولیت کے اُصول سے یہ روایت مرسلاً اور متصلاً دونوں طرح صحیح ہے۔

سنن الدارقطنی (ج ۳ ص ۲۵۵ ح ۳۵۸۹) میں صحیح سند کے ساتھ ہشام بن یوسف کی بیان کردہ اس روایت میں ''فجعل النبي ﷺ عدتها حيضة و نصفًا'' کے الفاظ آئے ہیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی۔ اس کی سند بھی حسن لذاتہ ہے اور اس سے ثابت ہوا کہ خلع لینے والی عورت کی عدت ایک مہینہ ہے۔

ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا نے (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں) خلع لیا، پھر انھوں نے (سیدنا) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے عدت کے بارے میں پوچھا تو آپ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: تم پر کوئی عدت نہیں ہے الا یہ کہ وہ (شوہر) تمھارے پاس تھا اور تم نے تازہ تازہ خلع لیا ہے تو ایک حیض مدت گزارے گی۔ (سیدنا) عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی اتباع کرتا ہوں جو آپ نے مریم المغالیہ (رضی اللہ عنہا) کے بارے

میں فرمایا تھا۔ (سنن النسائی ج٦ص ١٨٦۔ ١٨٧ ح ٣٥٢٨ وسندہ حسن واللفظ لہ، سنن ابن ماجہ: ٢٠٥٨، وقال الحافظ ابن حجر فی فتح الباری ٩/٣٩٩ تحت ح ٥٢٧٣: "و إسناده جيد")

مریم المغالیہ سے مراد ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی وہ بیوی ہے، جس نے اُن سے خلع لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں ایک حیض کی عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔

دیکھئے الاصابہ (جلد واحد ص ١٧٦٦)

عین ممکن ہے کہ مریم المغالیہ سے مراد حبیبہ بنت سہل کے علاوہ کوئی اور ہو۔ واللہ اعلم

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ربیع (بنت معوذ رضی اللہ عنہا) نے اپنے شوہر سے خلع لیا، پھر اُس کا چچا (سیدنا) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے پاس گیا تو انھوں نے فرمایا:

وہ ایک حیض کی عدت گزارے گی۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ پہلے یہ فتویٰ دیتے تھے کہ وہ تین حیض کی عدت گزارے گی، جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ فتویٰ دیا تو پھر وہ اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور فرماتے تھے:

وہ ہم میں سب سے بہتر ہیں اور سب سے زیادہ علم والے ہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ٥ ص ١١٤ ح ١٨٤٥٦، وسندہ صحیح)

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کر لیا تھا۔

امام نافع مولیٰ ابن عمر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ابن عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:

خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ٥ ص ١١٤ ح ١٨٤٥٥، وسندہ صحیح)

اس مسئلے میں حنفی وغیرہ علماء کہتے ہیں کہ خلع والی عورت مطلقہ کی طرح تین مہینے یا وضع حمل کی عدت گزارے گی لیکن درج بالا حدیث، خلیفۂ راشد کے فیصلے اور صحابیٔ رسول کے فتوے کی وجہ سے راجح یہی ہے کہ وہ ایک مہینہ عدت گزارنے کے بعد دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ (٧/نومبر ٢٠٠٩ء)

خلع کے بعد عورت اور سابقہ شوہر کا دوبارہ نکاح؟

سوال کیا خلع کے بعد عورت اپنے اُس شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے، جس سے خلع لیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ایسی حالت میں خلع لینے والی عورت اپنے سابقہ شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: "أخبرنا سفيان بن عيينة عن عمرو بن دينار عن طاؤس عن ابن عباس رضي الله عنه في رجل طلق امرأته تطليقتين ثم اختلعت منه بعد فقال: يتزوجها إن شاء .... " ایک آدمی نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں، پھر اس کے بعد اس عورت نے اپنے شوہر سے خلع لے لیا تو اس کے بارے میں (سیدنا) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر وہ چاہے تو اس سے (دوبارہ) نکاح کر سکتی ہے... (کتاب الام ج۵ ص۱۱۴)

اس اثر کی سند صحیح ہے۔

اگر سفیان بن عیینہ سے امام شافعی نے روایت کی ہو تو یہ روایت سماع پر محمول ہوتی ہے۔

دیکھئے النکت للزرکشی (ص۱۸۹) اور الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص۴۲)

اس اثر سے معلوم ہوا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ خلع کو فسخ سمجھتے تھے، اسی لیے وہ اس کے بعد دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح کو جائز سمجھتے تھے۔ یعنی "طلقها تطليقة" کی رو سے اگر شوہر ایک طلاق دے بھی دے تو پھر بھی فسخ ہے۔

ثقہ تابعی میمون بن مہران رحمہ اللہ نے فرمایا: "يتزوّجها و يسمّى لها مهرًا جديدًا." وہ اگر چاہے تو نکاح کرے گا اور نیا حق مہر باندھے گا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۵/۱۲۲ ح ۱۸۵۰۴، وسندہ صحیح)

امام ابن شہاب الزہری نے فرمایا: اس نے (اگر) جو رقم اس عورت سے لی ہے تو اس سے کم حق مہر کے ساتھ اس سے نکاح نہ کرے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۵/۱۲۲ ح ۱۸۵۰۳، وسندہ صحیح)

اصول، تخریج الروایات اور ان کا حکم

بخل، بزدلی اور عبادت میں سستی کا علاج

سوال فضائل اعمال کی کتاب فضائل ذکر کے باب سوئم فصل دوم کے تحت حدیث نمبر ۵ کی تحقیق وتخریج درکار ہے، یہ حدیث درج ذیل ہے:

" عن أبي أمامة رضي اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه ﷺ :من هاله الليل أن يكابده أو بخل بالمال أن ينفقه أو جبن عن العدوّ أن يقاتله فليكثر من سبحان اللّٰه و بحمده. فإنها أحب إلى اللّٰه من جبل ذهب ينفقه في سبيل اللّٰه.

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص رات کو مشقت جھیلنے سے ڈرتا ہو (کہ راتوں کو جاگنے اور عبادت میں مشغول رہنے سے قاصر ہو) یا بخل کی وجہ سے مال خرچ کرنا دشوار ہو یا بزدلی کی وجہ سے جہاد کی ہمت نہ پڑتی ہو اس کو چاہئے کہ سُبْحانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ کثرت سے پڑھا کرے کہ اللہ کے نزدیک یہ کلام پہاڑ کی بقدر سونا خرچ کرنے سے بھی زیادہ محبوب ہے۔

رواه الفريابي والطبراني واللفظ له وهو حديث غريب ولا بأس بإسناده ان شاء اللّٰه كذا في الترغيب و في مجمع الزوائد رواه الطبراني و فيه سليمان بن أحمد الواسطي و ثقه عبدان و ضعفه الجمهور والغالب على بقية رجاله التوثيق و في الباب عن أبي هريرةؓ مرفوعًا اخرجه ابن مردويه و ابن عباس ايضًا عند ابن مردويه كذا في الدر."

(گل رحمٰن، تخت بھائی ضلع مردان)

الجواب فریابی کی روایت (جس کا متن یہاں مذکور نہیں) کی سند المعجم الکبیر للطبرانی (۸/۲۶۳ ح ۷۸۷۷) میں مذکور ہے اور یہ سند عثمان بن ابی العاتکہ (ضعفہ الجمہور/ مجمع الزوائد ۱۰/۲۱۰) اور علی بن یزید الاصبہانی (ضعیف/تقریب التہذیب: ۴۸۱۷) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

طبرانی والی روایت معمولی اختلاف کے ساتھ درج ذیل سند سے مروی ہے:

" حدثنا أحمد بن محمد بن يحيى بن حمزة الدمشقي: حدثني أبي عن أبيه

ثنا حداد العذري مع ابن جابر عن العباس بن ميمون عن القاسم عن أبي أمامة... " (المعجم الکبیر ۸/ ۲۲۸ ح ۷۶۹۵)

اس سند میں احمد بن محمد بن یحییٰ بن حمزہ اپنے باپ سے روایت کرنے میں سخت مجروح ہے۔ (مثلاً دیکھئے لسان المیزان ۱/ ۲۵۰، الثقات لابن حبان ترجمۃ محمد بن یحییٰ ۹/ ۴۷)

ایک معاصر ابو الطیب نائف بن صلاح بن علی المنصوری نے شیوخِ طبرانی پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں اسے "ضعیف صاحب مناکیر و غرائب" قرار دیا ہے۔

(ارشاد القاصی والدانی الی تراجم شیوخ الطبرانی ص ۱۸۰، رقم ۲۱۴)

اس سند کے دوسرے راوی حداد العذری کی توثیق نامعلوم ہے۔

اس سند کے تیسرے راوی عباس بن میمون کی توثیق بھی معلوم نہیں۔

ثابت ہوا کہ یہ سند تین وجہ سے ضعیف و مردود ہے۔

دوسری سند: المعجم الکبیر میں اس روایت کی دوسری سند بھی موجود ہے لیکن اس میں سلیمان بن احمد الواسطی راوی ہے۔

(ج ۸ ص ۲۳۰ ح ۷۸۰۰، نیز دیکھئے مسند الشامیین ۱/ ۱۱۴ ح ۱۷۴، الترغیب لابن شاہین ۱/ ۱۸۰ ح ۱۵۷)

سلیمان الواسطی جمہور کے نزدیک مجروح ہے اور ہیثمی نے فرمایا:

" وثقه عبدان و ضعفه الجمهور " (مجمع الزوائد ۱۰/ ۹۴)

امام بخاری نے اس شخص پر "فيه نظر" کہہ کر شدید جرح کی ہے۔ (دیکھئے التاریخ الکبیر ۴/ ۳)

ابن عدی نے فرمایا: میرے نزدیک وہ حدیثیں چوری کرتا تھا یا اس پر حدیثیں مشتبہ (گڈمڈ) ہو جاتی تھیں۔ (الکامل ۳/ ۱۱۴۰، دوسرا نسخہ ۴/ ۲۹۷)

تیسری سند: یہ ضعیف و مردود سند شروع میں بحوالہ فریابی و طبرانی گزر چکی ہے۔

شواہد: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت الترغیب و الترہیب للاصبہانی (ق ۶۷/ ۲ مصورۃ الجامعۃ الاسلامیہ) میں ہے۔ (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ۶/ ۴۸۴ ح ۲۷۱۴)

اس سند میں یوسف بن العنبس الیمانی نامعلوم ہے، عکرمۃ بن عمار اور یحییٰ بن ابی کثیر

دونوں مدلس ہیں اور یہ سند عن سے ہے، نیز عکرمہ کی یحییٰ سے روایت میں کلام ہے، لہٰذا یہ سند چار وجہ سے ضعیف ومردود ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت (متن کے اختلاف کے ساتھ) مسند البزار (البحر الزخار ۱۱/ ۱۶۸ ح ۴۹۰۴) اور مسند عبد بن حمید (۶۴۱) وغیرہما میں اسرائیل عن ابی یحییٰ عن مجاہد عن ابن عباس کی سند سے مذکور ہے۔

اس سند میں ابو یحییٰ القتات جمہور کے نزدیک ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ۱۰/ ۷۴)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس مفہوم کی ایک روایت معجم الاسماعیلی میں مذکور ہے۔ (۲/ ۷۲۷۔ ۳۴۲، ت ۳۴۲، نیز دیکھئے الصحیحہ للالبانی ۶/ ۴۸۲ ح ۲۷۱۴)

یہ سند سفیان ثوری ثقہ مدلس کے عن کی وجہ سے ضعیف ہے، لہٰذا اسے "و هذا إسناد صحيح" کہنا غلط ہے۔

شعب الایمان للبیہقی (ح ۶۰۷، دوسرا نسخہ: ۵۹۹) میں سفیان ثوری کی متابعت حمزہ الزیات سے مروی ہے لیکن اس سند میں مہران بن ہارون بن علی الرازی کی توثیق نا معلوم ہے۔

یہی روایت اس متن کے بغیر مسند احمد (۱/ ۳۸۷ ح ۳۶۷۲) وغیرہ میں مذکور ہے لیکن اس کی سند میں صباح بن محمد ضعیف ہے۔ (دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح بتحقیقی: ۴۹۹۴)

خلاصۃ التحقیق یہ ہے کہ یہ مرفوع روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہے۔

فائدہ عظیمہ: محمد بن طلحہ بن مصرف الیمانی نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: "إن الله عز و جل قسم بينكم أخلاقكم كما قسم بينكم أرزاقكم. و أن الله يعطي المال من يحب و من لا يحب و لا يعطي الإيمان إلا من يحب فإذا أحب الله عبدًا أعطاه الإيمان فمن ضن بالمال أن ينفقه وهاب العدو أن يجاهده و الليل أن يكابده فليكثر من قول لا إله إلا الله والله أكبر والحمد لله و سبحان الله." بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے

درمیان اس طرح اخلاق تقسیم فرمائے ہیں جس طرح تمھارے درمیان رزق تقسیم فرمایا ہے۔ اللہ جسے پسند کرتا ہے اُسے مال دیتا ہے اور جسے پسند نہیں کرتا اُسے بھی مال دیتا ہے اور ایمان صرف اسے ہی دیتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے، پھر جب وہ کسی بندے کو پسند کرتا ہے اسے ایمان دیتا ہے تو جو شخص مال (خرچ کرنے) کے بارے میں بخل کرے (یعنی وہ ڈرے کہ خرچ کرنے سے مال ختم ہو جائے گا) اور دشمن کے خلاف جہاد کرنے سے ڈرے اور رات کو عبادت کرنے میں) تکلیف و مشقت محسوس کرے (یعنی اس میں مال خرچ کرنے اور رات عبادت میں گزارنے کا حوصلہ نہیں) تو اسے کثرت سے لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ اور سبحان اللہ پڑھنا چاہیے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۹/۲۲۹ ح ۸۹۹۰)

اس موقوف روایت کی سند محمد بن طلحہ (وثقہ الجمہور) کی وجہ سے حسن لذاتہ ہے، نیز زہیر بن معاویہ (الزہد لابی داود: ۱۵۷) اور مالک بن مغول (حلیۃ الاولیاء ۴/ ۱۶۵) نے اُن کی متابعت کر رکھی ہے، لہٰذا یہ اثر صحیح ہے۔

امام دارقطنی نے بھی موقوف کو صحیح قرار دیا ہے۔ (العلل ۵/۲۷۱ سوال ۸۷۲)

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقوف روایت حکماً مرفوع ہے۔ واللہ اعلم (۱۱/ فروری ۲۰۱۳ء)

امام مہدی اور خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے؟

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ ''جب تم دیکھو کہ خراسان کی جانب سے سیاہ جھنڈے نکل آئے تو اس لشکر میں شامل ہو جاؤ، چاہے تمھیں اس کے لیے برف پر گھسٹ کر (کرالنگ کرکے) کیوں نہ جانا پڑے، کہ اس لشکر میں اللہ کے آخری خلیفہ مہدی ہوں گے۔ (دیکھئے ابولبابہ شاہ منصور دیوبندی کی کتاب: ''دجال کون؟ کب؟ کہاں؟'' ص ۳۵۔۳۶ واللفظ لہ، بحوالہ الفتن لنعیم بن حماد: ۸۹۶، المستدرک للحاکم: ۸۵۶۴، عاصم عمر دیوبندی کی کتاب: ''تیسری جنگِ عظیم اور دجال'' ص ۵۶ بحوالہ مستدرک ۴/ ۵۱۰، اور سنن ابن ماجہ ۲/ ۱۳۶۷) کیا یہ روایت صحیح ہے؟ تحقیق کرکے جواب دیں۔ شکریہ

(محمد عاطف خان، جوہر ٹاؤن لاہور)

الجواب یہ روایت "سفیان (الثوري) عن خالد الحذاء عن أبي قلابة عن أبي أسماء الرحبي عن ثوبان" رضی اللہ عنہ کی سند سے درج ذیل کتابوں میں موجود ہے:

1: سنن ابن ماجہ (۴۰۸۴)

2: المستدرک للحاکم (۴/ ۴۶۳۔ ۴۶۴ ح ۸۴۳۲ وصححہ علیٰ شرط الشیخین ووافقہ الذہبی!)

3: مسند الرویانی (ج ۱ ص ۴۱۷۔ ۴۱۸ ح ۶۳۷)

4: دلائل النبوۃ للبیہقی (۶/ ۵۱۵ وقال: "تفرد به عبدالرزاق عن الثوري"!)

5: السنن الواردۃ فی الفتن و غوائلها و الساعة وأشراطها للدانی (۵/ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳ ح ۵۴۸)

اس کے راوی امام سفیان ثوری رحمہ اللہ ثقہ ومتقن امام ہونے کے باوجود مشہور مدلس تھے۔ ابوزرعہ ابن العراقی نے کہا: "مشهور بالتدليس" (کتاب المدلسین ص ۵۲ رقم: ۲۱)

ابن العجمی اور سیوطی دونوں نے کہا: "مشهور به" (التبیین لأسماء المدلسین: ۲۵، اسماء المدلسین: ۱۸)

حافظ ابن حبان نے فرمایا: وہ مدلس راوی جو ثقہ عادل ہیں، ہم اُن کی صرف ان مرویات ہی سے حجت پکڑتے ہیں جن میں وہ سماع کی تصریح کریں، مثلاً: سفیان ثوری، اعمش اور ابواسحاق وغیرہم... (الاحسان ۱/ ۹۰، علمی مقالات ج ۱ ص ۲۶۶ ج ۳ ص ۳۰۸)

عینی حنفی نے کہا: اور سفیان (ثوری) مدلسین میں سے تھے اور مدلس کی عن والی روایت حجت نہیں ہوتی، الا یہ کہ اُس کی تصریحِ سماع دوسری سند سے ثابت ہو جائے۔

(عمدۃ القاری ۳/ ۱۱۲، الحدیث حضرو: ۶۶ ص ۲۷)

ابن الترکمانی حنفی نے ایک روایت پر جرح کرتے ہوئے کہا: اس میں تین علتیں (وجہِ ضعف) ہیں: ثوری مدلس ہیں اور انھوں نے یہ روایت عن سے بیان کی ہے...

(الجوہر النقی ۸/ ۲۶۲)

اس روایت میں بھی سفیان ثوری کے سماع کی تصریح نہیں، لہٰذا یہ ضعیف ہے اور یاد

رہے کہ درج بالا تصریحات اور دیگر دلائل کی رُو سے سفیان ثوری کو مدلسین کے طبقۂ ثانیہ میں ذکر کرنا غلط ہے۔ نیز دیکھئے الحدیث: ۶۷ ص ۱۱۔۳۲

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری مرفوع روایت میں بھی خراسان کی طرف سے کالے جھنڈوں کا ذکر آیا ہے۔

(مسند احمد ۵/۲۷۷ ح ۲۲۳۸۷، دلائل النبوۃ للبیہقی ۶/۵۱۶، العلل المتناھیہ لابن الجوزی: ۱۴۴۵)

یہ سند کئی وجہ سے ضعیف ہے: علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔ (تقریب التہذیب: ۴۷۳۴)
شریک القاضی مدلس ہیں اور سند عن سے ہے، نیز روایت منقطع بھی ہے۔

تنبیہ: سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت میں آیا ہے کہ ''إذا رأیتم الرایات السود خرجت من قبل خراسان فآتوھا فإن فیھا خلیفۃ اللّٰہ المھدي''

جب تم دیکھو کہ خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے نکلیں تو ادھر جاؤ، کیونکہ وہاں اللہ کے خلیفہ مہدی ہوں گے۔ (المستدرک للحاکم ۴/۵۰۲ ح ۸۵۳۱ وصححہ علیٰ شرط الشیخین، دلائل النبوۃ ۶/۵۱۶)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے اور یہ مرفوع حکماً ہے۔

عبدالوہاب بن عطاء نے سماع کی تصریح کر دی ہے اور یحییٰ بن ابی طالب جمہور کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے حسن الحدیث راوی تھے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل روایت میں کالے جھنڈوں کا ذکر آیا ہے: دیکھئے سنن ابن ماجہ (۴۰۸۲) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۵/۲۳۵ ح ۱۹۲۷۷) مسند ابن ابی شیبہ (۱/۲۰۹۔۲۱۰ ح ۳۰۸) مسند الشافعی (۱/۳۴۷ ح ۳۲۹) مسند ابی یعلیٰ (۹/۱۷۔۱۸ ح ۵۰۸۴) المعجم الاوسط للطبرانی (۶/۳۲۷ ح ۵۶۹۵) الکامل لابن عدی (۵/۱۷۸۳، دوسرا نسخہ ۶/۲۳۲) الضعفاء للعقیلی (۴/۳۸۱) الفتن للدانی (۵/۱۰۳۱۔۱۰۳۲ ح ۵۴۷) الفتن للامام نعیم بن حماد الصدوق (۸۵۲)

اس کا راوی یزید بن ابی زیاد الکوفی جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔
دیکھئے ہدی الساری لابن حجر (ص ۴۵۹) اور زوائد سنن ابن ماجہ للبوصیری (۲۱۱۶)

المستدرک للحاکم (۴/۴۶۴ ح ۸۴۳۴) میں ایک موضوع روایت ہے، جس کا بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ قال الذھبی: 'ھذا موضوع''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک روایت میں بھی کالے جھنڈوں کا ذکر آیا ہے:

(دیکھئے سنن الترمذی: ۲۲۶۹ وقال: ھذا حدیث غریب حسن، مسند احمد ۲/۳۶۵ ح ۸۷۷۵، الاوسط للطبرانی ۴/۳۲۳ ح ۳۵۶۰، البحر الزخار للبزار ۱۴/۱۲۴ ح ۷۶۲۵، دلائل النبوۃ للبیہقی ۶/۵۱۶)

اس روایت میں رشدین بن سعد ضعیف ہے، اسے جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دیکھئے تخریج الاحیاء للعراقی (۴/۸۴) مجمع الزوائد (۵/۶۶، ۱/۵۸، ۲۰۱) اور اتحاف السادۃ المتقین (۹/۵۴)

کتاب الفتن للامام الصدوق نعیم بن حماد المروزی میں کئی ضعیف و مردود روایات و آثار موجود ہیں۔ (دیکھئے ۸۵۱۔۸۶۶)

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، لیکن سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے موقوفاً (یعنی صحابی کے قول کے طور پر) ثابت ہے۔ (۲۸/ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

بسم اللہ جہراً و سراً پڑھنا اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا دفاع

سوال محترم شیخ صاحب! صحیح مسلم کی ایک روایت کی صحت کے بارے میں بعض لوگوں کو کچھ اشکالات ہیں، جو میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں:

محدّث دیارِ سندھ ابو محمد بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''بدیع التفاسیر جلد اوّل صفحہ ۱۴۴'' (جسکی فوٹو کاپی بھی ساتھ منسلک ہے) میں لکھا ہے کہ ''صحیح مسلم کی حدیث انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے وہ سب (نماز کو) الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔

(صحیح مُسلم مع النووی ج ۱ ص ۱۷۲)

اس کی سند اوزاعی عن قتادہ انہ کتب الیہ یخبرہ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہے یعنی اوزاعی کہتے ہیں کہ یہ روایت قتادہ نے مجھے انس رضی اللہ عنہ سے لکھ کر بھیجی ہے/ اور قتادہ مادرزاد اندھے ہیں۔ (تہذیب ۸/۳۵۱) یعنی یہ روایت انھوں نے خود نہیں لکھی بلکہ کسی کاتب سے لکھوائی ہوگی، وہ کاتب مجہول ہے اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''النکت ص ۲۹۴'' قلمی (مطبوع ۲/۷۵۵۔۷۵۶) میں بھی لکھا ہے۔ لہٰذا اس روایت میں ملاوٹ کا بڑا اندیشہ ہے۔ جس نے یہ روایت لکھ کر اوزاعی تک پہنچائی ہے وہ نا معلوم شخص ہے گویا قتادہ اور اوزاعی کے درمیان واسطہ مجہول ہے جس کی وجہ سے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح قتادہ مُدلس تھے اور یہاں سماع کی تصریح بھی نہیں ہے جو اس روایت کے ضعیف ہونے کا دوسرا سبب ہے۔ (بدیع التفاسیر جلد اول صفحہ ۱۳۴)

شیخ صاحب! یہاں یہ بات یاد رہے کہ محترم و مکرم بدیع الدین شاہ صاحب رحمہ اللہ بسم اللہ بالجہر کے قائل و فاعل تھے اور مذکورہ روایت میں چونکہ بسم اللہ کو سراً پڑھنے کی طرف اشارہ ہے، غالباً اسی بحث میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس پر کلام کیا ہے۔

اسی صفحہ ۱۳۴ پر مزید بحث کرتے ہوئے محترم شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر اس روایت کو تسلیم کرلیا جائے تو اسکا معنی یہ ہوگا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بالکل نہیں پڑھی نہ آہستہ سے نہ بُلند آواز سے اور آہستہ پڑھنے والوں کے لئے اس میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

(اور پھر مذکورہ روایت سے آگے صحیح مسلم کی دوسری روایت نقل کی ہے جس میں وضاحت ہے کہ ''اور کسی کو بھی میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سُنا)

محترم و محبوب شیخ صاحب! اس بحث کو لے کر ہمارے سندھ کے کچھ علماء نے صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث کو ضعیف تسلیم کرلیا ہے اور موبائل پر میسجز (messages) کے ذریعے سے اس کی تشہیر بھی کی جارہی ہے۔

پھر جب ہم نے اپنے دوستوں کے ذریعے سے ان علماء کی توجہ صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر ہونے والے اجماع کی طرف دلوائی تو انھوں نے اس کا بھی انکار کردیا کہ دونوں

کتابوں پر اجماع ہوا ہے یعنی ان کے بقول اجماع نہیں ہے۔ (وکیل ولی قاضی، حیدرآباد سندھ)

الجواب صحیح مسلم کی اس حدیث کی تخریج وتحقیق درج ذیل ہے:

امام عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

(امام) قتادہ نے حدیث لکھوا کر مجھے بھیجی: انھیں (سیدنا) انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) نے حدیث بیان کی کہ میں نے نبی ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے پیچھے نماز پڑھی۔ وہ الحمد للہ رب العالمین سے نماز شروع کرتے تھے، نہ قراءت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے اور نہ آخر میں پڑھتے تھے۔

(صحیح مسلم: ۵۲/۳۹۹ ترقیم دارالسلام: ۸۹۲، مسند احمد ۳/۲۲۳ ح ۱۳۳۳۷)

اس حدیث کی سند پر استاذ محترم رحمہ اللہ نے دو اعتراض کیے ہیں:

اول: اس روایت کا کاتب نامعلوم ہے۔

دوم: قتادہ مدلس ہیں اور یہاں سماع کی تصریح نہیں۔

پہلے اعتراض کے دو جواب ہیں:

اول: اس روایت کے صحیح لذاتہ شواہد ومتابعات موجود ہیں، جیسا کہ ان شاء اللہ آگے آرہا ہے، لہٰذا کاتب کا نامعلوم ہونا یہاں بالکل مضر نہیں۔

دوم: دنیا کا عام دستور ہے کہ نابینا اشخاص اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو خطوط وتحریرات بھیجتے رہتے ہیں اور عام طور پر (صریح دلیل کی تخصیص نہ ہونے کی صورت میں، یعنی کاتب کے مجروح ثابت ہونے کی صریح دلیل کے بغیر) اس خط کتابت پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

یہ مکاتبت کی قسم میں سے ہے اور اصولِ حدیث میں مقرر ہے کہ مکاتبت سے روایت جائز ہے۔

دوسرے اعتراض کا یہی جواب کافی ہے کہ مسند احمد میں اسی روایت کی اسی سند میں سماع کی تصریح موجود ہے۔ (ج ۳ ص ۲۲۳۔۲۲۴ كتب إلي قتادة: حدثني أنس بن مالك)

نیز صحیحین میں تمام مدلسین کی تمام معنعن روایات سماع اور متابعات معتبرہ وشواہد صحیحہ

پر محمول ہیں۔ اب اس روایت کے بعض شواہد و متابعات پیشِ خدمت ہیں:

۱) صحیح مسلم اور بہت سی کتابوں میں یہ حدیث ہے کہ امام شعبہ نے قتادہ سے روایت کیا، انھوں نے انس (رضی اللہ عنہ) سے بیان کیا: " صلّيت مع رسول الله ﷺ و أبي بكر و عمر و عثمان فلم أسمع أحدًا منهم يقرأ ببسم الله الرحمٰن الرحيم ."

میں نے رسول اللہ ﷺ، ابو بکر، عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ (یعنی ان کی اقتدا میں) نماز پڑھی تو میں نے کسی ایک کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

(صحیح مسلم: ۳۹۹، دارالسلام: ۸۹۰، مسند احمد ۳/ ۱۱۷ ح ۱۲۸۱۰، صحیح ابن خزیمہ: ۴۹۴، صحیح ابی عوانہ ۲/ ۱۲۲ ح ۱۳۱۱)

اس روایت کی سند بالکل صحیح ہے اور اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ قتادہ مدلس ہیں، تو اس کے تین جوابات ہیں:

اول: امام شعبہ کی قتادہ سے روایت اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ قتادہ نے یہ روایت اپنے استاد سے سُنی تھی، جیسا کہ امام شعبہ نے فرمایا: تین آدمیوں اعمش، ابو اسحاق اور قتادہ کی تدلیس کے لئے میں تمھارے لئے کافی ہوں۔ (جزء مسألۃ التسمیہ لابن طاہر ص ۴۷ وسندہ صحیح)

امام شعبہ نے فرمایا: میں قتادہ کے منہ کو دیکھتا رہتا تھا، جب آپ کہتے: میں نے سنا ہے یا فلاں نے ہمیں حدیث بیان کی، تو میں اسے یاد کر لیتا تھا اور جب کہتے: فلاں نے حدیث بیان کی، تو میں اسے چھوڑ دیتا تھا۔ (تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۱۶۹، وسندہ صحیح، تحقیقی مقالات ۱/ ۲۶۱)

یہ ایسا (عام) مسئلہ ہے کہ تدلیس اور مدلسین سے باخبر تقریباً اکثر طلباء و علماء کو معلوم ہے۔

دوم: اسی روایت میں قتادہ کے سماع کی تصریح موجود ہے، جیسا کہ فقرہ نمبر ۲ کے تحت آ رہا ہے۔

سوم: صحیحین میں مدلسین کی تمام معنعن روایات سماع، متابعات یا شواہد صحیحہ پر محمول ہیں، لہٰذا ان روایات پر تدلیس کا اعتراض غلط ہے۔

۲) ثقہ وصدوق راوی علی بن الجعد نے کہا: " أخبرنا شعبة و شيبان عن قتادة قال:

سمعت أنس بن مالك قال: صلّيت خلف النبي ﷺ و أبي بكر و عمر و عثمان فلم أسمع أحدًا منهم يجهر ببسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم ."

میں نے نبی ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے پیچھے نماز پڑھی، میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

(مسند علی بن الجعد: ۹۲۲ واللفظ لہ، دوسرا نسخہ: ۹۵۳، سنن الترمذی ۱/۳۱۴ ح ۱۱۸۶، وعندہ: شعبۃ وسفیان!)

اس روایت کی سند صحیح ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت میں امام شعبہ کی متابعت کرنے والے شیبان بن عبدالرحمٰن التمیمی ثقہ ثبت صاحبِ کتاب ہیں۔

سنن دارقطنی کے مطبوعہ نسخے میں سفیان کا لفظ تصحیف ہے اور شیبان کی ترجیح کے لئے دیکھئے صحیح ابن حبان (الاحسان: ۱۷۹۶، دوسرا نسخہ: ۱۷۹۹) المخلصیات (۲/۱۰۱ ح ۱۱۲۶) شرح معانی الآثار للطحاوی (۱/۲۰۲، باب قراءۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فی الصلوٰۃ) مسألۃ التسمیہ (ص ۲۴) اور معجم ابن عساکر (۱/۳۱ ح ۲۲) وغیرہ .

امام شعبہ سے اس حدیث کو راویوں کی ایک جماعت نے مختلف الفاظ کے ساتھ اس مفہوم میں بیان کیا ہے:

۱: محمد بن جعفر (صحیح مسلم)

۲: علی بن الجعد (حوالہ اس فقرے کے شروع میں گزر چکا ہے۔)

۳: وکیع بن الجراح (مسند احمد ۳/۱۷۹ ح ۱۲۸۴)

۴: حجاج بن محمد (مسند احمد ۳/۱۷۷)

۵: عبیداللہ بن موسیٰ (المنتقیٰ لابن الجارود: ۱۸۳، سنن الدارقطنی ۱/۳۱۵)

۶: بدل بن المحبر (السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۵۱)

۷: ابوداود الطیالسی (صحیح مسلم، دارالسلام: ۸۹۱)

۸: عقبہ بن خالد (المجتبیٰ للنسائی: ۹۰۸)

۹: اسود بن عامر (سنن دارقطنی ۱/۳۱۵ ح ۱۱۸۹)

۱۰: زید بن الحباب (سنن دارقطنی ۱/۳۱۵ ح ۱۱۹۰) وغیرہم

اور شیبان بن عبدالرحمٰن (ثقہ صاحبِ کتاب) اُن کے متابع ہیں۔

اس صحیح حدیث سے صاف ثابت ہے کہ قتادہ نے یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سنی تھی اور حافظ ابن حبان نے ایسے لوگوں کو زبردست پھکی دی ہے، جو کہتے تھے کہ قتادہ نے یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نہیں سنی تھی۔ (دیکھئے الاحسان قبل ح ۱۷۹۶، دوسرا نسخہ: ۱۷۹۹)

۳) قتادہ کے علاوہ اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ نے بھی اسی حدیث کو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم، دارالسلام: ۸۹۳، جزء القراءۃ للبخاری: ۱۲۰)

یعنی قتادہ بھی اس حدیث کے ساتھ منفرد نہیں، نیز اس حدیث کے کئی شواہد بھی موجود ہیں، مثلاً:

① عن ابی نعامہ الحنفی عن انس رضی اللہ عنہ (مسند احمد ۳/۲۱۶ ح ۱۳۲۵۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۵۲)

اس سند میں سفیان ثوری (طبقۂ ثانیہ کے!!) مدلس ہیں، لہٰذا یہ سند صرف اس وجہ سے ضعیف ہے۔

② منصور بن زاذان عن انس رضی اللہ عنہ (المجتبیٰ للنسائی ۲/۱۳۴ ح ۹۰۷)

اس کی سند منقطع ہے، منصور نے انس رضی اللہ عنہ سے کچھ نہیں سنا۔

③ عن الحسن البصری عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ (صحیح ابن خزیمہ: ۴۹۷)

اس کی سند میں سوید بن عبدالعزیز ضعیف اور حسن بصری مدلس ہیں، لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

④ عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ (صحیح ابن خزیمہ: ۴۹۷)

اس روایت میں اعمش (طبقۂ ثانیہ کے!!) مدلس ہیں اور روایت عن سے ہے، لہٰذا یہ سند بھی ضعیف ہے۔

خلاصۃ التحقیق: یہ حدیث امام شعبہ کی سند کے ساتھ بالکل صحیح ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے شروع میں جہراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ پڑھنا بھی جائز ہے، یعنی

سراً پڑھنا بالکل صحیح ہے اور دوسرے دلائل کی رُو سے بعض اوقات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھنا بھی جائز ہے۔ (دیکھئے میری کتاب: ہدیۃ المسلمین ص ۳۷۔۳۸ ح ۱۳)

متن پر ایک اعتراض: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بالکل نہیں پڑھی نہ آہستہ سے، نہ بلند آواز سے''

یہ اعتراض دو وجہ سے غلط ہے:

۱: حدیث میں صراحت ہے کہ " **صلّیت خلف النبي ﷺ و أبي بکر و عمر و عثمان فلم أسمع أحدًا منهم یجهر ببسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم .**"

میں نے نبی ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے پیچھے نماز پڑھی، میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ (دیکھئے فقرہ نمبر۲)

چونکہ حدیث حدیث کی تشریح کرتی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ اس حدیث ''**لا یذکرون بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم في أول القراءة ولا في آخرها**'' سے مراد یہ ہے کہ وہ قراءت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (جہراً) ذکر نہیں کرتے تھے اور نہ آخر میں (جہراً) ذکر کرتے تھے۔

۲: محدثین کرام جو فہم حدیث کے سب سے زیادہ ماہر تھے، انھوں نے بھی اس حدیث سے عدمِ بسم اللہ کی بجائے عدمِ جہر مراد لیا ہے۔ مثلاً:

حافظ بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر درج ذیل باب باندھا ہے:

''**باب من قال لا یجهر بها**'' باب: جو کہتا ہے کہ اسے جہراً نہیں پڑھنا چاہئے۔

(السنن الکبریٰ ۲/۵۰)

نیز ان سے پہلے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو صراحت سے بیان کیا ہے:

''**باب ذکر الدلیل علی أن أنسًا إنما أراد بقوله: لم أسمع أحدًا منه یقرأ بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم . أي لم أسمع أحدًا منهم یقرأ جهرًا بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم و أنهم کانوا یسرون بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم فی الصلاة، لا کما**

توهم من لم يشتغل بطلب العلم من مظانه، [و] طلب الرئاسة قبل تعلم العلم.“

باب اس بات کی دلیل کہ انس بن مالک کے ارشاد: میں نے کسی ایک کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سنا، سے مراد صرف یہ ہے کہ میں نے کسی ایک کو بھی جہراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سنا، اور بے شک وہ نماز میں سراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے، نہ کہ وہ بات جو ایسا شخص کہتا ہے جس نے صحیح مقامات سے علم حاصل نہیں کیا اور علم کے سیکھنے سے پہلے ہی بڑا بننے لگا۔ (صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۴۹ قبل ح ۴۹۵)

ہمارا یہ عقیدہ، ایمان، منہج اور نصب العین ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام مرفوع مسند متصل احادیث بالکل صحیح ہیں اور اُن میں سے ایک بھی ضعیف نہیں۔ ہمارے علم میں ہے کہ بعض علماء نے اس بات سے اختلاف کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ان کا قول مرجوح اور غیر صحیح ہے۔ وما علینا إلا البلاغ (۲۷/ شعبان ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۸/ جولائی ۲۰۱۲ء)

سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا دفاع

سوال حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب ”الصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ“ صفحہ ۱۶۶ (اردو مترجم) میں لکھتے ہیں: ”صحیح مسلم میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ مسلمان نہ ابوسفیان کی جانب دیکھا کرتے تھے اور نہ اُسے اپنے پاس بٹھایا کرتے تھے۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تین باتیں ہیں وہ مجھے عطا فرمایئے۔ فرمایا: اچھا! کہا: میرے پاس عرب بھر میں سب سے زیادہ حسین و جمیل لڑکی اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا ہے میں اُس کو آپ کے نکاح میں دینا چاہتا ہوں...... واضح ہو کہ اس حدیث کے معنی میں لوگوں کو بہت ہی مشکل پڑی ہے کیونکہ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پیشتر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو چکا تھا اور نجاشی نے پڑھایا تھا اور اپنے باپ کے اسلام لانے سے

پیشتر نبی کی خدمت میں مدینہ پہنچ گئی تھیں اور پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد ابو سفیان کہے کہ "میں اُم حبیبہ کا نکاح آپ سے کرتا ہوں" ایک گروہ علماء کا قول ہے کہ یہ حدیث کذب ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ ابن حزم کا قول ہے "عکرمہ بن عمار نے یہ جھوٹ بنایا ہے۔" (ص ۱۶۶۔۱۶۷)

اسی طرح حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے مذکورہ کتاب میں صفحہ ۱۶۷ سے ۱۷۵ تک میں اس روایت کا دفاع کرنے والوں پر رد کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"ٹھیک تو یہی ہے کہ یہ حدیث غیر محفوظ ہے اور اس میں کچھ خلط ملط ضرور ہوا ہے۔"

(صفحہ نمبر ۱۷۵)

محترم شیخ صاحب! اس روایت کے بارے میں مکمل تحقیق درکار ہے اور تفصیل کے ساتھ صحیحین پر اجماع کے بارے میں بھی وضاحت درکار ہے تاکہ اس حوالے سے مزید اعتراضات کو ختم کیا جا سکے کیونکہ محترم بدیع الدین شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ ہو رہا ہے اور اس کی اشاعت سے قبل ہی اس معاملے پر اگر تفصیلی مضمون آ جائے تو یہ اہل حدیث علماء و عوام پر احسان ہوگا۔ (ان شاء اللہ) **جزاکم اللہ خیرًا فی الدارین.**

(وکیل ولی قاضی، حیدر آباد سندھ)

الجواب سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث کی سند درج ذیل ہے:

" النضر وهو ابن محمد اليمامي: ثنا عكرمة (بن عمار): حدثنا أبو زميل: حدثني ابن عباس ..... " (صحیح مسلم: ۲۵۰۱، دار السلام: ۶۴۰۹)

اور نضر بن محمد بن موسیٰ الجرشی الیمامی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ کے راوی ہیں اور ثقہ ہیں۔

انھیں امام عجلی، امام مسلم اور ابن حبان وغیرہم نے ثقہ قرار دیا۔ ابن حبان نے انھیں ثقات میں ذکر کر کے فرمایا: " ربما تفرد " بعض اوقات وہ تفرد کرتے تھے۔

حافظ ذہبی نے کہا: "ثِقة" (الکاشف ۳/۲۱۹)

حافظ ابن حجر نے فرمایا: " ثقة له أفراد " (تقریب التہذیب: ۱۴۸۷)

یاد رہے کہ ثقہ وصدوق راوی کا تفرد ذرا برابر بھی مضر نہیں ہوتا اور شذوذ کا مسئلہ اس سے علیحدہ ہے۔

اس سند کے دوسرے راوی عکرمہ بن عمار جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق ہونے کی وجہ سے حسن الحدیث ہیں، بشرطیکہ سماع کی تصریح کریں اور اس سند میں سماع کی تصریح موجود ہے۔

انھیں یحییٰ بن معین، علی بن المدینی اور عجلی وغیرہم جمہور نے ثقہ قرار دیا۔

ان کی یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت میں کلام ہے، لیکن یہ روایت یحییٰ بن ابی کثیر سے نہیں، لہٰذا اس جرح کا ہماری روایت سے کوئی تعلق نہیں۔

امام مسلم نے یہ وضاحت فرمائی ہے: "فأما ما كان منها عن قوم هم عند أهل الحديث متهمون أو عند الأكثر منهم فلسنا نتشاغل بتخريج حديثهم..."

میں نے ایسے راویوں کی روایت نہیں لی جنھیں اہل حدیث نے (بالاجماع) متہم (مجروح) قرار دیا ہے یا اکثریت کے نزدیک وہ مجروح ہیں۔ (مقدمہ صحیح مسلم ص ۶)

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اسماء الرجال میں راویوں پر محدثین کے اختلاف اور عدمِ تطبیق کی صورت میں ہمیشہ جمہور محدثین کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔

عکرمہ بن عمار پر ابن القیم اور ابن حزم کی جرح جمہور محدثین کی توثیق کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے غلط ہے اور اس حسن لذاتہ حدیث کو کذب (جھوٹ) کہنا سرے سے مردود اور باطل ہے۔

تیسرے راوی ابوزمیل سماک بن الولید الیمامی الکوفی کو امام احمد بن حنبل، ابن معین، عجلی اور ابن حبان وغیرہم نے ثقہ کہا ہے اور ابوحاتم الرازی نے فرمایا: " صدوق لا بأس به "

یہ ثقہ وصدوق راوی ہیں اور ان کے استاد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

نضر بن محمد والی یہ سند حسن لذاتہ، یعنی حجت ہے۔

اسے نضر بن محمد الیمامی کی سند سے درج ذیل اماموں نے بھی روایت کیا ہے:

۱: ابن ابی عاصم (الآحاد والمثانی ۱/۳۶۴ ح ۴۸۷، ۵/۴۱۸ ح ۳۰۷۰)

۲: ابن حبان (صحیح ابن حبان: ۷۱۶۶ دوسرا نسخہ: ۷۲۱۰)

۳: طبرانی (المعجم الکبیر ۲۳/۲۴۰ ح ۴۰۴، ۱۲/۱۹۹ ح ۱۲۸۸۵)

۴: بیہقی (السنن الکبریٰ ۷/۱۴۰)

۵: عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی (المصباح فی عیون الصحاح: ۴۸ شاملہ)

۶: حسین بن ابراہیم الجورقانی الہمدانی

(الاباطیل والمناکیر ۱/۱۸۹ ح ۱۸۰، وقال: "هذا حديث صحيح...")

اسے نضر بن محمد سے احمد بن یوسف السلمی، عباس بن عبدالعظیم العنبری اور احمد بن جعفر المعقری ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے۔

اصولِ حدیث اور اسماء الرجال کی رُو سے یہ سند حسن لذاتہ، یعنی صحیح ہے اور متن پر حافظ ابن القیم وغیرہ کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ صراحت نہیں کہ ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے یہ تینوں سوال ایک ہی مجلس میں کیے تھے، بلکہ امام بیہقی نے لکھا ہے:

" و إن كانت مسئلته الاولى إياه وقعت في بعض خرجاته إلى المدينة وهو كافر حين سمع نعي زوج أم حبيبة بأرض الحبشة و المسئلة الثانية و الثالثة وقعتا بعد اسلامه، لا يحتمل إن كان الحديث محفوظًا إلا ذلك۔ والله أعلم " اور اگر ان کا پہلا سوال (ام حبیبہ کی شادی کے متعلق) واقع ہوا تو یہ ان کے اس سفر میں تھا جب وہ کافر کی حیثیت سے مدینہ آئے تھے، جب انھوں نے (اپنی بیٹی) ام حبیبہ کے شوہر کی حبشہ میں موت کے بارے میں سنا، دوسرا اور تیسرا سوال ان کے اسلام لانے کے بعد کے ہیں، اگر یہ حدیث محفوظ ہے تو اس کے سوا دوسرا کوئی احتمال نہیں۔ واللہ اعلم

(السنن الکبریٰ ۷/۱۴۰)

اور یہی احتمال صحیح ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے ابوسفیان رضی اللہ عنہ مدینے آئے تو انھوں نے یہ سوال کیا تھا، لہٰذا صحیح مسلم کی یہ حدیث محفوظ ہے اور کسی صحیح دلیل کے ساتھ اس کا کوئی تعارض نہیں۔ ❶

آخر میں عرض ہے کہ اہلِ حدیث کے نزدیک صحیح بخاری و صحیح مسلم کی تمام مرفوع مسند متصل احادیث یقیناً اور قطعی طور پر صحیح ہیں اور زمانۂ تدوینِ حدیث میں بعض علماء کا بعض روایات یا بعض حروف پر جرح کرنا مرجوح و غلط ہے اور زمانۂ تدوین حدیث و زمانۂ شارحین حدیث (یعنی ۹۰۰ھ) کے بعد ان روایات پر جرح کرنا باطل و مردود ہے۔

حافظ ابن کثیر الدمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں: "ثم حكى أن الأمة تلقت هذين الكتابين بالقبول، سوى أحرف يسيرة ، انتقدها بعض الحفاظ كالدار قطني

---

❶ اس حدیث کی توجیہ میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "صحیح بات یہ ہے کہ جب ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو داماد بنانا ایک بہت بڑا شرف ہے تو انہیں یہ پیشکش کی کہ میں اپنی دوسری بیٹی کا نکاح آپ سے کرنا چاہتا ہوں جس کا نام عزہ ہے۔ اس سلسلے میں سیدنا ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے عزہ کی بہن سیدہ ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) سے مدد چاہی، جیسا کہ صحیح بخاری (۵۱۰۱، ۵۱۰۶) اور صحیح مسلم (۱۵/ ۱۴۴۹) میں سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن اور ابوسفیان کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ آپ نے فرمایا: "کیا تجھے یہ بات پسند؟" انہوں نے کہا: جی ہاں! اور صحیح مسلم میں (یہ وضاحت بھی) ہے کہ آپ میری بہن عزہ بنت ابی سفیان سے نکاح کر لیں...... (ممکن ہے عزہ کی کنیت ام حبیبہ ہو یا) راوی پر مشتبہ ہو گیا اور اس نے (عزہ کی جگہ) ام حبیبہ کہہ دیا...... اس قسم کے بے شمار نظائر و شواہد موجود ہیں۔ میں نے ایک جزء میں اس حدیث کی وجہ سے ایسے تمام نظائر کو یکجا کر دیا، والحمد للہ۔"

(الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ص ۲۵۴) (ندیم ظہیر)

وغيره،ثم استنبط من ذلك القطع بصحة ما فيها من الأحاديث ، لأن الأمة معصومة عن الخطأ، فما ظنت صحته وجب عليها العمل به، لا بُدّ وأن يكون صحيحاً في نفس الأمر، وهذا جيد" پھر (ابن الصلاح نے) بیان کیا کہ بے شک (ساری) امت نے ان دو کتابوں (صحیح بخاری وصحیح مسلم) کو قبول کر لیا ہے، سوائے تھوڑے حروف کے جن پر بعض حفاظ، مثلاً: دارقطنی وغیرہ نے تنقید کی ہے، پھر اس سے (ابن الصلاح نے) استنباط کیا کہ ان دونوں کتابوں کی احادیث قطعی الصحت ہیں کیونکہ امت (جب اجماع کر لے تو) خطا سے معصوم ہے۔ جسے امت نے (بالاجماع) صحیح سمجھا تو اس پر عمل (اور ایمان) واجب ہے اور ضروری ہے کہ وہ حقیقت میں بھی صحیح ہی ہو۔ اور (ابن الصلاح کی) یہ بات اچھی ہے۔ (اختصار علوم الحدیث ۱/۱۲۴، ۱۲۵)

اصولِ فقہ کے ماہر حافظ ثناء اللہ الزاہدی نے ایک رسالہ "أحاديث الصحيحين بين الظن واليقين" لکھا ہے، جس میں ابو اسحاق الاسفرائنی (متوفی ۴۱۸ھ) امام الحرمین الجوینی (متوفی ۴۷۸ھ) ابن القیسرانی (متوفی ۵۰۷ھ) ابن الصلاح (متوفی ۶۴۳ھ) اور ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) وغیرہم سے صحیحین کا صحیح وقطعی الثبوت ہونا ثابت کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ الدہلوی نے لکھا ہے: "أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع و أنهما متواتران إلى مصنفيهما وأنه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين" "صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں تمام محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل اور مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچی ہیں۔ جو ان کی عظمت نہ کرے وہ بدعتی ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔"

(حجۃ اللہ البالغہ عربی ۱/۱۳۴، اردو ۱/۲۴۲ ترجمہ: عبدالحق حقانی)

تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب: "صحیح بخاری کا دفاع"

یہی ہمارا منہج اور عقیدہ ہے اور الحمدللہ کتاب وسنت واجماع نیز آثارِ سلف صالحین سے

یہی منہج وعقیدہ ثابت ہے، لہٰذا اس کے خلاف ہم کسی کی بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

و ما علینا إلا البلاغ (۲۷/ شعبان ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۸/ جولائی ۲۰۱۲ء)

شیعہ کی پیش کردہ چند روایات کا تحقیقی جائزہ

سوال شیخ صاحب! شیعہ حضرات کی طرف سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر مختلف قسم کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ ان اعتراضات کی وجہ سے عام اَفرادِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دیا جائے، تاکہ جو لوگ حق کے متلاشی ہیں اور حقائق جاننا چاہتے ہیں وہ اندھیرے میں نہ رہیں۔ ذیل میں کچھ روایات ذکر کر رہا ہوں جو کہ (شیعہ کی طرف سے) عام طور پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص میں پیش کی جاتی ہیں۔

امید کرتا ہوں کہ آپ ان روایات کا تحقیقی جائزہ لیں گے، تاکہ جہالت اور ظلمت کے بادل چھٹ جائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

۱: صحیح بخاری (۴۲۴۰۔۴۲۴۱، ۶۷۲۶) کی ایک روایت۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئیں اور وفات تک بات نہ کی۔

براہِ مہربانی مختلف روایات کی روشنی میں اس ناراضی کی حقیقت کو واضح کیجئے!

۲: کیا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بعد میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئیں؟

السنن الکبریٰ للبیہقی (۶/ ۳۰۰۔۳۰۱) کی اس روایت کی اسنادی حیثیت کیسی ہے؟

۳: کیا سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا؟

صحیح مسلم (۶۲۲۰/ ۲۴۰۴) کی روایت کی کیا توجیہ ہے؟

☆ ریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ (۱/ ۲۶۲) میں یہ الفاظ ہیں: ''عن سعید قال: أمر معاویۃ سعدًا أن یسب أبا تراب.'' کیا یہ روایت سنداً صحیح ہے؟

٤: البدایہ والنہایہ (۷/ ۳۷۷) میں موجود ایک روایت:

"وقال أبو زرعة الدمشقي :حدثنا أحمد بن خالد الوهبي أبو سعيد :ثنا محمد بن إسحاق عن عبد اللّٰه بن أبي نجيح عن أبيه ... ثم ذكر علي بن أبي طالب فوقع فيه ... " کی سند کیسی ہے؟

٥: سنن ابن ماجہ (۱۲۱) میں موجود الفاظ:" فذكروا عليًا ، فنال منه " کے الفاظ کے کیا معنی ہوں گے؟

یہ روایت صحیح ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے الصحیحہ (۱۷۵۰) میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

شیخ سندھی کی شرح بھی ملحوظ خاطر رہے۔ (دیکھئے شرح سنن ابن ماجہ ۱/ ٦)

☆ کتاب العقد الفرید (۳/ ۳۰۰) میں موجود روایت کی حیثیت اور اس کتاب کی حیثیت کیا ہے؟

٦: مسند احمد (٦/ ۳۲۳ ح ۲٦۷۹۱)

مزید دیکھئے مسند ابی یعلیٰ (۱۲/ ۴۴۴۔۴۴۵)

۷: العبر فی خبر من غبر (۱/ ۳۵ و ان لا يسب عليًا بحضرته)

کیا یہ روایت سنداً صحیح ہے؟

۸: تاریخ ابی الفداء (۱/ ۲۸۳، ان لا يشتم عليًا)

۹: البدایہ والنہایہ (۸/ ۱۷، ان لا يسب علي)

۱۰: تاریخ دمشق (۱۳/ ۲٦۴ ولا يسب علي)

امید ہے کہ مندرجہ بالا روایات جو سب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق آئی ہیں، ان کا ضرور جائزہ لیں گے۔ (ڈاکٹر عبدالحفیظ سموں، بدین سندھ)

الجواب ان روایات کی تحقیق، تفصیل اور مفہوم درج ذیل ہے:

۱: صحیح بخاری کی اس حدیث میں آیا ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا ابو بکر (الصدیق) رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراثِ مدینہ، فدک اور خیبر کے خمس کا بقیہ حصہ طلب کیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ

نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لا نورث، ما ترکنا صدقة.)) ''ہماری (انبیاء ورسل کی) وراثت نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔''

نیز فرمایا: محمد ﷺ کی آل والے اس مال سے کھا سکتے ہیں اور اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کے صدقات کی حالت کو تبدیل نہیں کروں گا جو نبی ﷺ کے زمانے میں حالت تھی اور میں وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد صحیح بخاری میں لکھا ہوا ہے: ''فوجدت فاطمة علٰی أبي بکر في ذلك فهجرته فلم تکلمه حتی توفیت، و عاشت بعد النبي ﷺ ستة أشهر.'' پس فاطمہ نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں اس بات کو محسوس کیا تو ان سے جدائی کی اور اپنی وفات تک ان سے (اس کے بارے میں) کوئی کلام نہیں کیا۔ وہ نبی ﷺ کے بعد چھ مہینے زندہ رہیں۔ (صحیح بخاری: ۴۲۴۰۔۴۲۴۱)

اس صحیح حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو اپنی کسی ذاتی وجہ سے باغ فدک وغیرہ دینے سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ نبی کریم ﷺ کی صحیح وثابت حدیث پر عمل کیا تھا، لہٰذا وہ اس مسئلے میں بالکل معذور ہیں۔

اس حدیث کی تحقیق ایک مضمون کی صورت میں پیشِ خدمت ہے:

اَنبیاء کی وراثت علم ہے

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لا نورث، ما ترکنا صدقة.)) ''ہماری وراثت نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔''

(صحیح بخاری: ۴۲۴۰۔۴۲۴۱، صحیح مسلم: ۱۷۵۹، دارالسلام: ۴۵۸۰)

اس حدیث کی مختصر و جامع تخریج و تحقیق درج ذیل ہے:

1) سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' ((لا نورث، ما ترکنا صدقة.)) إنما یأکل آل محمد ﷺ في هذا المال،

و إني والله !لا أغيّر شيئًا من صدقة رسول الله ﷺ عن حالها التي كانت عليها في عهد رسول الله ﷺ و لأعملنّ فيها بما عمل (به) رسول الله ﷺ ." ہماری وراثت نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

(ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:) محمد ﷺ کی آل والے تو اس مال سے کھائیں گے اور اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کے صدقات میں سے کسی چیز کو بھی اس حالت سے نہیں بدلوں گا جس پر وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھی اور میں ضرور بالضرور وہی عمل کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۴۲۴۰۔ ۴۲۴۱، صحیح مسلم: ۱۷۵۹، واللفظ لہ)

۲) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی (بعض) ازواج نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے نبی ﷺ کی میراث میں سے اپنا حصہ مانگا تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ "ہماری وراثت نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے؟"

(صحیح بخاری: ۶۷۳۰، صحیح مسلم: ۱۷۵۸، موطأ امام مالک روایۃ ابن القاسم: ۴۴، روایۃ یحییٰ ۲/۹۹۳ ح ۱۹۳۵)

۳) سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا نورث، ما تركناه صدقة.)) "ہماری وراثت نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔" (صحیح بخاری: ۳۰۹۴، ۴۰۳۳، صحیح مسلم: ۱۷۵۷)

۴) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا تقتسم ورثتي دينارًا ولا درهمًا، ما تركت بعد نفقة نسائي و مؤنة عاملي فهو صدقة)) "میرے ورثاء ایک دینار اور ایک درہم بھی تقسیم میں نہیں لیں گے۔ میری بیویوں کے نان نفقے اور میرے عامل کے خرچ کے بعد میں نے جو بھی چھوڑا وہ سب صدقہ ہے۔"

(صحیح بخاری: ۲۷۷۶، صحیح مسلم: ۱۷۶۰، الموطأ روایۃ یحییٰ ۲/۹۹۳ ح ۱۹۳۶، روایۃ ابن القاسم: ۳۷۲)

۵) سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف، سیدنا عثمان بن عفان، سیدنا زبیر بن العوام اور سیدنا سعد بن

ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''ہماری وراثت نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔'' (صحیح بخاری: ۴۰۳۳، صحیح مسلم: ۱۷۵۷)

۶) سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ دیکھئے فقرہ: ۵

۷) سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ دیکھئے فقرہ: ۵

۸) سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ دیکھئے فقرہ: ۵

۹) سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (صحیح بخاری: ۵۳۵۸)

۱۰) سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (صحیح بخاری: ۵۳۵۸)

۱۱) سیدہ جویریہ بنت الحارث کے بھائی عمرو بن الحارث (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت ترکے میں نہ درہم چھوڑا اور نہ دینار چھوڑا، نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کوئی چیز چھوڑی سوائے سفید خچر کے، اسلحے اور کچھ زمین کے جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔ (صحیح بخاری: ۲۷۳۹)

اس سے ثابت ہوا کہ اصولِ محدثین پر یہ حدیث متواتر ہے۔

نیز دیکھئے قطف الازھار المتناثرہ فی الاخبار المتواترہ للسیوطی (ح ۱۰۰) نظم المتناثر من الحدیث المتواتر (ح ۲۷۲) اور لقط اللآلی المتناثرۃ فی الاحادیث المتواترہ (ح ۲۶)

شیعہ اسماء الرجال کی رو سے صحیح روایت میں آیا ہے کہ ابوعبداللہ (جعفر بن محمد الصادق) رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وإنّ العلماء ورثة الأنبياء، إن الأنبياء لم يورّثوا ديناراً ولا درهماً ولكن ورّثوا العلم فمن أخذ منه أخذ بحظ وافر.)) اور بے شک انبیاء کے وارث علماء ہیں، بے شک نبیوں کی وراثت درہم اور دینار نہیں ہوتی لیکن وہ علم کی وراثت چھوڑتے ہیں، جس نے اسے لے لیا تو اس نے بڑا حصہ لے لیا۔ (الاصول من الکافی للکلینی ج ۱ ص ۳۴ باب ثواب العالم والمتعلم ح ۱، وسندہ صحیح عند الشیعۃ)

اہلِ سنت کی متواتر احادیث اور شیعہ کی اس عند الشیعہ صحیح روایت سے ثابت ہوا کہ انبیاء و رسل کی مالی وراثت نہیں ہوتی بلکہ وہ جو کچھ چھوڑ جائیں صدقہ ہے۔ ان کی وراثت علم

کی وراثت ہے اور خوش نصیب ہے وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کے علم کو حاصل کرے، اس پر کما حقہ عمل کرے اور اپنی ساری زندگی کتاب و سنت کے مطابق گزار دے۔

ایک آیت میں آیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام داود علیہ السلام کے وارث ہوئے، اس سے مراد مالی وراثت نہیں بلکہ علم کی وراثت ہے۔

صحیح اور متواتر حدیث کی وجہ سے باغِ فدک کا مطالبہ پورا نہ کرنا ایسا شرعی عذر ہے، جس کا کوئی شخص زمانۂ تدوینِ حدیث کے بعد انکار نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

جس حدیث کو سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا زبیر بن العوام، سیدنا سعد بن ابی وقاص اور سیدنا عباس بن عبدالمطلب وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین نے بیان کیا، اسے کون "مائی کالال" ضعیف کہہ سکتا ہے؟!

جب ناراضی کی اصل وجہ ختم ہوئی تو شیعہ کا اعتراض بھی ختم ہو گیا۔

فضیل بن مرزوق الرقاشی الکوفی (صدوق شیعی، وثقہ الجمہور) سے روایت ہے کہ (امام) زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رحمہ اللہ) نے فرمایا:

"أما أنا فلو كنت مكان أبي بكر رضي الله عنه لحكمت بمثل ما حكم به أبو بكر رضي الله عنه في فدك" اگر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جگہ ہوتا تو فدک کے بارے میں اسی طرح فیصلہ کرتا جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا تھا۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۶/۳۰۲، کتاب الاعتقاد لہ ص ۴۹۷، دلائل النبوۃ للبیہقی ۷/۲۸۱ ح ۳۳۲۸، فضائل الصحابۃ للدارقطنی: ۴۶ و سندہ حسن)

فضیل بن مرزوق تک سند صحیح ہے اور وہ جمہور کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے صدوق وحسن الحدیث راوی ہیں۔

امام ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین الباقر رحمہ اللہ نے فرمایا: "من جهل فضل أبي بكر و عمر رضي الله عنهما فقد جهل السنة" جس شخص کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل معلوم نہیں تو وہ شخص سنت سے جاہل ہے۔ (کتاب الشریعۃ للآجری ص ۸۵۱ ح ۱۸۰۳، وسندہ حسن)

اور انھوں نے اپنی بیماری کی حالت میں فرمایا:"اللھم إني أتولى أبا بكر و عمر و أحبهما، اللهم إن كان في نفسي غير هذا فلا نالتني شفاعة محمد ﷺ يوم القيامة." اے اللہ! میں ابوبکر و عمر کو اپنا ولی مانتا ہوں اور ان دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ اے اللہ! اگر میرے دل میں اس کے خلاف کوئی دوسری بات ہو تو قیامت کے دن مجھے محمد ﷺ کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ (تاریخ دمشق ابن عساکر ۲۲۳/۵۷ وسندہ حسن)

امام جعفر بن محمد الصادق رحمہ اللہ نے فرمایا:" برئ الله ممن تبرأ من أبي بكر و عمر" اللہ اس شخص سے بری ہے جو شخص ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) سے بری ہے۔

(فضائل الصحابۃ للامام احمد بن حنبل ۱/۱۶۰ ح ۱۴۳، وسندہ صحیح)

سیدنا ابو الطفیل عامر بن واثلہ اللیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو بلایا (اور فرمایا:)"أنت ورثت رسول الله ﷺ أم أهله ؟" کیا رسول اللہ ﷺ کے وارث آپ ہیں یا آپ کے گھر والے؟ انھوں نے جواب دیا: (میں) نہیں بلکہ آپ کے گھر والے ہیں۔

فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: پھر رسول اللہ ﷺ کے مالِ غنیمت والا حصہ کہاں ہے؟ تو ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((إن الله عزوجل إذا أطعم نبيًّا طعمة ثم قبضه جعله للذي يقوم من بعده.)) "بے شک اللہ تعالیٰ جب اپنے نبی کو (مالِ غنیمت میں سے) کچھ نصیب فرماتا ہے، پھر اس نبی کی روح قبض کر لیتا ہے تو اسے ان کے جانشین کے کنٹرول میں دے دیتا ہے۔"

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مال کو تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔

فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: " فأنت و ما سمعت من رسول الله ﷺ أعلم "

پس آپ اور جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے زیادہ جانتے ہیں۔

(مسند احمد ۱/۴ ح ۱۴، وسندہ حسن)

بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ ہے: "ثم رجعت" پھر (فاطمہ رضی اللہ عنہا) واپس چلی گئیں۔ (السنن الکبریٰ ۳۰۳/۶ وسندہ حسن)

یہ روایت بہت زیادہ مختصر ہے اور صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث کے ساتھ ملا کر اس کا یہ مطلب بنتا ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ کی کوئی وراثت ہوتی تو آپ کے اہل (بیویاں اور بیٹیاں) سب سے زیادہ اس کی وارث ہوتیں۔ تاہم اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رجوع کر لیا تھا، لہٰذا ناراضی ختم ہوگئی۔

۲: آپ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، غالباً وہ درج ذیل روایت ہے:

"إسماعيل بن أبي خالد عن الشعبي قال: لما مرضت فاطمة رضي الله عنها أتاها أبو بكر الصديق رضي الله عنه فاستأذن عليها فقال علي رضي الله عنه: يا فاطمة! هذا أبو بكر يستأذن عليك؟ فقالت: أتحب أن آذن له؟ قال: نعم، فأذنت له فدخل عليها يترضاها وقال: والله ما تركت الدار والمال والأهل والعشيرة إلا ابتغاء مرضاة الله و مرضاة رسوله و مرضاتكم أهل البيت، ثم ترضاها حتى رضيت."

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۳۰۱/۶ وقال: "ھذا مرسل حسن باسناد صحیح" کتاب الاعتقاد للبیہقی ص ۴۹۶، دلائل النبوۃ ۲۸۱/۷ ح ۳۳۳۷، طبقات ابن سعد ۲۷/۸)

اس روایت کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

(۱) اسماعیل بن ابی خالد ثقہ ہونے کے ساتھ مدلس راوی ہیں۔

حاکم نیشاپوری نے انھیں مدلس کہا۔ (المدخل الی الاکلیل ص ۴۶)

انھیں حافظ ابن حجر (طبقہ ثانیہ) علائی، ابو زرعہ ابن العراقی، حلبی، ابو محمود المقدسی اور سیوطی نے مدلسین میں شمار کیا۔

(طبقات المدلسین ۲/۳۶، جامع التحصیل ص ۱۰۵، کتاب ابی زرعہ ابن العراقی: ۳، حلبی ص ۱۴)

امام عجلی نے ان کی توثیق کے بعد فرمایا: "ربما أرسل الشيء عن الشعبي فإذا

وقف أخبـــر'' وہ بعض اوقات یا اکثر اوقات شعبی سے مرسل روایتیں بیان کرتے (یعنی تدلیس کرتے تھے) پھر جب انھیں روکا جاتا تو (اصل راوی کا نام) بتادیتے تھے۔

(تاریخ الاسلام للذہبی ۹/ ٦٨، الثقات یعنی تاریخ العجلی: ٨٧)

اس قول میں تدلیس پر ارسال کا لفظ لغوی طور پر استعمال ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ امام عجلی کے نزدیک اسماعیل بن ابی خالد رحمہ اللہ امام شعبی رحمہ اللہ سے بعض اوقات یا اکثر اوقات تدلیس کرتے تھے۔

(۲) یہ سند مرسل یعنی منقطع ہے۔

بطورِ فائدہ عرض ہے کہ مسند احمد کی ایک روایت میں آیا ہے کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے پاس تشریف لے گئیں تو فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا کہ میں آپ کی اہل میں سے سب سے پہلے آپ سے جاملوں گی۔

(ج ٦ ص ٢٨٣، موسوعہ حدیثیہ ۴۴/ ١٩ ح ٢٦۴٢٠، رحماء بینہم لمحمد نافع ج ١ ص ١٣۴)

اس کی سند منقطع ہے۔ جعفر بن عمرو بن امیہ نے نہ تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا اور نہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے وقت وہ موجود تھے۔

فقرہ نمبر ١ کے تحت مسند احمد (١/ ۴ ح ١۴) والی حدیث سے یہ ظاہر ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ پر اعتراض سے رجوع کر لیا تھا، یعنی ان کا راضی ہو جانا صحیح ہے، لہٰذا نا راضی والی روایت منسوخ ہے۔ واللہ اعلم

۳: یہ تو صحیح ہے کہ سیدنا و مولانا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں (بنو اُمیہ کی طرف سے) سَبّ کیا جاتا تھا، یعنی بُرا بھلا کہا جاتا تھا لیکن خود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ سب و شتم کہنا ثابت نہیں۔

اس سلسلے میں ریاض النضرۃ نامی کتاب کی روایت بے سند و بے حوالہ ہے۔

صحیح مسلم وغیرہ میں '' أمر معاویه بن أبي سفیان سعدًا'' کے الفاظ ہیں یعنی معاویہ بن ابی سفیان نے سعد کو حکم دیا تھا۔ (ترقیم دارالسلام: ٦٢٢٠)

کیا حکم دیا تھا؟ اس کی صراحت کہیں نہیں اور عین ممکن ہے کہ مجلس میں یہ حکم دیا ہو کہ میرے قریب آکر بیٹھ جائیں۔

محمد بن خلیفہ الوشتانی الابی اور قاضی عیاض المالکی کی عبارات میں یہ صراحت موجود ہے کہ اس روایت میں یہ صراحت نہیں کہ امیر معاویہ نے سب وشتم کا حکم دیا تھا۔

(اکمال اکمال المعلم ۸/ ۲۲۸، اکمال المعلم ۷/ ۴۱۵)

ریاض النضرۃ والی روایت تو باطل و مردود ہے۔

ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن محمد: محبّ الدین الطبری المکی (م۶۹۴ ھ) کی یہ کتاب: ریاض النضرۃ ایک غیر مستند اور ناقابلِ حجت کتاب ہے، الا یہ کہ کسی خاص روایت کی تحقیق کر کے اس کا صحیح یا حسن ہونا ثابت ہو جائے۔

بے سند کتابوں کے بجائے اصل اور باسند کتابوں کی طرف رجوع کرنا اور پھر ہر روایت کی تحقیق کر کے صحیح و ثابت سے استدلال کرنا ہی ضروری ہے۔

٤: البدایہ والنہایہ والی یہ روایت تاریخ دمشق لابن عساکر (۴۲/ ۱۱۹) میں بحوالہ تاریخ ابی زرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو الدمشقی موجود ہے۔

اس روایت کی سند تین وجہ سے ضعیف و مردود ہے:

(۱) محمد بن اسحاق بن یسار صدوق مدلس ہیں اور سند میں سماع کی تصریح نہیں۔

(۲) عبداللہ بن ابی نجیح ثقہ مدلس ہیں اور یہ سند عن سے ہے۔

ذکرہ ابن حجر فی المدلسین (۳/۷۷)

(۳) ابو نجیح یسار المکی کی سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں، یعنی یہ سند منقطع ہے۔

٥: سنن ابن ماجہ (۱۲۱) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۱۲/ ۶۱ ح ۳۲۰۶۹) والی روایت کی سند درج ذیل ہے:

"عبد الرحمن بن سابط عن سعد بن أبي وقاص..."

اس سند کے بارے میں شیخ البانی نے لکھا ہے:" قلت : و إسناده صحيح "

(الصحیحہ ۴/۳۳۵ ح ۱۷۵۰)

حالانکہ امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: عبدالرحمٰن بن سابط نے سعد بن ابی وقاص سے (کچھ) نہیں سنا۔ (تاریخ ابن معین: ۳۶۵، کتاب المراسیل لابن ابی حاتم ص ۱۲۸، فقرہ: ۴۵۹)

یعنی یہ سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس منقطع روایت کو "و إسناده صحيح" کہنا بہت عجیب و غریب ہے۔

تنبیہ: راقم الحروف نے سنن ابن ماجہ کی اس روایت کو منقطع قرار دینے کے بعد شواہد کی وجہ سے "صحیح" قرار دیا تھا، حالانکہ شواہد میں "فنال منه" کا نام و نشان تک نہیں، لہٰذا یہ روایت صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے اور اس روایت کے بارے میں سنن ابن ماجہ کی سابقہ تحقیق منسوخ ہے۔

اس بارے میں روایت کے ضعیف ثابت ہونے کے بعد شیخ سندھی کی تشریح (ج ۱ ص ۵۸) کی کوئی حیثیت نہیں۔

☆ ابن عبد ربہ الاندلسی (۳۲۸ھ) کی کتاب العقد الفرید (۳/۳۰۰، دوسرا نسخہ ۵/۱۱۵، شاملہ) والی روایت بے سند ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

یہ ساری کتاب (العقد الفرید) مشکوک و ناقابلِ اعتبار ہے۔

(نیز دیکھئے کتب حذر منها العلماء ج ۲ ص ۴۴۔۴۵)

:٦ مسند احمد (۶/۳۲۳ ح ۲۶۷۴۸) کی روایت درج ذیل ہے:

"إسرائيل عن أبي إسحاق عن أبي عبد اللّٰه الجدلي قال: دخلت على أم سلمة فقالت لي: أيسبّ رسول اللّٰه ﷺ فيكم؟ قلت: معاذ اللّٰه أو سبحان اللّٰه أو كلمة نحوها، قالت: سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول: من سبّ عليًّا فقد سبني" (نیز دیکھئے المستدرک ۳/۱۲۱، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۲/۷۶۔۷۷، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۳/۳۲۲۔ ۳۲۳ ح ۷۳۷)

اس سند میں ابواسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی مشہور ثقہ مدلس ہیں اور سند عن سے ہے، لہٰذا ضعیف ہے۔

مسند ابی یعلیٰ (۱۲/۴۴۴۔۴۴۵ ح ۷۰۱۳) اور المعجم الکبیر (۲۳/۳۲۳ ح ۷۳۸) کی روایت کی سند درج ذیل ہے:

"عيسى بن عبد الرحمن البجلي عن السدي عن أبي عبد الله الجدلي قال قالت أم سلمة ..."

اس کے بارے میں حسین سلیم اسد نے لکھا ہے:

"رجاله ثقات إلا أنه عند منقطع . ما علمت روايه لإسماعيل بن عبد الرحمن السدي عن أبي عبد الله الجدلي فيما اطلعت عليه. والله أعلم"

یعنی یہ سند شبۂ انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ان دونوں روایتوں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینے کی صراحت موجود نہیں۔

۷: العبر فی خبر من غبر للذہبی (۱/۳۵ وفیات ۴۱ھ) والی روایت مکمل سند نہ ہونے کی وجہ سے مردود ہے، نیز مذکورہ سند کا راوی مجالد بن سعید الہمدانی بھی عند الجمہور ضعیف ہے۔

۸: ابوالفداء (م ۷۳۲ھ) کی بے سند تاریخ (المختصر فی اخبار البشر ۱/۱۸۳) کی روایت بھی بے سند ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

۹: البدایہ والنہایہ (۸/۱۷) کی روایت بے سند ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

۱۰: تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۳/۲۶۴) کی سند میں مجالد بن سعید ضعیف راوی ہے۔

حافظ نورالدین الہیثمی نے فرمایا: "وضعفه الجمهور" (مجمع الزوائد ۹/۴۱۶)

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ شیعہ کی پیش کردہ روایات کا بڑا حصہ ضعیف، بے سند و مردود ہے اور صحیح روایات سے وہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہم پر یہ ضروری ہے کہ تمام صحابہ کرام سے محبت کریں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی

زبان درازی نہ کریں، بلکہ بہت احتیاط کریں۔ وما علینا إلا البلاغ

(۱۱/شوال ۱۴۳۳ھ بمطابق ۳۰/ اگست ۲۰۱۲ء)

علمِ غیب کے بارے میں ایک سخت ضعیف روایت

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إن اللّٰه تعالیٰ قد رفع لي الدنیا فأنا أنظر إلیها و إلیٰ ما هو کائن فیها إلیٰ یوم القیامة کأنما أنظر إلیٰ کفي هذه، جلیان من اللّٰه جلاه لنبیه کما جلاه للنبیین من قبله." بے شک اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اٹھا کر میرے سامنے کر دیا ہے اور میں دنیا کو اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں جیسا کہ میں اپنے ہاتھ کی اس ہتھیلی کو دیکھتا ہوں۔ یہ اللہ کی طرف سے کشف واظہار ہے جو اس نے اپنے نبی کے لئے ظاہر کیا، جیسا کہ اس نے آپ سے پہلے نبیوں کے سامنے ظاہر کیا تھا۔

(کنز العمال ۱۱/ ۴۲۰ ح ۳۱۹۷۱ بحوالہ طبرانی | مجمع الزوائد ۸/ ۲۸۷ اور حلیۃ الاولیاء ۶/ ۱۰۱)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (محمد ہارون، برنالہ آزاد کشمیر)

الجواب طبرانی اور ابونعیم اصبہانی کی اس روایت کی سند درج ذیل ہے:

"بقیة عن سعید بن سنان: ثنا أبو الزاهریة عن کثیر بن مرة عن ابن عمر رضي اللّٰه عنه" مرفوعًا.

اس کا بنیادی راوی ابو مہدی سعید بن سنان الشامی الحمصی سخت مجروح راوی ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: "منکر الحدیث" (کتاب الضعفاء تحقیقی: ۱۳۶ص ۴۸)

امام نسائی نے فرمایا: "متروك الحدیث" (کتاب الضعفاء للنسائی: ۲۶۸)

امام دارقطنی نے اسے ضعفاء ومتروکین میں ذکر کیا۔ (الضعفاء والمتروکون: ۲۷۰)

امام ابوحاتم الرازی نے اسے ضعیف الحدیث منکر الحدیث قرار دیا اور فرمایا:

اس نے ابوالزاہریہ (حدیر بن کریب) عن کثیر بن مرہ عن ابن عمر کی سند سے تیس (۳۰) منکر

روایتیں بیان کی ہیں۔ (الجرح والتعدیل ۴/ ۴۲۸ ت ۱۸۱۴)

امام مسلم نے فرمایا: "منکر الحدیث" (کتاب الکنی ص ۱۰۹ ا ۱۸۵ مخطوط مصور)

دیگر بہت سے محدثین نے بھی شدید جرح کی ہے، مثلاً حافظ ذہبی نے فرمایا:

"متروك متهم" (المغنی فی الضعفاء ۱/ ۴۰۶ ت ۲۴۱۱)

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا: "متروك ورماه الدارقطني وغيره بالوضع"

(تقریب التہذیب: ۲۴۳۳)

اس جم غفیر کے مقابلے میں صدقہ بن خالد سے مروی ہے کہ "وكان ثقة مرضيًّا"

اور وہ ثقہ پسندیدہ تھا۔ (الجرح والتعدیل ۴/ ۴۲۸)

اس قول کی سند میں "صاحب لی من بنی تمیم" نامعلوم ہے اور نامعلوم کی توثیق اصولِ حدیث کی رُو سے معتبر نہیں۔ (دیکھئے اختصار علوم الحدیث لابن کثیر مترجم اردو ص ۶۱۔۶۲ قسم: ۲۳)

حافظ نور الدین الہیثمی نے ابومہدی سعید بن سنان کے بارے میں فرمایا:

"ضعيف جدًا و نقل عن بعضهم توثيقه ولم يصح"

وہ سخت ضعیف ہے اور بعض سے اس کی توثیق منقول ہے اور (یہ) صحیح نہیں۔

(مجمع الزوائد ۵/ ۱۲۷)

اس روایت میں دوسری علت قادحہ یہ ہے کہ بقیہ بن ولید صدوق مدلس راوی ہیں اور یہ روایت عن سے ہے۔ مدلسین کے بارے میں اصولِ حدیث کا مشہور مسئلہ ہے کہ (صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں میں) مدلس کی عن والی روایت ضعیف و مردود ہوتی ہے۔

خلاصۃ التحقیق یہ ہے کہ روایت مسئولہ سخت ضعیف و مردود ہے، لہٰذا اس سے استدلال جائز نہیں۔ وما علينا إلا البلاغ

(۲/ فروری ۲۰۱۳ء)

کیا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یزید کی تعریف کی تھی؟

سوال بلاذری نے عبدالرحمٰن بن معاویہ سے نقل کیا ہے کہ عامر بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: ہم مکہ میں تھے کہ امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی وفات کی خبر دینے والا ہمارے پاس سے گزرا تو ہم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، وہ بھی مکہ ہی میں تھے۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور دستر خوان لگایا جا چکا تھا لیکن ابھی کھانا نہیں آیا تھا تو ہم نے ان سے کہا: اے ابوالعباس! ایک قاصد امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی وفات کی خبر لایا ہے۔

یہ سن کر عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) کچھ دیر تک خاموش رہے پھر فرمایا: اے اللہ! معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر اپنی رحمت وسیع فرما۔ یقیناً آپ ان لوگوں کے مثل تو نہ تھے جو آپ سے پہلے گزر چکے، لیکن آپ کے بعد بھی آپ جیسا کوئی نہ دیکھنے کو ملے گا اور آپ کا بیٹا یزید آپ کے خاندان کے صالح لوگوں میں سے ہے۔ اس لئے اے لوگو! اپنی اپنی جگہوں پر رہو اور اس کی بیعت کر کے اطاعت کرو۔ الخ (انساب الاشراف ۵/۳۰۲ ص ۲۱۴۶، دوسرا نسخہ ۵/۲۹۰)

کیا یہ روایت صحیح یا حسن ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اس روایت کے راوی ابوالحویرث عبدالرحمٰن بن معاویہ بن الحویرث الانصاری الزرقی المدنی کے بارے میں حافظ ہیثمی نے فرمایا:

"والأکثر علی تضعیفه"

اور اکثر (جمہور) نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد ۱/۳۲)

حافظ ابن حجر نے انھیں "من السادسة" یعنی چھٹے طبقے میں ذکر کیا ہے۔

(تقریب التہذیب: ۴۰۱۱)

ابوالحویرث عبدالرحمٰن بن معاویہ کے ضعیف عند الجمہور ہونے کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون: عبدالرحمٰن بن معاویہ بن الحویرث اور جمہور محدثین۔

عامر بن مسعود بن اُمیہ بن خلف الجمحی رضی اللہ عنہ کے صحابی یا تابعی ہونے میں اختلاف ہے، اگر وہ صحابی ہیں تو عبدالرحمٰن بن معاویہ کی اُن سے روایت منقطع ہے، کیونکہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

" السادسة :طبقة عاصروا الخامسة لكن لم يثبت لهم لقاء أحد من الصحابة كابن جريج" (مقدمۃ التقریب ص ۱۵)

اور اگر وہ تابعی ہیں تو عبدالرحمٰن بن معاویہ کی ان سے ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ معاصرت ہی ثابت ہے۔

حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں دونوں کے تراجم میں ایک دوسرے سے استادی شاگردی کا تعلق بھی بیان نہیں کیا اور نہ کسی اور کتاب میں ایسی کوئی صراحت ملی ہے، لہٰذا اس سند میں انقطاع کا شبہ ہے۔

خلاصۃ التحقیق یہ کہ یہ روایت عبدالرحمٰن بن معاویہ کے ضعف، نیز متصل نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف و مردود ہے، لہٰذا معاصرین میں سے کسی محمد بن ہادی الشیبانی کا اسے حسن قرار دینا صحیح نہیں۔

جو شخص اس روایت کو حسن یا صحیح سمجھتا ہے، اُس پر یہ ضروری ہے کہ وہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کی عامر بن مسعود سے ملاقات یا معاصرت ثابت کرے، نیز عبدالرحمٰن بن معاویہ کا جمہور کے نزدیک موثق ہونا بھی ثابت کرے، ورنہ علمی میدان میں بے دلیل دعوؤں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

تنبیہ: انساب الاشراف للبلاذری کے موجودہ مطبوعہ نسخے کے بارے میں صحیح تحقیق کی ضرورت ہے کہ کیا واقعی یہی نسخہ بلاذری سے ثابت ہے۔

(۲۶/ مارچ ۲۰۱۳ء)

کیا یزید شرابی اور تارکِ صلوٰۃ تھا؟

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ

''جب اہلِ مدینہ یزید (بن معاویہ) کے پاس سے واپس آئے تو عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی محمد بن حنفیہ کے پاس آئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ یزید کی بیعت توڑ دیں لیکن محمد بن حنفیہ نے ان کی بات سے انکار کر دیا، تو عبداللہ بن مطیع نے کہا:

یزید شراب پیتا ہے، نماز چھوڑتا ہے اور کتاب اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

تو محمد بن حنفیہ نے کہا کہ میں نے تو اس میں ایسا کچھ نہیں دیکھا جیسا کہ تم کہہ رہے ہو، جبکہ میں اس کے پاس جا چکا ہوں اور اس کے ساتھ قیام کر چکا ہوں۔

میں نے اس دوران میں اسے نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، علم دین کا طالب اور سنت کا ہمیشہ پاسدار پایا۔ تو لوگوں نے کہا: یزید ایسا آپ کو دکھانے کے لیے کر رہا تھا...'' الخ

(البدایہ والنہایہ ۸/۲۳۳، تاریخ الاسلام للذہبی ۵/۴/۲۷)

کیا یہ روایت سنداً صحیح ہے؟ (ایک سائل)

الجواب یہ روایت حافظ ابن کثیر اور حافظ ذہبی دونوں نے بغیر کسی سند کے ساتھ ابوالحسن علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف المدائنی (م ۲۲۴ھ) سے نقل کی ہے۔

مدائنی ۲۲۴ھ میں فوت ہوئے، جبکہ حافظ ابن کثیر ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

حافظ ذہبی ۶۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور دونوں (ابن کثیر و ذہبی) نے یہ وضاحت و صراحت نہیں کی کہ انھوں نے یہ روایت مدائنی کی کسی کتاب یا کسی دوسری کتاب سے مدائنی کی سند سے نقل کی ہے، لہٰذا یہ روایت سخت منقطع و بے سند یعنی مردود ہے۔

جناب کفایت اللہ سنابلی صاحب کا یہ کہنا: ''اس روایت کو امام ابن کثیر اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے امام مدائنی کی کتاب سے سند کے ساتھ نقل کر دیا ہے...'' بالکل عجیب وغریب

ہے۔سنابلی صاحب کوکس نے بتایا ہے کہ حافظ ابن کثیر اور حافظ ذہبی نے یہ روایت مدائنی کی فلاں کتاب سے نقل کی ہے؟

حوالہ پیش کریں اور مدائنی کی کتاب کا نام بھی بتائیں تا کہ اصل کتاب تلاش کر کے یہ روایت دیکھی جائے۔

نیز بطورِ الزام عرض ہے کہ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یزید بن معاویہ کا شرابی اور تارک الصلوٰۃ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عبداللہ بن مطیع بن الاسود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، یعنی وہ رؤیت کے لحاظ سے صحابی ہیں۔

انھیں حافظ ابن حبان، ابن الاثیر، ذہبی اور ابن حجر وغیرہم نے صحابہ میں ذکر کیا۔ (دیکھئے کتاب الثقات لابن حبان ۳/ ۲۱۹، اسد الغابہ ۳/ ۲۶۲، تجرید اسماء الصحابہ للذہبی ۱/ ۳۳۵، فتح الباری ۶/ ۶۱۵ تحت ۳۶۰۲)

حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں لکھا ہے: "لـــه رؤية" یعنی انھیں رؤیت حاصل ہے۔ (۳۶۲۶)

حافظ ابن کثیر نے بھی لکھا ہے:

" ولد في حياة رسول الله ﷺ و حنكه و دعاله بالبركة"

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیدا ہوئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں گھٹی دی اور ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ (البدایہ والنہایہ ۹/ ۱۲۶، وفیات ۷۳ھ)

جب صحابی رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ یزید شرابی ہے اور نمازیں بھی ترک کر دیتا ہے تو صحابی کے مقابلے میں تابعی کی بات کون سنتا ہے؟

دوسرے یہ کہ صحابی کی بات میں اثبات ہے اور تابعی کی بات میں نفی ہے اور مشہور اصول ہے کہ نفی پر اثبات مقدم ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک تو یہ روایت ہی ثابت نہیں، لہٰذا یزید بن معاویہ کا شرابی ہونا یا تارک الصلوٰۃ ہونا ثابت ہی نہیں۔ واللہ اعلم (۲۶/ مارچ ۲۰۱۳ء)

ضعیف اور مردود روایات بطورِ استدلال بیان کرنا جائز نہیں

سوال کسی ایسے شخص کے لئے ضعیف اور مردود روایات بطورِ استدلال بیان کرنا جائز ہے جو حدیث کی صحت وضعف کے بارے میں ناواقف ہے، یا جان بوجھ کر حدیث کی صحت وضعف کو بیان نہیں کرتا، کیا حدیث بیان کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(گل رحمان، تخت بھائی ضلع مردان)

الجواب اگر یہ شخص ناواقف ہے تو اس کے لئے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں کی حدیث بیان کرنا جائز نہیں، کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ ضعیف یا مردود روایت بطورِ جزم بیان کر دے اور پھر وہ اس حدیث کا مصداق بن جائے، جس میں آیا ہے:
''جس نے مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرے۔''

(صحیح بخاری: ۱۰۸، صحیح مسلم: ۲[۳])

یہ تو ناواقف کا حکم ہے اور جسے حدیث کا صحیح یا ضعیف ہونا معلوم ہوتا ہے، پھر وہ ضعیف روایت بغیر کسی رد کے بطورِ جزم بیان کرتا ہے تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔ (۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

رویتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ایک مردود روایت کا قصہ

سوال سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی بیوی ام طفیل رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' رأیت ربي فی المنام في صورة شاب موفر في خضر علیه نعلان من ذهب علٰی و جهه فراس من ذهب'' میں نے اپنے رب کو خواب میں ایک نوجوان کی شکل میں دیکھا جو بڑے بالوں والا اور سبز لباس میں تھا، اس نے سونے کے جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے چہرے پر سونے کا فراس تھا۔ (دیکھئے امین الفتاویٰ ج۱ص ۸۔۹)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟

(ایک سائل)

الجواب اس روایت کی سند درج ذیل ہے:

"عمرو بن الحارث أن سعيد بن أبي هلال حدثه أن مروان بن عثمان حدثه عن عمارة بن عامر بن حزم الأنصاري عن أم الطفيل امرأة أُبي بن كعب قالت .." (المعجم الکبیر للطبرانی ۲۵/۱۴۳ ح ۳۴۶، السنۃ لابن ابی عاصم: ۴۷۱ دوسرانسخہ: ۴۸۰)

اس سند کا ایک راوی مروان بن عثمان جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔

اسے ابو حاتم الرازی نے ضعیف کہا۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۸/۲۷۲)

حافظ ابن حجر نے فرمایا: "ضعیف" (تقریب التہذیب: ۶۵۷۲، نیز دیکھئے انوار الصحیفہ ص ۳۲۶)

عمارہ بن عامر کے بارے میں حافظ ابن حبان نے فرمایا:

"يروي عن أم الطفيل امرأة أُبي بن كعب عن النبي ﷺ قال: رأيت ربي۔ حديثًا منكرًا ، لم يسمع عمارة من أم الطفيل و إنما ذكرته لكي لا يغر الناظر فيه فيحتج به من حديث أهل مصر" وہ ام طفیل زوجۂ اُبی بن کعب سے ایک منکر حدیث بیان کرتا تھا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب کو دیکھا۔ عمارہ نے ام الطفیل سے نہیں سنا اور میں نے یہ روایت اس لئے ذکر کی ہے کہ کوئی دیکھنے والا دھوکے میں مبتلا ہو کر اس سے اہلِ مصر کی حدیثوں میں حجت نہ پکڑ لے۔ (کتاب الثقات ۵/۲۴۵)

اس ضعیف و مردود روایت کو شیخ البانی کا "حديث صحيح بما قبله و إسناده ضعيف مظلم" کہنا عجائب و غرائب میں سے ہے۔ اس روایت میں بہت سے الفاظ مثلاً: نعلان من ذهب اور فراش من ذهب کسی دوسری سند سے قطعاً ثابت نہیں، نیز موقر اور موفر، فراس اور فراش کے تلفظ میں بھی اختلاف ہے۔ علماء کو چاہیے کہ جھوٹی اور مردود روایات بیان کرنے سے اجتناب کریں اور پوری کوشش کر کے صرف صحیح و ثابت روایات ہی بیان کریں۔ (۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء)

چند ضعیف وغیر ثابت روایات اور ان کی تحقیق

سوال محترم شیخ زبیر علی زئی حفظہ اللہ (رحمہ اللہ) آپ کو چند روایات ارسال کر رہا ہوں جو عام طور پر خطباء اور واعظین سے سنی جاتی ہیں، براہ مہربانی اپنے انتہائی قیمتی اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر اصولِ حدیث اور اسماء الرجال کی روشنی میں ان روایات و آثار کی تحقیق پیش کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں برکت فرمائے، اور آپ کو تمام جہانوں کی بھلائی عطا فرمائے، حاسدوں کے حسد اور مخالفین کے شر سے ہمیشہ محفوظ فرمائے۔ آمین (ابوانس محمدی، انصاری محلہ، حیدر آباد سندھ)

الجواب

۱) ((لدخل مصليًا تهن الجنة .))

''تو نمازی عورتوں کا جنت کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں''

تجزیہ: اسے طبرانی (المعجم الاوسط ۷/ ۱۷۹) حاکم (المستدرک ۴/ ۱۹۱-۱۹۲) اور ابن ماجہ (۲۰۱۳) نے روایت کیا ہے۔

اسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دیکھئے سنن ابن ماجہ (ص ۳۴۸ طبع مکتبۃ المعارف)

ہمارے نزدیک اس کی وجۂ ضعف یہ ہے کہ سالم بن ابی الجعد اور سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مجہول واسطہ ہے۔ (دیکھئے المستدرک ۴/ ۱۷۴ ح ۷۳۳۲)

یہ عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ مجہول کی منفرد خبر ضعیف و مردود ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ مرد ہوں یا عورتیں جنت میں جانے کے لیے نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ عقائد صحیحہ، کفر و شرک سے براءت اور اعمال صالحہ وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔

۲) سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶۰ کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ

ایک یہودی اور منافق ایک تنازعہ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کرواتے ہیں، آپ ﷺ نے فیصلہ صادر فرمادیا جو اس نام نہاد مسلمان کے خلاف تھا، اس نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کروانا چاہا، چنانچہ وہ دونوں ان کی خدمت میں پہنچ گئے، جب انہیں معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں نبی ﷺ فیصلہ فرما چکے ہیں تو شدید غضب کے عالم میں تلوار نکال لائے اور منافق کی گردن پہ یہ کہہ کر وار کیا: من لم يرض بقضاء رسول الله ﷺ فهذا قضاء عمر . جو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے راضی نہیں تو عمر اس کا فیصلہ تلوار سے کرتا ہے۔''

تجزیہ: یہ قصہ درج ذیل سندوں سے مروی ہے:

۱: الكلبي عن أبي صالح عن ابن عباس رضي الله عنه .

(تفسیر الثعلبی ۳/ ۳۳۷، اسباب النزول للواحدی ص ۱۳۳)

اس میں محمد بن السائب الکلبی کذاب ہے اور کلبی تک سند نا معلوم ہے۔

شیخ البانی کے دونوں شاگردوں سلیم الہلالی اور محمد بن موسیٰ آل نصر نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے:'' فهو إسناد مكذوب مصنوع ''پس یہ سند جھوٹی من گھڑت ہے۔ (الاستیعاب فی بیان الاسباب ۱/ ۴۲۴)

۲: ابن لهيعة (مدلس) عن أبي الأسود رحمه الله .

(ابن ابی حاتم بحوالہ تفسیر ابن کثیر ۲/ ۳۱۸)

یہ روایت مرسل یعنی منقطع ہے۔

۳: عتبة بن ضمرة عن أبيه . (تفسیر ابن دحیم بحوالہ تفسیر ابن کثیر ایضاً)

یہ سند منقطع ہے۔ اس کے راوی ضمرہ بن حبیب بن صہیب الزُبیدی الشامی الحمصی کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔

(دیکھئے تفسیر ابن کثیر تحقیقی ۱/ ۳۴۷ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ)

۴: أيوب بن مدرك عن مكحول رحمه الله . (نوادر الاصول ۲/ ۲۲۶۔ ۲۲۷، ح ۲۶۷)

اس کا راوی ایوب بن مدرک کذاب ہے۔

(دیکھئے سوالات ابن الجنید: ۲۹۳، لسان المیزان ۱/ ۴۸۸۔۴۸۹)

تنبیہ: حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۵/ ۳۸، نسخہ دار طیبہ ۶/ ۱۶۸) میں کلبی کذاب کی سند کو "و إن كان ضعيفًا" کہہ کر مجاہد تابعی سے اس کا ایک شاہد پیش کیا ہے۔

اس مرسل یعنی ضعیف شاہد میں منافق کے قتل کا نام ونشان تک نہیں، لہٰذا یہ روایت کس طرح شاہد بن سکتی ہے؟! درج بالا بحث سے معلوم ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہی ہے۔

۳) "ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

الصائم في عبادة مالم يغتب مسلمًا أو يؤذه ، یعنی روزہ دار مسلسل حالت عبادت میں ہے، جب تک کسی مسلمان کی غیبت نہ کرے یا اسے تکلیف نہ پہنچائے۔"

(خطبات رحمانی ص ۳۹۵)

تجزیہ: اس روایت کے بارے میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"منكر ... و هذا إسناد ضعيف جدًا"

منکر... اور یہ سند سخت ضعیف ہے۔ (السلسلۃ الضعیفۃ ۳/ ۳۱۱ ح ۱۸۲۹)

٤) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

من اعتكف يومًا ابتغاء وجه الله جعل الله بينه و بين النار ثلاث خنادق، كل خندق أبعد ما بين الخافقين . یعنی جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایک دن کا اعتکاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں تیار کرا دے گا، ہر خندق کی چوڑائی مشرق ومغرب کے فاصلے سے بھی زیادہ ہوگی۔"

(خطبات رحمانی ص ۳۹۹۔۴۰۰)

تجزیہ: یہ روایت بشر بن سلم البجلی منکر الحدیث کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔

اس بارے میں شیخ البانی رحمہ اللہ کا مفصل کلام السلسلۃ الضعیفۃ (ج ۱۱ ص ۵۶۶۔ ۵۶۹) میں ہے اور انھوں نے واضح کیا ہے کہ اس روایت کی بعض سندوں میں "و حرمة

صاحب هذا القبر " کے الفاظ بھی ہیں جنھیں البانی صاحب نے حلف بغیر اللہ اور شرک کہا ہے۔

خطباء اور واعظ حضرات کو ایسی ضعیف و مردود روایت کو عوام کے سامنے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، جس سے شرک کا ''اثبات'' ہو رہا ہے۔

۵) ''اللہ کے پیغمبر ﷺ نے دعا کی:

" اللّٰهم إني أعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات."

اے اللہ! تیرے چہرے کے نور کی پناہ طلب کرتا ہوں۔ تیرا وہ نور جس نے تاریکیوں کو منور کردیا''

تجزیہ: دیکھئے تفسیر ابن کثیر (بتحقیق عبدالرزاق المہدی ۴/ ۵۴۹)

یہ روایت ابن اسحاق (امام المغازی) کی معضلات (منقطع روایات) میں سے ہے، یعنی ضعیف ہے۔ اس روایت کی دوسری سند بھی ہے جس کے بارے میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" ضعيف ... و هذا إسناده ضعيف رجاله ثقات و علته عنعنة ابن إسحاق عند الجميع و هو مدلس ..." (السلسلة الضعيفة ۶/ ۴۸۷ ح ۲۹۳۳)

٦) ''ایک صحابی نے اللہ کے پیغمبر ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! جب جبرائیل امین علیہ السلام آتے ہیں تو کیسے آتے ہیں؟ اس وقت کیفیت کیسی ہوتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چاہے دن ہو یا رات ہو۔ جب وہ آتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے آسمان پر سورج چمک رہا ہے''

تجزیہ: یہ بے سند روایت ہے، جس کا کوئی حوالہ ہمیں نہیں ملا۔ واللہ اعلم

۷) ''علماء سلف میں سے کسی کے پاس ایک آدمی نے آ کر کہا کہ فلاں شخص نے تمہاری یہ غیبت کی، فلاں شخص نے تمہارے بارے میں یہ غلط الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انہوں نے کہا: مَا وَجَدَ شيطٰن بَرِيْدًا غَيْرَكَ . شیطان کو تیرے علاوہ کوئی ڈاکیا نہیں ملا، تو شیطان کا

ڈاکیابن کرآ گیا‘‘ (خطباتِ رحمانی ص ۳۲۸)

تجزیہ: یہ قول تاریخ دمشق (۶۳/ ۳۸۹ بحوالہ ابن ابی الدنیا) اورالاشراف فی مناقب الاشراف لابن ابی الدنیا (۹۸) میں ’’محمد بن یحییٰ المروزی قال قال رجل لوھب بن منبہ‘‘ کی سند سے مروی ہے۔

محمد بن یحییٰ بن سلیمان المروزی البغدادی ۲۸۷ھ میں فوت ہوئے اور امام وہب بن منبہ ۱۲۰ھ سے پہلے فوت ہوگئے تھے، یعنی تقریباً ۱۷۰ سال پہلے فوت ہوئے۔

ثابت ہوا کہ یہ روایت سخت منقطع و مردود ہے۔

۸) ’’نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن المحاکاۃ ۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے لہجے میں نقلیں اتارنے سے منع کیا۔‘‘

تجزیہ: یہ روایت مجھے کسی کتاب میں نہیں ملی۔ واللہ اعلم

اس روایت کا اصل حوالہ پیش کرنا خطباء اور واعظین کی ذمہ داری ہے۔

۹) ’’سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

لو کان الفقیہ علٰی رأس جبل لکان ھو الجماعۃ .

اگر ایک فقیہ و عالم دین پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوتو وہی جماعت ہے، اس کے پاس جاؤ اس سے استفادہ کرو، تمہارے امراض، مشاکل اور فتنوں کا علاج پیش کرے گا، اور تم کو کتاب و سنت کے نور کے ذریعے حق پر قائم رکھے گا۔‘‘ (خطبات رحمانی ص ۱۷۹)

تجزیہ: یہ قول ہمارے علم کے مطابق امام سفیان ثوری رحمہ اللہ سے باسند صحیح ہرگز ثابت نہیں اور شرح السنۃ للبغوی (۱/ ۲۷۹) میں یہ قول بے سند و بے حوالہ ہی لکھا ہوا ہے، لہٰذا علمی میدان میں اس بے سند حوالے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۱۰) حدیث ہے کہ أحلّت لنا میتتان الحوت و الجراد. ہمارے لیے دو مردار حلال ہیں: ایک مچھلی، دوسرا ٹڈی‘‘

تجزیہ: سنن ابن ماجہ (۳۲۱۸) کی یہ روایت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم عن ابیہ کی وجہ

سے سخت ضعیف ہے اور السنن الکبریٰ للبیہقی (۱/۲۵۴) میں اس کا ایک ضعیف شاہد بھی ہے۔

یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا موقوف قول ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۱/۲۵۴ وسندہ صحیح)

اگرچہ مفہوم کے لحاظ سے یہ حکماً مرفوع ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اسے صراحتاً ''حدیث رسول'' قرار دینا صحیح نہیں۔

۱۱) علامہ نواب صدیق حسن خان کے بارے میں ایک جھوٹا قصہ

''نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ والی ریاست بھوپال، ریاست بھوپال کی والیہ بیگم شاہ جہان ان کے عقد میں آ گئی۔ اس نے ان کے تقویٰ سے ان کے علم سے ان کے زہد سے متاثر ہو کر ان سے نکاح کر لیا۔ لیکن وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ اور روزانہ عصر کے بعد ان کا معمول تھا اپنے شوہر نواب صاحب کے ساتھ باہر سیر کو نکلتی تھی۔

ایک وکٹوریہ پر بیٹھ کر بے پردہ نکلتی تھی۔ ان کی نصیحت قبول نہ کرتی۔ نواب صاحب ایک دن درس حدیث دے رہے تھے۔ یہ حدیث آئی تین قسم کے افراد کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہیں دیکھے گا۔ شاگردوں نے سوال کیا کہ دیوث کون ہے کہا کہ ابھی نہیں بتاؤں گا جب شام کو بیگم کے ساتھ باہر نکلوں گا تو تم راستہ میں آ جانا۔ راستہ روک کر اس حدیث کا معنی سمجھنا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق شام کو نکلے طلبہ باہر کھڑے ہیں انتظار میں راستہ روکا۔ اور کہا کہ استاذ صاحب ہمیں ایک حدیث سمجھائیے کہ یہ تین قسم کے افراد جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہیں دیکھے گا۔ ان میں سے ایک دیوث بھی ہے۔ دیوث کا معنی کیا ہے۔ فرمایا کہ دیوث میں ہوں فرمایا کہ دیوث میں ہوں، فرمایا کہ دیوث مجھے دیکھ لو میں دیوث ہوں۔ بیگم بھی ان کی بڑی عالمہ فاضلہ تھی۔ بات کو سمجھ گئی فرمایا کہ ابھی گھر واپس پلٹیے۔ برقعے کا انتظام کیا۔ پردہ کا انتظام کیا۔'' (خطبات رحمانی ص ۳۴۵۔۳۴۶)

یہ مذکورہ سارا بیان جھوٹ، بہتان اور افتراء ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ

اوران کی نیک سیرت زوجہ نواب شاہجہان بیگم سے اس قسم کا کوئی قصہ ہرگز ثابت نہیں اور یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ قصہ گو نے یہ قصہ کہاں سے سُنا یا پڑھا ہے؟!

علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کے بیٹے سید علی حسن خان نے اپنی والدہ کے بارے میں لکھا ہے: ''اس کی حقیقت یہ ہے کہ رئیسہ عالیہ کا پردہ بقاعدہ شرعی نکاح اول کے زمانہ ہی سے قائم تھا۔'' الخ (مآثرِ صدیقی حصہ سوم ص ۱۷۳)

اس کے بعد کی کچھ عبارت غیر واضح سی معلوم ہوتی ہے اور نکاح اول سے مراد ملکہ شاہجہان بیگم کا نواب باقی محمد خان سے نکاح ہے جو نواب صدیق حسن خان سے پہلے ہوا تھا۔

ایسی دیندار و نیکوکار بی بی کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کرنا کہ وہ بے پردہ نکلتی تھی اور اس کا عالم فاضل شوہر دیوث تھا، بہت بڑا بہتان ہے۔ (والعیاذ باللہ)

آخر میں خطباء، علماء اور طلباء سے گزارش ہے کہ جو بات بھی بیان کریں مکمل تحقیق و تفتیش کے بعد ہی کریں کیونکہ یہ بہت نازک مسئلہ ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾

یعنی بندہ اپنی زبان سے جو بات بھی نکالتا ہے تو اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) موجود ہوتا ہے۔ (قٓ:۱۸)

و ما علینا إلا البلاغ (۲۰/ جون ۲۰۱۳ء)

شبِ معراج اور بیت المقدس کا کھلا دروازہ؟

سوال شیخ صاحب! تفسیر ابن کثیر کی جلد نمبر ۳ صفحہ ۲۱۶ سورۂ بنی اسرائیل واقعۂ معراج کے حوالے سے ایک قصہ لکھا ہوا ہے کہ

''...بیت المقدس کا لاٹ پادری جو شاہ روم کی اُس مجلس میں اُس کے پاس بڑی عزت سے بیٹھا تھا فوراً ہی بول اُٹھا کہ یہ بالکل سچ ہے مجھے اس رات کا علم ہے۔ قیصر نے تعجب خیز نظر

سے اس کی طرف دیکھا اور ادب سے پوچھا جناب کو کیسے معلوم ہوا؟ اُس نے کہا سنیے میری عادت تھی اور یہ کام میں نے اپنے متعلق کر رکھا تھا کہ جب تک مسجد کے تمام دروازے اپنے ہاتھ سے بند نہ کرلوں سوتا نہ تھا اُس رات میں دروازے بند کرنے کے لئے کھڑا ہوا سب دروازے اچھی طرح بند کر دیئے لیکن ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا میں نے ہر چند زور لگائے لیکن کواڑ اپنی جگہ سے سرکا بھی نہیں۔ میں نے اسی وقت آدمیوں کو آواز دی وہ آئے ہم سب نے مل کر طاقت لگائی لیکن سب کے سب ناکام رہے بس یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکانا چاہتے ہیں وہ چسکا تک نہیں ہلا تک نہیں میں نے بڑھئی بلوائے ...لیکن وہ بھی ہار گئے کہنے لگے صبح پر رکھئے چنانچہ دروازہ اس شب یونہی (کھلا) رہا.. میں صبح ہی دروازے کے پاس گیا تو دیکھا کہ اس کے پاس کونے میں جو چٹان پتھر کی تھی اس میں ایک سوراخ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رات کو کسی نے کوئی جانور باندھا ہے اس کے اثر اور نشان موجود تھے۔ میں سمجھ گیا...آج کی رات یہ ہماری مسجد کسی نبی کے لئے کھلی رکھی گئی اس نے ضرور یہاں نماز ادا کی ہے۔''

اس واقعہ کے بارے میں تفسیر ابن کثیر میں آپکا حکم موجود نہیں کہ آپ کے نزدیک یہ واقعہ صحیح ہے حسن ہے یا ضعیف ہے؟ مہربانی فرما کر اس واقعہ پر اپنا حکم واضح فرمائیں۔

(سائل: ابوابراہیم خرم ارشاد محمدی، دولت نگر)

الجواب تفسیر ابن کثیر میں یہ روایت حافظ ابونعیم الاصبہانی کی کتاب: دلائل النبوۃ کے حوالے سے درج ذیل سند کے ساتھ موجود ہے:

''محمد بن عمر الواقدي: حدثني مالك بن أبي الرجال عن عمر بن عبد الله عن محمد بن كعب القرظي قال: بعث رسول الله ﷺ دحية بن خليفة إلى قيصر...'' (ج ۳ ص ۱۱۵، الاسراء: ۱، وقال ابن کثیر: ''فائدة حسنة جميلة''!)

یہ روایت واقدی کی وجہ سے سخت ضعیف ومردود ہے، نیز اس سند میں دیگر علتیں بھی ہیں، جن کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

۱) محمد بن عمر بن واقد الاسلمی الواقدی کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ نے گواہی دی:
"كتب الواقدي كذب" واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

(کتاب الجرح والتعدیل ۸/۲۱ وسندہ صحیح)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: "وكان الواقدي يقلّب الأحاديث، يلقي حديث ابن أخي الزهري علىٰ معمر و نحو هذا." واقدی احادیث کو اُلٹ پلٹ کر دیتا تھا، وہ ابن اخی الزہری کی حدیث کو معمر (بن راشد) کے ذمے لگا دیتا اور اسی طرح (کی حرکتیں) کرتا تھا۔

اس کلام پر امام اسحاق بن راہویہ نے فرمایا: "كما وصف وأشد لأنه عندي ممن يضع الحديث." جس طرح انھوں (احمد بن حنبل) نے فرمایا اسی طرح ہے اور اس سے سخت ہے، کیونکہ وہ (واقدی) میرے نزدیک احادیث گھڑنے والوں میں سے تھا۔

(کتاب الجرح والتعدیل ۸/۲۱ وسندہ صحیح)

امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: "لا يكتب حديث الواقدي و الواقدي ليس بشيً" واقدی کی حدیث لکھی نہ جائے، وہ (واقدی) کوئی چیز نہیں۔

امام بخاری، امام مسلم، امام ابو حاتم الرازی اور امام نسائی (چاروں) نے فرمایا:
"متروك الحديث" وہ حدیث (وروایت) میں متروک ہے۔ (کتاب الضعفاء للبخاری بتحقیقی: ۳۴۴، الکنیٰ للامام مسلم مخطوط ص ۶۵، کتاب الجرح والتعدیل ۸/۲۱، کتاب الضعفاء للنسائی: ۵۳۱)

بلکہ امام نسائی رحمہ اللہ نے فرمایا: "والكذابون المعروفون بوضع الحديث علىٰ رسول الله ﷺ أربعة: ابن أبي يحيى بالمدينة والواقدي ببغداد ومقاتل بن سليمان بخراسان و محمد بن السعيد بالشام يعرف بالمصلوب."
رسول اللہ ﷺ کے بارے میں حدیثیں گھڑنے والے مشہور جھوٹے چار ہیں:

(۱) (ابراہیم بن محمد) ابن ابی یحییٰ (الاسلمی) مدینے میں

(۲) واقدی بغداد میں

(۳) مقاتل بن سلیمان خراسان میں

(۴) اور محمد بن سعید، جو مصلوب (کے لقب) سے مشہور ہے، شام میں۔

(آخر کتاب الضعفاء ص ۲۶۵ رسالہ صغیرۃ لہ)

واقدی پر حافظ ابن حبان نے شدید جرح کی۔ (دیکھئے کتاب المجروحین ۲/۲۹۰، دوسرا نسخہ ۲/۳۰۳)

امام علی بن عبداللہ المدینی نے فرمایا: "الواقدي یرکب الأسانید"

واقدی سندیں بناتا تھا۔ (تاریخ بغداد ۳/۱۶ ت ۹۳۹ وسندہ صحیح)

بعض علماء سے واقدی کی توثیق بھی مروی ہے، لیکن جمہور محدثین کی جرح کے مقابلے میں یہ مردود ہے۔

حافظ ہیثمی اور ابن الملقن نے کہا: "ضعفه الجمهور" جمہور نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد ۳/۲۵۵، البدر المنیر ۵/۳۲۴)

۲) ابونعیم کی کتاب دلائل النبوۃ میں یہ روایت نہیں ملی اور نہ ابونعیم سے لے کر واقدی تک اس روایت کی کوئی سند معلوم ہے، لہٰذا یہ بے سند ہے۔

۳) ابوحفص عمر بن عبداللہ المدنی مولیٰ غُفرہ قولِ راجح میں جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے اور حافظ ذہبی و حافظ ابن حجر العسقلانی دونوں نے فرمایا: "ضعیف"

(تلخیص المستدرک ۱/۴۹۵ ح ۱۸۲۰، تقریب التہذیب: ۴۹۳۴)

٤) محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ تابعی تھے، لہٰذا یہ سند مرسل یعنی منقطع ہے۔

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت سخت ضعیف و مردود ہے، لہٰذا بغیر جرح کے اس کا بیان کرنا جائز نہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے روایت مذکورہ اپنی تفسیر میں درج کی، لیکن ساتھ ہی اس کی کچھ نہ کچھ سند بھی لکھ دی جس سے اس روایت کا سخت ضعیف و مردود ہونا ظاہر ہو گیا، لہٰذا اس روایت کو "فائدة حسنة جليلة" قرار دینا غلط ہے۔

حافظ ابن کثیر اور جلال الدین سیوطی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ابن کثیر نے تو

سند کا کچھ حصہ لکھ دیا تھا مگر سیوطی نے محمد بن کعب القرظی کے علاوہ ساری سند حذف کر کے اس روایت کو بحوالہ ابونعیم لکھ دیا ہے۔ (دیکھئے الخصائص الکبریٰ ج۱ص۱۶۹۔۱۷۱)

ثابت ہوا کہ اصل کتابوں سے روایات تلاش کر کے ان کی تحقیق کے بعد ہی بطورِ حجت یا بطورِ رد استدلال کرنا چاہئے اور سیوطی کے بے سند حوالوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ وما علینا إلا البلاغ (۲۹/ رجب ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/ جون ۲۰۱۲ء)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ولایت اور حالتِ رکوع میں صدقہ؟

سوال آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ القرآن (المائدہ:۵۵)

''بے شک تمھارا ولی (مددگار، دوست) اللہ اور اس کا رسول ہی ہے اور (ساتھ) وہ ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور وہ (اللہ کے حضور عاجزی سے) جھکنے والے ہیں۔''

کے شانِ نزول میں بیشتر محدثین نے یہ حدیث مبارکہ بیان کی ہے:

عن عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ یقول: وقف علی علیّ بن أبي طالب سائل وهو راكع في تطوع فنزع خاتمه فأعطاه السائلَ، فأتى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فأعلمه ذلك، فنزلت على النبي صلی اللہ علیہ وسلم هذه الآية: " انما وليكم الله رسوله والذين أمنوا الذين يقيمون الصلوٰة ويؤتون الزكاة وهم راكعون، فقرأها رسول الله ثم قال: من كنت مولاه فعلي مولاه، اللهم! والِ من والاه و عادِ من عاداه.

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سائل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ آپ نماز میں حالتِ رکوع میں تھے۔ آپ نے اپنی انگوٹھی کھینچی، پھر سائل کو عطا فرما دی۔ سیدنا علی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو اس کی خبر دی۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ آپ نے اس آیت کو پڑھا اور فرمایا: ''جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علی مولیٰ ہے، اے اللہ! جو اسے دوست رکھے تُو اسے دوست رکھ اور جو اس سے عداوت رکھے تو

اُس سے عداوت رکھ۔"

(۱) طبرانی، المعجم الاوسط ۷: ۱۲۹، ۱۳۰، رقم ۶۲۲۸۔ (۲) احمد بن حنبل، المسند ۱: ۱۱۹۔

(۳) احمد بن حنبل، المسند ۴: ۳۷۲ (۴) حاکم، المستدرک ۳: ۱۱۹، ۳۷۱، رقم حدیث: ۴۵۷۶، ۵۵۹۴۔ (۵) طبرانی، المعجم الکبیر ۴: ۱۷۴، رقم ۴۰۵۳۔ (۶) طبرانی، المعجم الکبیر ۵: ۱۹۵، ۲۰۳، ۲۰۴، رقم: ۵۰۶۸، ۵۰۶۹، ۵۰۹۷۔ (۷) طبرانی، المعجم الصغیر ۱: ۶۵۔

(۸) ہیثمی، مجمع الزوائد ۷: ۱۷۔ (۹) ہیثمی، موارد الظمآن: ۵۴۴، رقم ۲۲۰۵۔

(۱۰) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد ۷: ۳۷۷۔

(۱۱) ابن اثیر، اسد الغابۃ ۳: ۴۸۷۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ ۲: ۳۶۲۔

(۱۲) ضیاء مقدسی، الاحادیث المختارہ ۲: ۱۰۶، ۱۷۴، رقم ۴۸۰، ۵۵۳۔

(۱۳) حسام الدین ہندی، کنز العمال ۱۱: ۳۳۲۔ ۳۳۳، رقم: ۳۱۶۶۲۔ ج ۱۳ ص ۱۰۴، ۱۶۹، رقم: ۳۶۳۴۰، ۳۶۵۱۱۔

روایت مذکورہ و آیت کریمہ کی مکمل تخریج (درکار ہے) اور آلِ شیعہ اس سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ولایت مراد لے کر خلافت بلافصل علی کی ثابت کرتے ہیں۔

رسالہ الحدیث میں اس کا جواب دیجئے۔ (سید امیر شاہ بخاری، صوابی)

الجواب آپ نے جن روایات کے تیرہ (۱۳) حوالے دیے ہیں، ان کی مختصر اور جامع تحقیق درج ذیل ہے:

۱) امام طبرانی کی کتاب المعجم الاوسط میں اس روایت کی سند درج ذیل ہے:

"حدثنا محمد بن علی الصائغ قال: حدثنا خالد بن یزید العمري قال: حدثنا إسحاق بن عبد اللّٰه بن محمد بن علي بن حسین عن الحسن بن زید عن أبیه زید بن الحسن عن جده قال: سمعت عمار بن یاسر یقول:"

(۷/ ۱۲۹۔ ۱۳۰ ح ۶۲۲۸)

اسے ابن مردویہ نے بھی خالد بن یزید العمری کی سند سے روایت کیا ہے اور حافظ

ابن حجر نے فرمایا: ''و في إسناده خالد بن يزيد العمري وهو متروك''
اور اس (ابن مردویہ) کی سند میں خالد بن یزید العمری ہے اور وہ متروک ہے۔
(الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف لابن حجر ۱/۶۴۹، المائدہ: ۵۵)

اس روایت کے بنیادی راوی خالد بن یزید العمری کے بارے میں امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: ''كذاب'' وہ جھوٹا ہے۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۳/۳۶۰ وسندہ صحیح)

امام ابو حاتم الرازی نے فرمایا: ''كان كذابًا ، أتيته بمكة ولم أكتب عنه و كان ذاهب الحديث'' وہ کذاب (جھوٹا) تھا، میں اس کے پاس مکہ آیا اور اس سے (کچھ) نہیں لکھا اور وہ حدیث میں گیا گزرا تھا۔ (ایضاً ص ۳۶۰ رقم: ۱۶۳۰)

حافظ ابن حبان نے اس پر شدید جرح کی۔

(دیکھئے کتاب المجروحین ۱/۲۸۴۔۲۸۵، لسان المیزان ۲/۳۸۹، دوسرا نسخہ ۲/۲۱/۷)

اور حافظ ہیثمی نے کہا: ''و فيه خالد بن يزيد العمري وهو كذاب''
اور اس (روایت) میں خالد بن یزید العمری ہے اور وہ کذاب (جھوٹا) ہے۔
(مجمع الزوائد ۳/۲۹۶ کتاب الحج باب التحفظ من المعصیۃ فیہا وفیما حولہا)

کذاب کی روایت موضوع ہوتی ہے، لہٰذا یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے۔

اس کا دوسرا راوی اسحاق بن عبداللہ بن محمد بن علی بن حسین نامعلوم ہے اور غالباً اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ہیثمی نے کہا: ''رواه الطبراني في الأوسط و فيه من لم أعرفهم'' اسے طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں ایسے راوی ہیں جنھیں میں نہیں جانتا۔ (مجمع الزوائد ۷/۱۷، سورۃ المائدۃ)

حافظ ابن کثیر نے اس روایت اور دوسری روایات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:
''و ليس يصحّ شيٌ منها بالكلية لضعف أسانيدها و جهالة رجالها''
ان (روایات) میں سے سرے سے کوئی چیز بھی صحیح نہیں ہے، سندوں کے ضعف اور راویوں کے مجہول ہونے کی وجہ سے۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۵۶۷، المائدہ: ۵۵)

روایتِ مذکورہ کو شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے سلسلہ ضعیفہ میں ذکر کیا ہے۔

(ج ۱۰ص ۵۸۲ ح ۴۹۲۱)

تنبیہ: سائل نے روایتِ مذکورہ کے بارے میں (غالباً شیعہ کی کتابوں سے) تیرہ حوالے لکھے ہیں، لیکن ان حوالوں میں سے صرف حوالہ نمبر ا (المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۲۸۰) اور حوالہ نمبر ۸ (مجمع الزوائد للہیثمی ۷/۱۷) میں یہ روایت موجود ہے اور مذکورہ دوسرے حوالوں میں سے کسی ایک میں بھی یہ روایت اس متن سے موجود نہیں ہے۔

☆ طبرانی اور ابن مردویہ کی روایتِ مذکورہ کی تائید میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جو روایت بیان کی گئی ہے۔ (بحوالہ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۰۲ ح ۲۴۰، دوسرا نسخہ ص ۳۳۴، تاریخ دمشق لابن عساکر ۴۲/ ۳۵۶۔ ۳۵۷، ۴۵/ ۳۰۳، دوسرا نسخہ ۴۵/ ۲۷۱، ۴۸/ ۲۰۲)

اس روایت میں عیسیٰ بن عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی العلوی جمہور محدثین کے نزدیک سخت مجروح ہے۔ امام دارقطنی نے فرمایا: ''يقال له مبارك وهو متروك الحديث'' اسے مبارک (بھی) کہا جاتا ہے اور وہ حدیث میں متروک ہے۔

(سنن دارقطنی ۲/ ۲۶۳۔ ۲۶۴ ح ۲۶۰۶)

حاکم نیشاپوری نے کہا: ''روى عن أبيه عن آبائه أحاديث موضوعة'' اس نے عن ابیہ عن آباہ کی سند سے موضوع حدیثیں بیان کیں۔ (المدخل الی الصحیح ص ۱۷۰، رقم: ۱۲۷)

ابونعیم الاصبہانی نے کہا: ''روى عن أبيه عن آبائه أحاديث مناكير لا يكتب حديثه، لا شيء'' اس نے اپنے باپ سے آباء واجداد کی سند کے ساتھ منکر حدیثیں بیان کیں، اس کی حدیث لکھی نہیں جاتی (یا لکھی نہ جائے) وہ کوئی چیز نہیں ہے۔

(کتاب الضعفاء ص ۱۲۲، رقم ۱۷۵)

عیسیٰ بن عبداللہ الہاشمی نے روایتِ مذکورہ اپنے آباء واجداد کی سند سے بیان کی ہے۔

مختصر یہ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ روایت موضوع ہے۔

☆ ایک روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، لیکن اس کی سند میں

محمد بن مروان السدی کذاب راوی ہے۔ (دیکھئے الحدیث حضرو:۲۴ص ۵۰۔۵۲)

بعض آثار پر بحث تیرھویں روایت کے آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

۲) عبداللہ بن احمد بن حنبل کی زوائد المسند والی روایت (ح ۹۶۱) کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

۱: یزید بن ابی زیاد جمہور (محدثین) کے نزدیک ضعیف ہے۔

(دیکھئے زوائد ابن ماجہ للبوصیری: ۲۱۱۶، ھدی الساری لابن حجر ص ۴۵۹)

۲: یونس بن ارقم پر جمہور نے جرح کی ہے۔

ہیثمی نے کہا: "وھو لین" اور وہ کمزور ہے۔ (مجمع الزوائد ۷/ ۲۳۹)

ذہبی نے اسے دیوان الضعفاء میں ذکر کیا۔ (نیز دیکھئے لسان المیزان ۶/ ۳۳۱، دوسرا نسخہ ۷/ ۵۵۳)

۳) مسند احمد (ح ۱۹۳۲۵) والی روایت میں میمون ابو عبداللہ ضعیف ہے۔

(دیکھئے تقریب التہذیب: ۷۰۵۱)

ابو عبید نا معلوم راوی ہے۔ (دیکھئے تعجیل المنفعہ لابن حجر ص ۵۰۷ ت ۱۳۳۷)

مغیرہ بن مقسم مدلس ہیں اور روایت عن سے ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ سند بھی ضعیف ہے۔

٤) مستدرک کی پہلی روایت (۴۵۷۶) میں حبیب بن ابی ثابت مدلس ہیں۔

(دیکھئے طبقات المدلسین: ۶۹ طبقہ ثالثہ) اور سند عن سے ہے، لہٰذا ضعیف ہے۔

دوسری روایت (ح ۵۵۹۴) میں الحسن بن الحسین العرنی سخت مجروح ہے۔

ابو حاتم الرازی نے کہا: "لم یکن بصدوق عند هم ..."

وہ ان (محدثین) کے نزدیک سچا نہیں تھا۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۳/ ۶)

امام ابن عدی الجرجانی نے فرمایا: "روی أحادیث مناکیر"

اس نے منکر حدیثیں بیان کیں۔ (الکامل ۲/ ۷۴۳، دوسرا نسخہ ۳/ ۱۸۱)

حافظ ذہبی نے کہا: "الحسن هو العرني لیس بثقة" حسن العرنی ثقہ نہیں ہے۔

(تلخیص المستدرک: ۵۵۹۴)

۵) المعجم الکبیر للطبرانی (ح ۴۰۵۳) کی روایت میں امام شریک بن عبداللہ القاضی رحمہ اللہ مدلس تھے۔ (دیکھئے نصب الرایہ ۲۴۴/۳، المحلی لابن حزم ۲۶۳/۸، ۳۳۳/۱۰)

اور یہ روایت عن سے ہے، لہٰذا ضعیف ہے۔

دوسرا یہ کہ اس میں شریک القاضی کے اختلاط کی علت بھی موجود ہے۔ واللہ اعلم

٦) المعجم الکبیر للطبرانی (ح ۵۰٦۸) والی روایت میں یونس بن ارقم ضعیف اور سلیمان بن مہران الاعمش مدلس ہیں اور سند عن سے ہے، لہٰذا ضعیف ہے۔ باقی سند میں بھی نظر ہے۔

دوسری روایت (ح ۵۰٦۹) میں عطیہ بن سعد العوفی جمہور کے نزدیک ضعیف راوی ہے، نیز وہ مدلس بھی تھا۔ (کمافی طبقات المدلسین: ۱۲۲، طبقہ رابعہ)

اور سند عن سے ہے۔

تیسری روایت میں ابو ہارون العبدی: عمارہ بن جوین متروک راوی ہے اور بعض نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ الخ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۴۸۴۰)

ابو ہارون کا استاد: رجل مجہول ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند موضوع ہے۔

۷) المعجم الصغیر للطبرانی (۶۴/۱۔۶۵ ح ۱۶۵) والی روایت میں اسماعیل بن عمرو بن نجیح البجلی جمہور کے نزدیک ضعیف ہے۔ (دیکھئے مجمع الزوائد ۱۰/ ۲۴۸)

۸) ہیثمی کی مجمع الزوائد (۱۷/۷) کا حوالہ روایت نمبر ا کے تحت گزر چکا ہے۔

۹) موارد الظمآن (ح ۲۲۰۵) یعنی صحیح ابن حبان (الاحسان: ٦٨٩٢، دوسرا نسخہ: ٦٩٣١) والی روایت کی سند حسن لذاتہ (یعنی صحیح) ہے۔ اس روایت میں غدیر خُم کا بھی ذکر ہے اور لکھا ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''**من کنت مولاہ فإن ھذا مولاہ ، اللھم والِ من والاہ و عادِ من عاداہ** '' جس کا میں مولیٰ ہوں تو یہ (علی رضی اللہ عنہ) اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ! جو اس سے محبت کرے تُو اس سے محبت کر اور جو اس سے دشمنی رکھے تُو اس سے دشمنی رکھ۔

سنن ترمذی (۳۷۱۳ وسندہ صحیح) میں اس روایت کا ایک صحیح مختصر شاہد بھی ہے، جس

کے بارے میں امام ترمذی نے فرمایا: "هذا حديث حسن غريب"
مولیٰ کے لفظ پر بحث آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

۱۰) خطیب بغدادی (۳۷۷/۷) کی سند میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔
(دیکھئے تقریب التہذیب: ۴۷۳۴)

اور باقی سند بھی ضعیف و مردود ہے۔

۱۱) اسد الغابہ (ہمارے نسخے ۳۰۷/۳ طبع مکتبۃ المعارف بالریاض) والی روایت میں اصبغ بن نباتہ متروک ہے۔ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۵۳۷)

اور باقی سند بھی مردود ہے۔

دوسری روایت (ہمارے نسخہ ۲۳۳/۲) میں عمر بن عبداللہ بن یعلیٰ بن مرہ الثقفی ضعیف ہے۔ (کمافی تقریب التہذیب: ۴۹۳۳)

اور باقی سند بھی مردود بلکہ ابن عقدہ کی وجہ سے موضوع ہے۔

۱۲) المختارہ للضیاء المقدسی (۱۰۵/۲ ح ۴۸۰) میں شریک القاضی مدلس ہیں، لہٰذا یہ سند ضعیف ہے، لیکن سابق شاہد (فقرہ: ۹) کی وجہ سے حسن لغیرہ ہے۔

دوسری روایت (ح ۵۵۳) کی سند حسن لذاتہ ہے، جیسا کہ فقرہ نمبر ۹ کے تحت گزر چکا ہے۔

۱۳) کنز العمال (ح ۳۱۶۶۲) والی روایت بحوالہ ابن عساکر ہے۔

تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۰۸/۲۵، دوسرا نسخہ ۷۶/۲۷) میں یہ روایت "الحسین بن الحسن (كذا! والصواب الحسن بن الحسين كما في المستدرك ۳۷۱/۳ ح ۵۵۹۴): نارفاعة بن إياس الضبي عن أبيه عن جده" کی سند سے مروی ہے۔

الحسن بن الحسین العرنی سچا نہیں تھا۔ (دیکھئے فقرہ: ۴)

اور باقی سند بھی ثابت نہیں ہے۔

دوسری روایت (ح ۳۶۳۴۰) بحوالہ ابن جریر ہے۔

ہمیں اس کی سند نہیں ملی اور مشکل الآثار للطحاوی (۱۸/۵ ح ۱۷۶۵) میں اس مفہوم

کی روایت حبیب بن ابی ثابت عن ابی الطفیل کی سند سے مروی ہے۔

حبیب مدلس تھے۔ (دیکھئے فقرہ:۴)

اور روایت عن سے ہے، لہٰذا طحاوی والی سند ضعیف ہے۔

تیسری روایت (۳۶۵۱۱) کو بحوالہ ابن راہویہ اور ابن جریر نقل کیا گیا ہے۔ اس روایت کی سند نہیں ملی، لہٰذا یہ بے سند ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

اب بعض زیادات وفوائد پیشِ خدمت ہیں:

۱: حافظ ابن حجر نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب موضوع روایت (دیکھئے فقرہ نمبر ۱) ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

"ورواه الثعلبي من حديث أبي ذر مطولاً و إسناده ساقط"

اور اسے ثعلبی نے ابوذر (رضی اللہ عنہ) کی حدیث سے مطولاً روایت کیا اور اس کی سند گری پڑی (یعنی مردود وموضوع) ہے۔ (الکاف الشاف فی تخریج احادیث الکشاف ۱/۶۴۹)

۲: سلمہ بن کہیل (تابعی) سے ایک روایت میں آیا ہے کہ علی (رضی اللہ عنہ) نے حالتِ رکوع میں اپنی انگوٹھی صدقہ کر دی تو یہ آیت (سورۃ المائدہ:۵۵) نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن ابی حاتم ۴/۱۱۶۲ ح ۶۵۵۱، تاریخ دمشق ۴۲/۳۵۷، دوسرا نسخہ ۴۵/۲۷۲، البدایہ والنہایہ نسخہ محققہ ۷/۵۹۰۔۵۹۱)

اس روایت کی سند سلمہ بن کہیل تک صحیح ہے، لیکن یہ مرسل ومنقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ غالباً اسی وجہ سے حافظ ابن کثیر نے فرمایا:

"وهذا لا يصح بوجه من الوجوه لضعف أسانيده" اور یہ بھی کسی سند سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی سندیں ضعیف ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ۷/۵۹۱)

۳: عتبہ بن ابی حکیم (تبع تابعی) سے روایت ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن جریر طبری نسخہ محققہ ۴/۵۹۴ ح ۱۲۲۲۷)

اس میں ایوب بن سوید جمہور کے نزدیک ضعیف راوی ہے، لہٰذا سند ضعیف ہے۔

۴: مجاہد (تابعی ومفسرِ قرآن) سے روایت ہے کہ یہ علی بن ابی طالب کے بارے میں

نازل ہوئی، انھوں نے حالتِ رکوع میں صدقہ کیا تھا۔ (تفسیر ابن جریر ۴/ ۵۹۴ ح ۱۲۲۲۸)

اس کے راوی عبدالعزیز بن ابان بن محمد بن عبداللہ الکوفی کے بارے میں امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: "كذاب خبيث ، يضع الحديث"

کذاب خبیث ہے، وہ حدیثیں گھڑتا ہے۔ (سوالات ابن الجنید: ۸۲)

۵: اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی (سدی کبیر، تابعی) سے روایت ہے کہ یہ سارے مومنین ہیں، لیکن علی بن ابی طالب کے پاس سے ایک سائل گزرا اور آپ مسجد میں حالتِ رکوع میں تھے، پس آپ نے اسے اپنی انگوٹھی دے دی۔ (تفسیر ابن جریر ۴/ ۵۹۴ ح ۱۲۲۲۴)

اس روایت کی سند سدی کبیر تک حسن ہے، لیکن یہ روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ سدی نے فرمایا: اس سے مراد مومنین ہیں اور علی ان میں سے ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم ۴/ ۱۱۶۲ ح ۶۵۴۸)

اس کی سند سدی تک صحیح ہے اور بے شک سیدنا علی رضی اللہ عنہ مومنین میں سے ہیں۔

۶: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۵۶۶)

اس روایت میں عبدالوہاب بن مجاہد سخت مجروح ہے، لہٰذا یہ سند مردود ہے۔

اس مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (ابن کثیر ۲/ ۵۶۷)

اس کی سند منقطع ہے اور سفیان ثوری مدلس ہیں، ان سے پہلے صاحبِ کتاب تک سند بھی نامعلوم ہے۔

خلاصۃ التحقیق: سائل کی مسئولہ روایت موضوع ہے اور اس مفہوم کی تمام روایات ضعیف یا باطل و مردود ہیں۔

امام ابوجعفر الباقر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے... اور علی ان لوگوں میں سے ہیں جو ایمان لائے۔ (تفسیر ابن جریر ۴/ ۵۹۴ ح ۱۲۲۲۵)

امام ابوجعفر تک سند صحیح ہے (وصححہ الالبانی فی الضعیفۃ ۱۰/۵۸۲) اور اس سے ثابت ہوا کہ آیتِ مذکورہ میں تمام صحابہ اور مومنین مراد ہیں۔

حدیث: ((من كنت مولاه فعلي مولاه)) ''جس کا میں مولیٰ ہوں تو علی اس کے مولیٰ ہیں۔'' بالکل صحیح اور متواتر ہے۔ (دیکھئے میری کتاب: توضیح الاحکام عرف فتاویٰ علمیہ ج ۲ ص ۲۶۷)

مولیٰ کے کئی معنی ہیں مثلاً (۱) پروردگار (۲) مالک آقا (۳) مخلص دوست ساتھی رفیق (۴) ولی (۵) غلام اور آزاد کردہ غلام وغیرہ۔

یہاں مولیٰ سے مراد ولی، محبوب اور مخلص ہے، یعنی جو شخص رسول اللہ ﷺ کو اپنا ولی اور محبوب سمجھتا ہے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنا ولی اور محبوب سمجھتا ہے۔

حنفیوں کے ایک امام طحاوی نے فرمایا: ''المولى هاهنا هو الولي ...''

یہاں مولیٰ سے مراد ولی ہے... (مشکل الآثار طبعہ جدیدہ ۵/۲۵ ح ۱۷۷۰)

قاضی عیاض المالکی نے کہا: ''مولاه : أي وليه ...'' یعنی اس سے ولی مراد ہے۔

(مشارق الانوار ۲/۴۹۰)

ولی بھی مخلص دوست اور محبوب کو کہتے ہیں۔ (دیکھئے القاموس الوحید ص ۱۹۰۱)

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((أنت أخونا و مولانا)) ''تم ہمارے بھائی اور مولیٰ ہو۔'' (صحیح بخاری: ۲۶۹۹)

جس طرح سیدنا زید بن حارثہ مولیٰ ہیں، اسی طرح سیدنا علی بھی مولیٰ ہیں۔ رضی اللہ عنہما

یہاں مولیٰ سے پروردگار، مشکل کشا، حاجت روا یا وصی و خلیفہ مراد لینا بے دلیل اور باطل ہے۔ اگر مولیٰ سے یہاں خلیفہ یا وصی مراد ہوتا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس سے صراحتاً استدلال کرتے مگر ان سے ایسا کوئی استدلال ثابت نہیں، لہٰذا شیعہ کا استدلال باطل ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر الصدیق اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت کی، بلکہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمد بن الحنفیہ یعنی محمد بن علی بن ابی طالب نے اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کے بعد کون بہتر ہے؟ انھوں نے فرمایا: ابوبکر۔

بیٹے نے پوچھا: اُن کے بعد کون ہے؟ انھوں نے فرمایا: پھر عمر بہتر ہیں۔

(باب فضائل اصحاب النبی ﷺ باب فضل ابی بکر ح ۳۶۷۱)

(۲۷/ نومبر ۲۰۱۰ء)

صحیح بخاری اور طاہر القادری پارٹی

سوال "طاہر القادری پارٹی کے ایک بریلوی نے لکھا ہے:

(۱) بخاری شریف میں ایسے راوی موجود ہیں جو قدری، رافضی اور مرجیہ عقائد کے حامل تھے اور ایسے راوی بھی ہیں جو منکر الحدیث، واہی اور وہمی تھے۔

(۲) امام بخاری نے جن راویوں پر خود دوسری کتابوں میں جرح کی ہے۔ صحیح بخاری میں ان سے روایات لے آئے ہیں۔ ہم یہاں صرف دو روایات کو درج کرتے ہیں۔

① "باب الاستنجاء بالماء" کے تحت امام بخاری نے ایک روایت اس سند کے ساتھ ذکر کی ہے: "حدثنا أبو الولید هشام بن عبدالملك قال: حدثنا شعبة عن أبي معاذ و اسمه عطاء بن أبي میمونة قال: سمعت أنس بن مالك يقول: كان النبي ﷺ إذا خرج لحاجته ..." الحدیث (صحیح البخاری، طبع کراچی [ح ۱۵۰])

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے: عطاء بن ابی میمونہ، اس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں:

"عطاء بن أبي میمونة أبو معاذ مولٰی أنس، و قال یزید بن هارون: مولٰی عمران بن حصین كان یری القدر."

یعنی یہ شخص عقائد قدریہ کا حامل تھا۔ (تاریخ کبیر ۶/ ۴۶۹ ت ۳۰۱۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

② اسی طرح انہوں نے "کتاب المغازی" میں ایک حدیث ذکر کی ہے: "حدثني عباس ابن الولید - وهو النرسي: حدثنا عبدالواحد عن أیوب بن عائذ: حدثنا قیس ابن مسلم قال: سمعت طارق بن شهاب يقول: حدثني أبو موسى الأشعري

قال: بعثني رسول الله ﷺ '' الحدیث (صحیح بخاری، طبع کراچی [ح ۳۳۴۶])

اس حدیث میں ایک راوی ہیں ایوب بن عائذ، [1] اس کو بھی امام بخاری نے ''کتاب الضعفاء'' میں درج کیا ہے اور فرماتے ہیں ''أیوب بن عائذ الطائي کان یری الإرجاء'' یہ شخص مرجیہ عقائد کا حامل تھا۔

(کتاب الضعفاء الصغیر: ۲۴، دوسرا نسخہ: ۲۵، تاریخ کبیر ۱/ ۴۲۰ ت ۱۳۴۶)

حافظ ذہبی ایوب بن عائذ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ''امام بخاری نے ایوب بن عائذ کو مرجیہ قرار دے کر اس کا ضعفاء میں شمار کیا ہے اور حیرت ہے کہ اس کو ضعیف قرار دے کر پھر اس سے استدلال کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال ۱/ ۲۸۹، دوسرا نسخہ ۱/ ۴۵۹)

اس سے ہمارا مقصد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ ہم امام بخاریؒ پر کسی قسم کی کوئی تنقید یا اعتراض کر رہے ہیں بلکہ یہ تو اس عمومی خیال کا جواب ہے جو کہا جاتا ہے کہ بخاری شریف کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

مزید طمانیتِ خاطر کے لیے امام بخاری کی کتاب الضعفاء کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جس میں اور راویوں پر بھی امام بخاری کی جرح موجود ہے اور پھر انہی سے صحیح بخاری میں روایات موجود ہیں۔ المختصر یہ ماننا پڑے گا کہ امام بخاری بھی بشر ہیں جن سے تسامح ممکن ہے۔ اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث سے بھی اپنی وسعت بھر کوشش کے باوجود بخاری شریف میں روایات لانے میں لغزش ہو ہی گئی۔ اللہ تعالیٰ حق بات سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین '' [بریلوی کی تحریر ختم ہوئی۔]

محترم شیخ صاحب! مذکورہ فوٹو کاپی ''طاہر القادری'' پارٹی کے ایک فرد نے دی ہے۔ اس سے چند دن ''بخاری شریف'' پر بحث ہوئی۔ اس کا موقف یہ ہے کہ بخاری شریف میں کمزور عقائد کے راوی ہیں، اس لیے بخاری میں اٹھارہ (۱۸) روایتیں ضعیف ہیں۔ اس

---

[1] ایوب بن عائذ اور عطاء بن ابی میمونہ پر اعتراضات اور ان کے تفصیلی جوابات کے لیے ملاحظہ ہو: اشاعۃ الحدیث شمارہ: ۱۲۱

سے مطلوبہ روایتوں کی وضاحت طلب کی تو اس نے بخاری شریف کی دو روایتوں کے نامکمل حوالے دیئے اور کہا کہ اس میں یہ راوی ضعیف ہیں، مثلاً ''زہیر بن محمد تیمی، عبداللہ بن کبیر، عبدالوارث بن سعید، کہمس بن منہال، عبدالملک بن اعین، عطاء بن یزید، مروان بن حکم''
اسی تحریر کے تناظر میں سوال یہ ہے:

مسئلہ: کیا بخاری شریف میں معلّق روایات کے علاوہ، دیگر روایات میں کوئی روایت ضعیف ثابت ہے؟ نیز معلّقات کی بھی وضاحت فرمادیں اور اس کا جواب ''الحدیث'' میں شائع کردیں۔ اللہ آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ جزاکم اللہ خیراً (خالد اقبال سوہدری)

الجواب جس راوی کو جمہور محدثین کرام ثقہ وصدوق قرار دیں، اسے اگر کسی نے قدری، رافضی یا مرجیہ عقائد کا حامل قرار دیا ہے تو ایسا راوی ضعیف نہیں ہوتا بلکہ ثقہ وصدوق یعنی صحیح الحدیث اور حسن الحدیث ہوتا ہے۔ ایسے راوی پر بدعتی وغیرہ کی جرح غیر موثر اور مردود ہوتی ہے۔

۱: امام ابن خزیمہ النیسابوری رحمہ اللہ نے ایک شیعہ راوی کے بارے میں فرمایا:

'' نا عباد بن يعقوب ـ المتهم في رأيه ، الثقة في حديثه ''

ہمیں عباد بن یعقوب نے حدیث بیان کی۔ وہ اپنی رائے میں تہمت زدہ (اور) اپنی حدیث میں ثقہ ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ ۲/ ۳۷۶۔۳۷۷ ح ۱۴۹۷)

۲: امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے عاصم بن ضمرہ کے بارے میں فرمایا: ''ثقة شيعي''
(من کلام ابی زکریا یحییٰ بن معین، روایۃ ابی خالد الدقاق یزید بن الہیثم الباداد: ۱۵۹)

ایک راوی کو امام ابن معین نے ثقہ وغیرہ کہا تو ایک آدمی نے کہا: وہ شیعہ ہے، امام ابن معین نے جواب دیا: ''و شيعي ثقة و قدري ثقة '' اور شیعہ ثقہ (ہوتا) ہے اور قدری ثقہ (ہوتا) ہے۔ (سوالات ابن الجنید: ۶۱۷)

۳: امام ابوزرعہ الرازی رحمہ اللہ نے ابراہیم بن یزید بن شریک التیمی کے بارے میں فرمایا: ''كوفي ثقة مرجئ '' (کتاب الجرح والتعدیل ۲/ ۱۴۵)

۴: امام یعقوب بن سفیان الفارسی رحمہ اللہ نے محمد بن فضیل بن غزوان کے بارے میں فرمایا: " ثقة شيعي " (کتاب المعرفۃ والتاریخ ۱۱۲/۳)

۵: امام عجلی رحمہ اللہ نے محمد بن فضیل بن غزوان کے بارے میں فرمایا:

"كوفي ثقة و كان يتشيع" (التاریخ بترتیب الہیثمی والسبکی: ۱۶۲۵)

۶: امام ابن شاہین البغدادی نے عاصم بن ضمرہ کے بارے میں فرمایا:

" ثقة شيعي " (تاریخ اسماء الثقات: ۸۳۲)

۷: اہلِ سنت کے مشہور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ثور بن یزید کے بارے میں فرمایا:

" كان يرى القدر وهو ثقة في الحديث " وہ قدری مذہب کا قائل تھا اور وہ حدیث میں ثقہ ہے۔ (کتاب العلل ومعرفۃ الرجال ۷۵/۲ ت ۱۵۹۴)

۸: امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ نے عدی بن ثابت کے بارے میں فرمایا:

" هو صدوق، كان إمام مسجد الشيعة و قاصهم " وہ سچا ہے، وہ شیعوں کی مسجد کا امام اور ان کا واعظ (خطیب) تھا۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۲/۷)

۹: متاخرین میں سے اسماء الرجال کے ماہر حافظ ذہبی نے حسان بن عطیہ کے بارے میں فرمایا: "ثقة عابد نبيل لكنه قدري" (الکاشف ۱۵۷/۱ ت ۱۰۱۱)

اور ابان بن تغلب کے بارے میں فرمایا: "شيعي جلد لكنه صدوق ، فلنا صدقه و عليه بدعته" وہ کٹر شیعہ، لیکن سچا ہے، پس ہمارے لئے اس کی سچائی ہے اور اس کی بدعت (کا وبال) اسی پر ہے۔ (میزان الاعتدال ۵/۱)

اس اصول سے حافظ ذہبی نے یہ مسئلہ سمجھا دیا کہ ثقہ وصدوق بدعتی کی روایت مقبول ہوتی ہے۔

۱۰: متاخرین میں سے اسماء الرجال کے دوسرے بڑے ماہر حافظ ابن حجر العسقلانی نے عبدالملک بن مسلم بن سلام کے بارے میں کہا: "ثقة شيعي " (تقریب التہذیب: ۴۲۱۶)

اور ثور بن یزید کے بارے میں فرمایا: "ثقة ثبت إلا أنه يرى القدر "

یعنی وہ ثقہ ثبت قدری تھا۔ (تقریب التہذیب: ۸۶۱)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حوالے موجود ہیں، مثلاً امام سفیان بن سعید الثوری رحمہ اللہ نے قدری راوی ثور بن یزید کے بارے میں فرمایا:

" خذوا عنه واتقوا قرنيه (يعني) أنه كان قدريًا " اس سے (حدیث) لے لو اور اس کے سینگوں سے بچ جاؤ، یعنی وہ قدری تھا۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۲/ ۴۶۸ وسندہ صحیح)

ثابت ہوا کہ جلیل القدر محدثین اور سلف صالحین کے نزدیک ثقہ وصدوق بدعتی راوی کی روایت صحیح وحسن اور حجت ہوتی ہے۔

اس اصولی بحث وتحقیق کے بعد صحیح بخاری کے دونوں راویوں: عطاء بن ابی میمونہ اور ایوب بن عائذ کے بارے میں تحقیق علی الترتیب پیشِ خدمت ہے:

۱) تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب وغیرہما میں عطاء بن ابی میمونہ پر درج ذیل علماء سے جرح مذکور ہے:

ابوحاتم الرازی، بخاری، عقیلی، ابن سعد، ابن الجوزی اور ابن عدی (کل تعداد: ۶)

ان کے مقابلے میں درج ذیل علماء سے توثیق وتصحیح مذکور ہے:

یحییٰ بن معین، ابوزرعہ الرازی، ابن سعد، ابن حبان، یعقوب بن سفیان الفارسی، عجلی، ابن شاہین، بخاری اور مسلم (کل تعداد: ۹)

اگر مزید تلاش کی جائے تو اور بھی کئی توثیقی حوالے مل سکتے ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ عطاء بن ابی میمونہ جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ یا صحیح الحدیث تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے فرمایا: " ثقة رمي بالقدر " (تقریب التہذیب: ۴۶۰۱)

اور حافظ ذہبی نے فرمایا: " صدوق " بہت سچا۔ (الکاشف ۲/ ۲۳۳ ت ۳۸۶۱)

شروع میں عرض کر دیا گیا ہے کہ جس راوی کو جمہور محدثین، ثقہ وصدوق قرار دیں، اس پر قدری وغیرہ کی جرح غیر مؤثر اور مردود ہے۔

تنبیہ: امام بخاری نے انھیں ان پر قدری ہونے کے اعتراض کی وجہ سے کتاب الضعفاء

میں ذکر کیا، لیکن خود انھیں ضعیف و مجروح قرار نہیں دیا، بلکہ صحیح بخاری میں ان کی روایات سے استدلال کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ثقہ وصدوق بدعتی کی روایت صحیح وحسن ہوتی ہے۔

اس بات کی تائید ایوب بن عائذ کے بارے میں امام بخاری کے کلام سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ

کتاب الجرح والتعدیل کے محقق (شیخ معلّمی یمانی رحمہ اللہ) نے فرمایا:

''والبخاري ربما يذكر في كتاب الضعفاء بعض الصحابة الذين روي عنهم شيً لم يصح و مقصوده بذلك ضعف المروي لا ضعف الصحابي''

اور بخاری بعض اوقات کتاب الضعفاء میں بعض صحابہ بھی ذکر کر دیتے ہیں جن سے کوئی روایت مروی ہوتی ہے، لیکن وہ صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ اس سے اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روایت ضعیف ہے، یہ مقصد نہیں ہوتا کہ صحابی ضعیف ہے۔ (حاشیہ ۲۲/۲)

اسی طرح امام بخاری بعض (ثقہ وصدوق عند الجمہور) راویوں کو ارجاء یا قدریہ وغیرہ کی وجہ سے کتاب الضعفاء میں ذکر کر دیتے تھے، مگر وہ راوی اُن کے نزدیک ضعیف نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ انھوں نے ایوب بن عائذ کو ارجاء کے باوجود صدوق (بہت سچا) قرار دیا۔

۲) ایوب بن عائذ کو ارجاء کا معتقد تو قرار دیا گیا ہے، مگر حدیث میں اُس پر کوئی قابلِ ذکر جرح نہیں، اسے صرف ارجاء کی وجہ سے امام ابو زرعہ الرازی (اور امام بخاری) نے کتاب الضعفاء میں ذکر کیا، جبکہ درج ذیل علماء سے توثیق منقول ہے:

یحییٰ بن معین، ابو حاتم الرازی، بخاری، مسلم، نسائی، ابن المدینی، ابن حبان، ابن شاہین اور عجلی وغیرہم (کل تعداد: ۹)

جمہور کے مقابلے میں ایک دو یا بعض یا اقلیت کی جرح مردود ہوتی ہے۔

امام بخاری نے ایوب بن عائذ کے بارے میں فرمایا: ''كان يرى الإرجاء وهو صدوق'' وہ ارجاء کے قائل تھے اور وہ صدوق (بہت سچے) تھے۔ (الضعفاء: ۲۴، وتحقیقی: ۲۵)

معلوم ہوا کہ امام بخاری کے نزدیک ایوب بن عائذ صدوق یعنی حسن الحدیث یا صحیح

الحدیث تھے، لہٰذا ارجاء کی وجہ سے ان کی روایات کو ضعیف قرار دینا امام بخاری کے نزدیک بھی غلط ہے۔

معترض نے ''وھو صدوق'' کے الفاظ چھپا کر انتہائی مذموم حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔

تنبیہ: ایوب بن عائذ کے تحت امام بخاری کے بارے میں حافظ ذہبی کا میزان الاعتدال میں قول: ''و یغمزہ'' بخاری کے اپنے قول: ''وھو صدوق'' کی وجہ سے غلط ہے۔

بریلویوں کے ''ہم فقہ'' بھائی سرفراز خان صفدر دیوبندی نے کیا ہی خوب لکھا ہے کہ ''بایں ہمہ ہم نے توثیق وتضعیف میں جمہور آئمہ جرح وتعدیل اور اکثر آئمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا۔ مشہور ہے کہ ع زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو''

(احسن الکلام ج ا ص ۴۰، دوسرا نسخہ ص ۶۱)

عبدالوہاب بن علی السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) نے لکھا ہے کہ ''الجرح مقدم إن کان عدد الجارح أکثر من المعدل اجماعًا ... '' اور اس پر اجماع ہے کہ اگر جارحین معدلین کے مقابلے میں زیادہ ہوں تو جرح مقدم ہوتی ہے...

(قاعدۃ فی الجرح والتعدیل للسبکی ص ۵۰)

اس اجماع (یا جمہور) کے مفہوم سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اگر معدلین کی تعداد زیادہ ہو تو تعدیل یعنی توثیق مقدم ہوگی اور ہمارے نزدیک یہی راجح ہے۔

تنبیہ: طاہر القادری پارٹی والے کا یہ کہنا کہ بخاری شریف میں ''ایسے راوی بھی ہیں جو منکر الحدیث واہی اور وہمی تھے۔'' بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔

ہمارا یہ چیلنج ہے کہ صحیح بخاری کے اصول میں ایک راوی بھی ایسا نہیں جسے جمہور نے منکر الحدیث، واہی، وہمی یا ضعیف قرار دیا ہو۔ والحمد للہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام بخاری بشر تھے اور ان سے تسامح ممکن تھا، مگر یاد رہے کہ صحیح بخاری کو تلقی بالقبول حاصل ہے اور اس وجہ سے صحیح بخاری کی تمام مرفوع سند متصل

روایات یقیناً صحیح ہیں۔

عینی حنفی نے کہا: مشرق و مغرب کے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کتاب اللہ کے بعد بخاری و مسلم سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ۱/۵)

ملا علی قاری نے کہا: پھر علماء کا اتفاق ہے کہ صحیحین کو تلقی بالقبول حاصل ہے اور یہ دونوں کتابیں تمام کتابوں میں صحیح ترین ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح ۱/۵۸)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے فرمایا:

''صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں تمام محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل اور مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچی ہیں۔ جو ان کی عظمت نہ کرے وہ بدعتی ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔''

(حجۃ اللہ البالغہ اردو مترجم ۱/۲۴۲، از عبدالحق حقانی)

احمد رضا خان بریلوی نے حدیثِ بخاری کو ''اجل و اعلیٰ حدیث'' قرار دیا۔

دیکھئے احکام شریعت (حصہ اول ص ۶۲)

بریلویوں کے ایک بزرگ عبدالسمیع رامپوری نے لکھا ہے: ''اور یہ محدثین میں قاعدہ ٹھہر چکا ہے کہ صحیحین کی حدیث نسائی وغیرہ کل محدثوں کی احادیث پر مقدم ہے کیونکہ اوروں کی حدیث اگر صحیح بھی ہوگی تو صحیحین اس سے صحیح اور قوی تر ہوگی'' (انوار ساطعہ ص ۴۱)

بریلوی پیر محمد کرم شاہ بھیروی نے فرمایا: ''جمہور علماء امت نے گہری فکر و نظر اور بے لاگ نقد و تبصرہ کے بعد اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری کا عظیم الشان لقب عطا فرمایا ہے۔'' (سنت خیر الانام ص ۱۷۵، طبع ۲۰۰۱ء)

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب: صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ (ص ۱۲۔۱۳، ص ۱۷۔۱۸)

معترض مذکور کا یہ کہنا کہ ''بخاری میں اٹھارہ روایتیں ضعیف ہیں۔'' بالکل غلط، باطل اور مردود ہے۔ آپ اسے کہیں کہ تمھیں سترہ روایتیں معاف ہیں، صرف ایک روایت کا

ضعیف ہونا اُصولِ حدیث اور اسماء الرجال کی رُو سے (عند الجمہور) ثابت کردو، اپنے ساتھیوں کو بھی ملالو اور اگر نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے (ان شاء اللہ)

تو صحیح بخاری کے خلاف طعن و تشنیع والی زبان کو کنٹرول کرو، ورنہ اُخروی پکڑ سے نہیں بچ سکو گے۔ ان شاء اللہ

معترض کا قول: ''بخاری شریف میں کمزور عقائد کے راوی ہیں'' جمہور کی توثیق کے بعد جرح نہیں بلکہ مردود ہے۔

زہیر بن محمد التمیمی، عبدالوارث بن سعید، کہمس بن منہال، عبدالملک بن اعین، عطاء بن یزید اور مروان بن حکم سب جمہور کے نزدیک ثقہ یا صدوق یعنی صحیح الحدیث یا حسن الحدیث تھے، لہٰذا ان پر بعض کی جرح مردود ہے۔

عبداللہ بن کبیر نامی راوی صحیح بخاری کا راوی ہی نہیں بلکہ یہ کتابت کی غلطی یا تصحیف معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

صحیح بخاری کی معلّق روایات انھیں کہا جاتا ہے، جن کی امام بخاری نے مذکورہ مقام پر متصل سند بیان نہیں کی، مثلاً صحیح بخاری، کتاب الایمان کے پہلے باب میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ وغیرہ کے اقوال معلّق روایات میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر العسقلانی نے تغلیق التعلیق کے نام سے ایک عظیم الشان کتاب لکھی ہے، جس میں صحیح بخاری کی معلّق روایات کو اپنی استطاعت کے مطابق باسند بیان کر دیا ہے، اور یہ کتاب مقدمے کے ساتھ پانچ جلدوں میں مطبوع ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق صحیح بخاری میں باسند متصل ایسی کوئی مرفوع حدیث نہیں جو ضعیف ہو اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ والحمد للہ

معترض سے کہیں کہ وہ اپنے طاہر القادری صاحب کو تیار کریں، وہ صحیح بخاری کے اصول میں سے تین مسند متصل مرفوع روایات کا ضعیف ہونا ثابت کرنے کی کوشش کریں، ہم ان شاء اللہ اس کا جواب دیں گے اور صحیح بخاری کی احادیث اور راویوں کا دفاع کریں

گے۔

نیز ان سے یہ مطالبہ بھی کریں کہ وہ صحیح ابی حنیفہ یعنی امام ابوحنیفہ کی وہ کتاب جس میں انھوں نے صرف صحیح احادیث کو جمع کیا تھا، پیش کریں تاکہ صحیح بخاری اور صحیح ابی حنیفہ کے درمیان مقارنہ وموازنہ کیا جا سکے۔ و ما علینا إلا البلاغ (۱۱/ دسمبر ۲۰۱۰ء)

آلِ بریلی وآلِ دیوبند کے نزدیک تفسیر ابن عباس (مطبوع) کا علمی مقام

سوال آج کل تفسیر ابن عباس (تنویر المقباس) کے نام سے ایک کتاب مشہور ہے، جس سے بعض آلِ بریلی وآلِ دیوبند اپنی تحریروں وتقریروں میں چند حوالے بطورِ استدلال پیش کرتے ہیں۔ اس تفسیر کا علمی مقام کیا ہے؟ تحقیق وثبوت سے جواب دیں۔

(ایک سائل)

الجواب ابو طاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی الشیرازی الشافعی (متوفی ۸۱۷ھ) کی روایت سے تنویر المقباس (تفسیر ابن عباس) نامی جو تفسیر مشہور ہوئی ہے، اس کی آخری سند کا دارومدار "محمد بن مروان السدي الصغير عن محمد بن السائب الكلبي عن أبي صالح" پر ہے۔

السدی عن الکلبی کی یہ تفسیر سلسلۃ الکذب اور جھوٹ کا پلندا ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو (عدد ۲۴ ص ۴۹۔ ۶۱)

فی الحال آلِ بریلی وآلِ دیوبند کے دو زبردست حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱: احمد رضا خان بریلوی نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"(۳) یہ تفسیر کہ منسوب بسیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہے نہ اُن کی کتاب ہے نہ اُن سے ثابت، یہ بسند محمد بن مروان عن الکلبی عن ابی صالح مروی ہے اور ائمۂ دین اس سند کو

فرماتے ہیں کہ یہ سلسلۂ کذب ہے۔

تفسیر اتقان شریف میں ہے:

و اوهی طرقه طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس فان انضم الی ذٰلك روایة محمد بن مروان اسدی الصغیر فهی سلسلة الکذب (۱۸۹/۲)

اس کے طُرق میں سے کمزور ترین طریق کلبی کا ابوصالح سے اور اس کا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرنا اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان اسدی کی روایت مل جائے تو کذب کا سلسلہ ہے۔ (ت)'' (فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص۳۹۶)

۲: محمد تقی عثمانی دیوبندی نے لکھا ہے:

''رہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سواگر چہ وہ باتفاق مفسرین کے امام ہیں، لیکن اوّل تو ان کی تفسیر کتابی شکل میں کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، آج کل ''تنویر المقباس'' کے نام سے جو نسخہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس کی سند نہایت ضعیف ہے، کیونکہ یہ نسخہ محمد بن مروان السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح کی سند سے ہے، اور اس سلسلۂ سند کو محدثین نے ''سلسلۃ الکذب'' قرار دیا ہے۔'' (فتاویٰ عثمانی ج۱ ص۲۱۵)

ان دونوں بریلوی و دیوبندی فتووں (مفتیٰ بہا اقوال) سے بھی ثابت ہوا کہ تفسیر ابن عباس نامی کتاب کا انتساب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف صحیح نہیں ہے، لہٰذا اس کتاب سے آلِ بریلوی و آلِ دیوبند کے نزدیک بھی استدلال غلط و مردود ہے۔

(۱۲/ جولائی ۲۰۱۱ء)

اگر ایمان ثریا (ستارے) پر بھی ہو تو؟

سوال سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان آسمان کے ثریا ستارے پر جا لٹکے تو بھی آلِ فارس سے ایک شخص اسے پالے گا۔ (مسلم)

اس حدیث کے صحیح مصداق کون سے امام ہیں؟ ہم نے بعض حنفیوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس حدیث کے مصداق امام ابوحنیفہ ہیں اور کیا ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان میں کہا ہے کہ اس سے مراد ابوحنیفہ ہیں؟ (قاری محمد اسماعیل سلفی، جھنگ)

الجواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

((لو كان الدين عند الثريا لذهب به رجل من فارس أو قال: من أبناء فارس - حتى يتناوله .)) اگر دین ثریا (تارے) کے پاس ہوتا تو فارس یا اولادِ فارس میں سے ایک آدمی اسے پالیتا۔ (صحیح مسلم:۲۵۴۶، ترقیم دارالسلام:۶۴۹۷)

امام عبدالرزاق کی بیان کردہ یہی روایت مصنف عبدالرزاق میں درج ذیل الفاظ کے ساتھ ہے:

" لذهب إليه رجل - أو قال: رجال من أبناء فارس حتى يتنا ولوه"

(ج ۱۱ ص ۶۵ ح ۱۹۹۲۳، دوسرا نسخہ ج ۱۰ ص ۱۱۴ ح ۲۰۰۹۲)

دبری کی بیان کردہ کتاب: مصنف عبدالرزاق کی یہی روایت اخبار اصفہان لابی نعیم الاصفہانی (۴/۱) میں بھی انھی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

امام عبدالرزاق کے مشہور شاگرد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس حدیث کو درج ذیل الفاظ کے ساتھ بیان کیا:

" لذهب رجال من فارس - أو أبناء فارس حتى يتناولوه "

(مسند احمد ۲/ ۳۰۹ ح ۸۰۸۱، موسوعہ حدیثیہ ۱۳/ ۴۴۴-۴۴۵)

یہی حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری سند کے ساتھ صحیح بخاری (۴۸۹۸) اور صحیح مسلم (ح ۲۵۴۶، ترقیم دارالسلام: ۶۴۹۸) میں " لنا له رجال من هؤلاء " کے الفاظ سے موجود ہے اور صحیح بخاری (۴۸۹۷) میں "لنا له رجال أو رجل من هؤلاء" کے متن سے ثابت ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں دو اقسام کا ذکر ہے اور یہی دونوں اقسام مراد ہیں:

۱: رجل (فارس کا ایک آدمی)

۲: رجال (فارس کے بہت سے آدمی)

اول الذکر (رجل) سے مراد سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں، جیسا کہ کئی دلائل سے ثابت ہے۔ مثلاً:

۱: حدیث کے سیاق میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر ہاتھ رکھ کر یہ الفاظ بیان فرمائے تھے۔ دیکھئے صحیح بخاری (۴۸۹۷)

۲: حافظ ابن عبدالبر نے اس حدیث کو سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے الاستیعاب ۱/۳۸۲ ت ۱۰۱۳)

ثانی الذکر (رجال) سے مراد فارس کے رہنے والے جلیل القدر اور صحیح العقیدہ محدثین ہیں۔ حافظ ابن حجر نے قرطبی سے نقل کیا: ان (فارسی) لوگوں میں حفاظِ حدیث مشہور ہیں، جو دوسروں میں نہیں ہیں۔ (دیکھئے فتح الباری ج ۸ ص ۶۴۳ تحت ح ۴۸۹۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ”و مصداق ذلك: ما وُجد في التابعين و من بعدهم من أبناء فارس الأحرار و الموالي مثل: الحسن و ابن سيرين و عكرمة مولى ابن عباس وغيرهم...... “ إلخ

اور اس کا مصداق وہ تابعین اور ان کے بعد کے لوگ ہیں جو فارس کے رہنے والے آزاد اور آزاد کردہ غلام تھے مثلاً حسن بصری، محمد بن سیرین، عکرمہ مولی ابن عباس وغیرہم۔ الخ

(اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۴۵)

وغیرہم سے مراد امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداود، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام یعقوب بن سفیان الفارسی اور دوسرے جلیل القدر محدثین ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین

دسویں صدی ہجری کے ایک مبتدع ابوالعباس احمد بن محمد بن محمد... ابن حجر الہیتمی المکی کا حدیثِ مذکور میں رجل سے امام ابوحنیفہ مراد لینا دو وجہ سے باطل ہے:

۱: امام ابوحنیفہ کا فارسی ہونا صحیح سند سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حنفیہ، سیوطی

اور ابن حجر مکی وغیرہم جو کچھ ذکر کرتے ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندا اور باطل ہے۔
تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب: توضیح الاحکام (ج ۲ ص ۴۰۱-۴۰۲)

۲: امام ابوحنیفہ کابل کے باشندے تھے، جیسا کہ امام ابونعیم الفضل بن دکین الکوفی رحمہ اللہ (متوفی ۲۱۸ھ) نے فرمایا: ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی، آپ کی اصل کابل سے ہے۔ (تاریخ بغداد ۱۳/۳۲۴-۳۲۵ وسندہ صحیح)

کابل ایک علیحدہ ملک (اقلیم) ہے اور فارس ایک علیحدہ ملک ہے۔
دیکھئے معجم البلدان (۳/۴۲۶، ۴/۲۲۶) اور توضیح الاحکام (۲/۴۰۲)
کابلی کو فارسی بنانا بہت بڑی تاریخ سازی اور فراڈ ہے۔

غلام رسول سعیدی بریلوی نے اپنے عینی حنفی سے نقل کیا ہے کہ ''اس میں اختلاف ہے کہ وہ آخرین منہم سے کون مراد ہیں، اور اس میں یہ اقوال ہیں:
(۱) تابعین (۲) عجم (۳) ابناء عجم (۴) صحابہ کے بعد کے لوگ (۵) قیامت تک کے مسلمان (۶) علامہ قرطبی نے کہا احسن یہ ہے کہ اس کو ابناء فارس پر محمول کیا جائے۔
یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ فارس میں دینی علوم کا غلبہ ہوا اور وہاں بہت علماء کا ظہور ہوا اور یہ حدیث نبی ﷺ کی پیش گوئی کے صدق پر دلیل ہے۔''
(شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۲۴۲-۱۲۴۳ تحت ح ۶۳۷۴-۶۳۷۵ بحوالہ عمدۃ القاری ج ۱۹ ص ۲۳۵)

آپ نے دیکھ لیا کہ عینی نے متعصب حنفی ہونے کے باوجود امام ابوحنیفہ کو اس حدیث کا مصداق قرار نہیں دیا مگر غلام رسول سعیدی نے اپنی بریلویت بچانے کے لئے دسویں صدی کے غیر مقلد سیوطی سے نقل کیا: ''اس میں امام ابوحنیفہ کی طرف اشارہ ہے''
اور اس کے بعد لکھا:
''حافظ سیوطی کے شاگرد علامہ شامی نے لکھا ہے کہ ہمارے استاذ نے جو یہ جزم کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس حدیث سے مراد امام ابوحنیفہ ہیں، کیونکہ ابناء فارس میں امام ابوحنیفہ کے مرتبہ علم و فضل تک کوئی نہیں پہنچا۔'' (شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۲۴۳)

سعیدی بریلوی صاحب کا یہ بیان چار وجہ سے باطل ہے:

۱: سیوطی (غیر مقلد) کی وفات ۹۱۱ھ ہے اور ابن عابدین شامی صاحب ۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ (دیکھئے معجم المؤلفین ۳/۱۴۵ ت ۴۲۲۷)

۲۸۷ سال بعد میں پیدا ہونے والے کیا سیوطی کی قبر میں پڑھنے کے لئے گئے تھے؟!

تنبیہ: سیوطی کے غیر مقلد ہونے کے لئے دیکھئے، سیوطی کی کتاب: ''الرد علی من أخلد إلی الأرض و جهل أن الاجتهاد في کل عصر فرض''

۲: امام ابوحنیفہ فارسی نہیں تھے۔

۳: امام ابوحنیفہ کابلی تھے۔

۴: اس روایت سے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور احادیث، علومِ حدیث، تفاسیر اور کتبِ اسماء الرجال لکھنے والے فارسی محدثین کرام مراد ہیں۔

اگر حنفیہ، بریلویہ اور دیوبندیہ تینوں فرقے ناراض نہ ہوں تو عرض ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جو ''صحیح ابی حنیفہ'' لکھی تھی، وہ کہاں ہے؟

امام ابوحنیفہ نے جو کتاب التفسیر لکھی تھی، وہ کہاں ہے؟

امام ابوحنیفہ نے اصولِ فقہ و اصولِ حدیث کی جو کتاب لکھی تھی، وہ کہاں ہے؟

امام ابوحنیفہ نے اسماء الرجال کی جو کتاب لکھی تھی، وہ کہاں ہے؟

آخر میں عرض ہے کہ اپنے دین میں غلو نہ کریں، عدل و انصاف سے کام لیں اور کیا صبح قریب نہیں ہے؟!

(۱۳/ اگست ۲۰۱۱ء)

محدثین کے ابواب: پہلے اور بعد؟!

سوال الیاس گھمن صاحب نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ اہلحدیث جو ہیں وہ منسوخ روایات پر عمل کرتے ہیں اور ہم دیوبندی ناسخ روایات پر عمل کرتے ہیں۔

اور وہ ایک قاعدہ و قانون بتاتے ہیں کہ محدثین کرام رحمہم اللہ اجمعین اپنی احادیث کی کتابوں میں پہلے منسوخ روایات کو یا اعمال کو لائے ہیں پھر انھوں نے ناسخ روایات کو جمع کیا ہے۔ کیا واقعی یہ بات درست ہے؟ اور وہ مثال دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں پہلے رفع یدین کرنے کی روایات ذکر کی ہیں پھر نہ کرنے کی روایات ذکر کی ہیں یعنی رفع الیدین منسوخ ہے اور رفع الیدین نہ کرنا ناسخ ہے، اسی طرح محدثین نے پہلے فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی روایات ذکر کی ہیں پھر امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کی روایات ذکر کی ہیں، اہلِ حدیث منسوخ روایات پر عمل کرتے ہیں اور ہم ناسخ پر۔

کیا... الیاس گھمن صاحب نے جو قاعدہ و قانون بیان کیا ہے وہ واقعی محدثینِ جمہور کا قاعدہ ہے اور دیوبندیوں کا اس قانون پر عمل ہے اور اہل حدیث اس قانون کے مخالف ہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔ (خرم ارشاد محمدی۔ دولت نگر)

الجواب گھمن صاحب کی مذکورہ بات کئی وجہ سے غلط ہے، تاہم سب سے پہلے تبویبِ محدثین کے سلسلے میں دس (۱۰) حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱) امام ابوداود نے باب باندھا:

''باب من لم یر الجھر ببسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' (سنن ابی داود ص ۱۲۲ قبل ح ۷۸۲)

اس کے بعد امام ابوداود نے دوسرا باب باندھا:

''باب من جھر بھا'' (سنن ابی داود ص ۱۲۲ قبل ح ۷۸۶)

یعنی امام ابوداود نے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم عدمِ جہر (سرًا فی الصلوٰۃ) والا باب لکھا اور بعد میں بسم اللہ بالجہر والا باب باندھا تو کیا گھمن صاحب اور اُن کے ساتھی اس بات کے لئے تیار ہیں کہ سرًا بسم اللہ کو منسوخ اور جہرًا بسم اللہ کو ناسخ قرار دیں؟ اور اگر نہیں تو پھر اُن کا اُصول کہاں گیا؟!

تنبیہ: امام ترمذی نے بھی ترکِ جہر کا پہلے اور جہر کا باب بعد میں باندھا ہے۔
دیکھئے سنن الترمذی (ص ۶۷۔ ۶۸ قبل ح ۲۴۴، ۲۴۵)

۲) امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب باندھا:

"باب ما جاء في الوتر بثلاث" (سنن الترمذی ص۱۲۲، قبل ح۴۵۹)

پھر بعد میں "باب ما جاء في الوتر بركعة" کا باب باندھا۔ (سنن الترمذی قبل ح۴۶۱)

کیا گھمن صاحب اپنے خود ساختہ قاعدے وقانون کی رُو سے تین وتر کو منسوخ اور ایک وتر کو ناسخ سمجھ کر ایک وتر پڑھنے کے قائل وفاعل ہو جائیں گے؟!

۳) امام ابن ماجہ نے پہلے کعبہ کی طرف پیشاب کرنے کی ممانعت والا باب باندھا:

"باب النهي عن استقبال القبلة بالغائط والبول" (سنن ابن ماجہ ص۴۸ قبل ح۳۱۷)

اور بعد میں "باب الرخصة في ذلك في الكنيف وإباحته دون الصحارى" یعنی صحراء کے بجائے بیت الخلاء میں قبلہ رخ ہونے کے جواز کا باب، باندھا۔

(سنن ابن ماجہ ص۴۹ قبل ح۳۲۲)

کیا گھمن صاحب! قبلہ رخ پیشاب کرنے کی ممانعت کو اپنے اصول کی وجہ سے منسوخ سمجھتے ہیں؟!

۴) امام نسائی نے رکوع میں ذکر (یعنی تسبیحات) کے کئی باب باندھے۔ مثلاً:

"باب الذكر في الركوع" (سنن النسائی ص۱۴۴، قبل ح۱۰۴۷)

اور بعد میں باب باندھا: "باب الرخصة في ترك الذكر في الركوع"

(سنن النسائی ص۱۴۵، قبل ح۱۰۵۴)

کیا گھمنی قاعدے کی رُو سے رکوع کی تسبیحات پڑھنا بھی منسوخ ہے؟!

۵) امام ابن ابی شیبہ نے نماز میں ہاتھ باندھنے کا باب درج ذیل الفاظ میں لکھا:

"وضع اليمين على الشمال" (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۹۰ قبل ح۳۹۳۳)

اور بعد میں "من كان يرسل يديه في الصلوة" یعنی نماز میں ہاتھ چھوڑنے کا باب باندھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج۱ص۳۹۱ قبل ح۳۹۴۹)

ان دونوں بابوں میں سے کون سا باب گھمن صاحب کے نزدیک منسوخ ہے؟ پہلا یا

بعد والا؟ کیا خیال ہے، اب دیوبندی حضرات ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھا کریں گے یا پھر الیاس گھمن صاحب کے اصول کو ہی دریا میں پھینک دیں گے؟!

٦) امام نسائی نے نمازِ عصر کے بعد نوافل پڑھنے سے منع والا باب باندھا:

''النهي عن الصلاة بعد العصر '' (سنن النسائی ص ۷۸ قبل ح ۵٦۷)

اور بعد میں ''الرخصة في الصلاة بعد العصر ''

یعنی عصر کے بعد نماز (نوافل) کی اجازت، کا باب باندھا۔ (سنن النسائی ص ۷۹ قبل ح ۵۷۴)

کیا گھمن صاحب کے اصول سے نمازِ عصر کے بعد نوافل پڑھنے سے ممانعت والی حدیث منسوخ ہے؟!

۷) امام ابوداود نے تین تین دفعہ اعضائے وضوء دھونے کا باب باندھا:

'' باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً '' (سنن ابی داود ص ۲۹ قبل ح ۱۳۵)

اور بعد میں ایک دفعہ اعضائے وضوء دھونے کا باب باندھا:

''باب الوضوء مرة مرة '' (سنن ابی داود ص ۳۰ قبل ح ۱۳۸)

کیا وضوء کرتے وقت تین تین دفعہ اعضائے وضوء دھونا منسوخ ہے؟ اگر نہیں تو پھر گھمن صاحب کا قاعدہ کہاں گیا؟!

۸) امام نسائی نے سجدوں کی دعا (تسبیحات) کے کئی باب باندھے۔ مثلاً:

''عدد التسبيح في السجود '' (سنن النسائی ص ۱۵۷، قبل ح ۱۱۳٦)

اور بعد میں ''باب الرخصة في ترك الذكر في السجود ''یعنی سجدوں میں ترکِ ذکر (ترکِ تسبیحات) کی رخصت (اجازت) کا باب۔ (سنن النسائی ص ۱۵۷، قبل ح ۱۱۳۷)

کیا گھمنی قاعدے وقانون کی رُو سے سجدوں کی تسبیحات بھی منسوخ ہیں؟!

۹) امام ابن ابی شیبہ نے ''من قال: لا جمعة و لا تشريق إلا في مصر جامع '' کا باب باندھ کر وہ روایات پیش کیں، جن سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ گاؤں میں جمعہ نہیں پڑھنا چاہئے۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۱۰۱، قبل ح ۵۰۵۹)

اور انھوں نے بعد میں "من کان یری الجمعة فی القری وغیرها" "جو شخص گاؤں وغیرہ میں جمعہ کا قائل ہے، کا باب باندھ کر وہ صحیح روایات پیش کیں، جن سے گاؤں میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۱۰۱۔۱۰۲، قبل ح ۵۰۶۸)

کیا گھمن صاحب اور اُن کے ساتھی اپنے نرالے قاعدے کی "لاج" رکھتے ہوئے گاؤں میں نمازِ جمعہ کی مخالف تمام روایات کو منسوخ سمجھتے ہیں؟! اگر نہیں تو کیوں اور اُن کا قاعدہ کہاں گیا؟

۱۰) امام ابن ابی شیبہ نے نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں کا باب باندھا: "ما قالوا فی التکبیر علی الجنازة من کبّر أربعًا" (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۲۹۹ قبل ح ۱۱۴۱۶)

اور اس کے فوراً بعد پانچ تکبیروں کا باب باندھا:

"من کان یکبّر علی الجنازة خمسًا" (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۳۰۲ قبل ح ۱۱۴۴۷)

کیا گھمن صاحب کی پارٹی میں کسی ایک آدمی میں بھی یہ جرأت ہے کہ وہ اپنے اس بھمنی قاعدے، قانون اور اصول کی لاج رکھتے ہوئے جنازے کی چار تکبیروں کو منسوخ اور پانچ کو ناسخ کہہ دے؟!

اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً امام نسائی نے ایک باب میں: سجدہ کرنے سے پہلے گھٹنے زمین پر لگانے والی (ضعیف) حدیث لکھی اور پھر اس کے فوراً بعد دو حدیثیں لکھیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے دونوں ہاتھ لگائے جائیں۔

دیکھئے سنن النسائی (ص ۱۵۰۔۱۵۱، قبل ح ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲)

امام ابو داود نے آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کے ترک کا باب پہلے باندھا ہے اور پھر دوسرے باب میں آگ پر پکا ہوا کھانا کھانے سے وضوء ٹوٹنے کی حدیثیں لائے ہیں۔ (دیکھئے سنن ابی داود ح ۱۸۷۔۱۹۳، اور ح ۱۹۴۔۱۹۵)

معلوم ہوا کہ گھمن صاحب کا مزعومہ قاعدہ، قانون اور اصول باطل ہے، جس کی تردید کے لئے ہمارے مذکورہ حوالے ہی کافی ہیں اور دیوبندی حضرات میں سے کوئی بھی

اس اصول کو من وعن تسلیم کر کے دوسرے ابواب والی مذکورہ روایات کو منسوخ نہیں سمجھتا، لہٰذا اہلِ حدیث یعنی اہلِ سنت کے خلاف یہ خود ساختہ قاعدہ واصول پیش کر کے پروپیگنڈا کرنا غلط اور مردود ہے۔ بطورِ لطیفہ اور بطورِ عبرت ونصیحت عرض ہے کہ نیموی حنفی صاحب نے مسجد میں دوسری نماز با جماعت کے مکروہ ہونے کا باب باندھا: ''باب ما استدل به علی کراهة تکرار الجماعة في مسجد '' (آثار السنن قبل ح ۵۲۶)

اور اس کے فوراً بعد دوسری جماعت کرانے کے جواز کا باب باندھا:

''باب ما جاء في جواز تکرار الجماعة في مسجد ''(آثار السنن قبل ح ۵۲۷)

کیا یہاں بھی گھمن صاحب اور آلِ گھمن جماعتِ ثانیہ کی تکرار کے بارے میں دعویٰ کراہت منسوخ اور جواز کو ناسخ سمجھ کر جائز ہونے کا فتویٰ دیں گے۔؟!

ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ ایک اصول و قاعدہ خود بنا کر پھر خود ہی اُسے توڑ دیا جائے، پاش پاش کر دیا جائے بلکہ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا بنا کر ہوا میں اُڑا دیا جائے۔ اس طرح سے تو بڑی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔

کیا آلِ دیوبند میں کوئی بھی ایسا نہیں جو گھمن صاحب کو سمجھائے کہ اپنی اوقات سے پاؤں باہر نہ پھیلائیں اور اپنے خود ساختہ اصولوں کی بذاتِ خود تو مخالفت نہ کریں۔!؟

ثابت ہوا کہ اہلِ حدیث (یعنی اہلِ سنت) منسوخ روایات پر عمل نہیں کرتے، لہٰذا گھمن صاحب نے اپنی مذکورہ تقریر میں خطیبانہ جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہلِ حدیث کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے، جسے دوسرے الفاظ میں دروغ گوئی کہا جاتا ہے اور ایسا کرنا شریعتِ اسلامیہ میں ممنوع ہے۔

منسوخ روایات پر دیوبندی علماء وعوام کے عمل کی دو مثالیں درج ذیل ہیں:

۱: صبح کی نماز روشنی میں پڑھنا بھی ثابت ہے اور اندھیرے میں پڑھنا بھی ثابت ہے۔ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ''ما صلّی رسول اللّٰه ﷺ الصلوة لوقتها الآخر حتی قبضه اللّٰه '' رسول اللہ ﷺ نے وفات تک آخری وقت میں کبھی نماز نہیں پڑھی۔

(المستدرک للحاکم ۱/۱۹۰ ح ۶۸۲ وسندہ حسن، وصححہ الحاکم علی شرط الشیخین ووافقہ الذہبی)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ صبح کی نماز روشنی میں پڑھنا منسوخ ہے۔ نیز دیکھئے الناسخ والمنسوخ للحازمی (ص ۷۷) اور میری کتاب ہدیۃ المسلمین (حدیث نمبر ۸ ص ۲۶۔۲۷)

عام دیوبندیوں کا عمل یہ ہے کہ وہ رمضان کے علاوہ باقی مہینوں میں نمازِ فجر خوب روشنی کر کے یعنی منسوخ وقت میں پڑھتے ہیں۔

۲: ایک روایت میں ''و إذا قرأ فانصتوا ''یعنی جب امام قراءت کرے تو تم خاموش ہو جاؤ، کے الفاظ آئے ہیں۔ دیکھئے صحیح مسلم (۴۰۴، ترقیم دارالسلام: ۹۰۵)

چونکہ اس حدیث کے ایک راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تھے۔ (صحیح مسلم: ۴۰۴، دارالسلام: ۹۰۵)

اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فاتحہ خلف الامام کا حکم ثابت ہے۔

دیکھئے جزء القراءۃ للبخاری (۱۵۳، وسندہ صحیح) آثار السنن (۳۵۸ وقال: واسنادہ حسن) اور میری کتاب: علمی مقالات (ج ۲ ص ۲۶۳)

حنفیوں کا مشہور اُصول ہے کہ اگر راوی اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دے تو وہ روایت منسوخ ہوتی ہے، لہٰذا اس فتوے کی رُو سے ''و إذا قرأ فانصتوا '' والی روایت منسوخ ہے، لیکن دیوبندی حضرات فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر اپنی کتابوں اور مناظروں میں اس منسوخ حدیث کو بطورِ حجت پیش کرتے ہیں۔

اپنے ہی اصول خود توڑ کر پاش پاش کر دینا مذہبی خودکشی کی بدترین مثال ہے۔

☆ فاتحہ خلف الامام کا منسوخ ہونا تو بہت دُور کی بات ہے، کسی ایک بھی صحیح حدیث میں صراحت کے ساتھ فاتحہ خلف الامام کی مخالفت ثابت نہیں۔ دیوبندیوں کے پیارے عبدالحئ لکھنوی صاحب نے علانیہ لکھا ہے: ''انه لم یرد فی حدیث مرفوع صحیح النهي عن قراءة الفاتحة خلف الإمام و کل ما ذکروہ مرفوعًا فیه اما لا اصل له و اما لا یصح ... ''کسی مرفوع صحیح حدیث میں فاتحہ خلف الامام کی ممانعت نہیں آئی، لوگوں نے اس بارے میں جو مرفوع روایتیں ذکر کی ہیں اُن کی یا تو کوئی اصل نہیں یا وہ صحیح نہیں

ہیں۔ (التعلیق الممجد ص ۱۰۱، حاشیہ نمبر ۱)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام فاتحہ خلف الامام کے قائل و فاعل تھے۔ دیکھئے میری کتاب الکواکب الدریہ (ص ۲۴۔۲۷)

کیا یہ جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین منسوخ پر عمل پیرا تھے؟

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے فرمایا: اور یقیناً علماء کا اجماع ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے (سورۂ فاتحہ) پڑھتا ہے، اس کی نماز مکمل ہے، اس پر کوئی اعادہ نہیں ہے۔

(الاستذکار ۲/ ۱۹۳، الکواکب الدریہ ص ۳۱، نیز دیکھئے میری کتاب: نصر الباری فی تحقیق جزء القراءۃ للبخاری)

☆ نماز میں رفع یدین قبل الرکوع و بعدہ کو منسوخ کہنا کئی وجہ سے باطل ہے، جس کی تفصیل میری کتاب نور العینین فی اثبات رفع الیدین میں دیکھی جا سکتی ہے، فی الحال گھسن صاحب کے دعویٔ منسوخیت کے ابطال کے لئے دس دلیلیں اور حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱: رفع یدین کا متروک یا منسوخ ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ کی ساری زندگی میں کسی ایک نماز کی کسی ایک رکعت میں بھی باسند صحیح و مقبول ثابت نہیں ہے۔

تنبیہ: اس سلسلے میں امام سفیان ثوری (مدلس) کی عاصم بن کلیب سے روایت اُن کے ''عن'' یعنی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے نور العینین اور الحدیث حضرو: ۶۷

۲: رفع یدین کا منسوخ یا متروک ہونا کسی ایک صحابی سے بھی باسند صحیح و مقبول ثابت نہیں ہے۔

تنبیہ: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تینوں صحابیوں میں سے کسی ایک سے بھی ترکِ رفع یدین ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے نور العینین

اب آلِ دیوبند کے پسندیدہ علماء کے حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۳: عبدالحی لکھنوی نے دعویٔ منسوخیت کو بے دلیل قرار دیا ہے۔ (دیکھئے التعلیق الممجد ص ۹۱)

۴: انور شاہ کشمیری دیوبندی نے کہا: '' و لیعلم أن الرفع متواتر إسنادًا و عملاً لا

یشك فیہ ولم ینسخ ولا حرف منہ ''اور جان لینا چاہئے کہ رفع یدین بلحاظِ سند و بلحاظِ عمل متواتر ہے، اس میں کوئی شک نہیں، یہ منسوخ نہیں ہوا اور اس کا ایک حرف بھی منسوخ نہیں ہوا۔ (نیل الفرقدین ص ۲۲)

یاد رہے کہ یہ قول بطورِ الزامی دلیل پیش کیا گیا ہے، ترکِ رفع یدین کے سلسلے میں انور شاہ صاحب وغیرہ کے نظریات سے ہم پر رد کرنا غلط ہے۔

۵: ابوالحسن سندھی حنفی نے رفع یدین کے منسوخ ہونے کا انکار کیا ہے۔
دیکھئے شرح سنن ابن ماجہ (ج ۱ ص ۲۸۲ تحت ح ۸۵۸)

۶: بدر عالم میرٹھی نے بھی یہی کہا کہ رفع یدین منسوخ نہیں ہے۔ (البدر الساری ۲/ ۲۵۵)

۷: شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب نے رفع یدین کے بارے میں فرمایا:
''اور جو شخص رفع یدین کرتا ہے میرے نزدیک اس شخص سے جو رفع یدین نہیں کرتا اچھا ہے...'' (حجۃ اللہ البالغہ اردو ج ۱ ص ۳۶۱، عربی ج ۲ ص ۱۰)

معلوم ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رفع یدین کو منسوخ نہیں سمجھتے تھے۔

سرفراز خان صفدر صاحب نے ایک بریلوی کو مخاطب کر کے لکھا ہے: ''مفتی صاحب کیا آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو مسلمان اور عالم دین اور اپنا بزرگ تسلیم کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کی بات تسلیم کرنا پڑے گی اور اگر آپ اُن کی بات تسلیم نہیں کرتے تو آپ کو ان کی عبارت کا صحیح محمل بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ جیسے وہ ہمارے بزرگ ہیں ویسے ہی وہ آپ کے بھی بزرگ ہیں...'' (بابِ جنت بجواب راہِ جنت ص ۴۹)

عرض ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے تسلیم کردہ بزرگ کی بات تو مان لیں۔!

۸: صوفی عبدالحمید سواتی صاحب نے کہا: ''رکوع جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین نہ کرنا زیادہ بہتر اور کرلے تو جائز ہے۔'' (نماز مسنون ص ۳۴۹)

معلوم ہوا صوفی عبدالحمید صاحب رفع یدین کو منسوخ نہیں سمجھتے تھے۔

رہا اُن کا ترکِ رفع یدین کو زیادہ بہتر کہنا تو یہ اُن کی دیوبندیت ہے اور اس پر کوئی صحیح

دلیل وارد نہیں ہے، لہٰذا زیادہ بہتر والی بات مردود ہے۔

۹: اشرفعلی تھانوی صاحب سے پوچھا گیا: ''رفع الیدین فی الصلوٰۃ جائز ہے یا نہیں۔؟''
تو انھوں نے جواب دیا: ''جائز ہے جیسا کہ عدم رفع بھی جائز ہے...''

(امداد الفتاویٰ ج ۱ص ۱۴۸، سوال نمبر ۲۰۸)

معلوم ہوا کہ تھانوی صاحب رفع یدین کو منسوخ نہیں سمجھتے تھے، ورنہ کبھی جواز کا فتویٰ نہ دیتے۔

۱۰: رفع یدین اور ترک رفع یدین کے بارے میں محمد منظور نعمانی دیوبندی نے کہا:
''دونوں طریقوں کے جائز اور ثابت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

(معارف الحدیث ج ۳ص ۲۶۵)

عرض ہے کہ ترک تو ثابت نہیں، لہٰذا جائز کس طرح ہوا؟ تاہم اس عبارت سے ظاہر ہے کہ نعمانی صاحب کے نزدیک رفع یدین منسوخ نہیں ہے۔ احادیثِ صحیحہ، آثارِ صحابہ اور اپنے تسلیم کردہ اکابر کے مذکورہ حوالوں کے مقابلے میں محمد الیاس گھمن صاحب کا رفع یدین کو منسوخ قرار دینا غلط و مردود بھی ہے اور دیوبندی اکابر کے خلاف بغاوت بھی ہے۔

اُمید ہے کہ آلِ دیوبند انھیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ واللہ اعلم (۱۲/ جون ۲۰۱۰ء)

تنبیہ: ابواب (پہلے یا بعد) کے سلسلے میں ہمارے شاگرد سلیم اختر صاحب حفظہ اللہ (کراچی) نے بھی آلِ دیوبند (کے عبدالغفار...) کا بہترین رد لکھا ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سورج کی واپسی؟

سوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمازِ عصر فوت ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کو واپس لوٹایا۔ اس واقعے کی کیا حقیقت ہے؟ (محمد انور، راولپنڈی)

الجواب فضیل بن مرزوق (حسن الحدیث وثقہ الجمہور) نے ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب عن (اُمہ) فاطمۃ بنت الحسین (ثقہ) عن اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا

کی سند سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی آ رہی تھی اور آپ کا سر (سیدنا) علی (رضی اللہ عنہ) کی گود میں تھا، پس انھوں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! کیا تم نے نماز پڑھی ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں!

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**اللھمّ إنه كان في طاعتك و طاعة رسولك فاردد عليه الشمس.**)) اے اللہ! وہ تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا لہٰذا اس کے لئے سورج کو واپس بھیج دے۔

اسماء نے کہا: پس میں نے اسے (سورج کو) دیکھا، غروب ہوا پھر دیکھا کہ غروب ہونے کے بعد (دوبارہ) طلوع ہوا۔ (مشکل الآثار للطحاوی طبعہ جدیدہ ۹۲/۳ ح ۱۰۶۷، طبعہ قدیمہ ۸/۲، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۴/ ۱۴۷۔۱۵۲ ح ۳۹۰، الاباطیل والمناکیر للجورقانی ۱۵۸/۱، الموضوعات لابن الجوزی ۳۵۵/۱)

اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ ابراہیم بن حسن بن حسن بن ابی طالب کی صریح توثیق، زمانۂ تدوینِ حدیث میں سوائے حافظ ابن حبان کے کسی نے بھی نہیں کی اور مجہول و مستور کی توثیق میں ابن حبان متساہل تھے لہٰذا ابراہیم بن حسن مذکور مجہول الحال ہیں اور حافظ ذہبی نے انھیں ضعیف راویوں میں ذکر کیا ہے۔

دیکھئے دیوان الضعفاء والمتروکین (۴۶/۱ ت ۱۶۹)

حافظ ابن تیمیہ نے فرمایا: فضیل بن مرزوق کا ابراہیم (بن حسن بن حسن) سے سماع معلوم نہیں، ابراہیم کا (اپنی ماں) فاطمہ سے اور فاطمہ کا اسماء (بنت عمیس رضی اللہ عنہا) سے سماع معلوم نہیں ہے۔ (منہاج السنہ ۱۹۰/۴)

محمد بن موسیٰ الفطری المدنی (ثقہ وصدوق) نے " **عون بن محمد عن أمه أم جعفر عن أسماء بنت عميس رضي الله عنها** " کی سند سے نقل کیا کہ نبی ﷺ نے صہباء (ایک مقام) میں ظہر کی نماز پڑھی پھر علی علیہ السلام کو کسی ضرورت کے لئے بھیجا پھر وہ آئے تو نبی ﷺ عصر کی نماز پڑھ چکے تھے۔ پھر نبی ﷺ نے اپنا سر (مبارک) علی (رضی اللہ عنہ) کی گود میں رکھا تو انھوں نے سورج کے غروب ہونے تک کوئی حرکت نہیں کی، پھر نبی ﷺ

نے فرمایا:((اللّٰهم إن عبدك عليًّا احتبس بنفسه علٰى نبيك فردّ عليه شرقها))

اے اللہ! تیرے بندے علی (رضی اللہ عنہ) نے اپنے آپ کو تیرے نبی کے لئے روکے رکھا لہٰذا اس کے لئے سورج کو لوٹا دے۔

اسماء (رضی اللہ عنہا) نے کہا: پھر سورج طلوع ہو گیا حتیٰ کہ پہاڑوں اور زمین پر دھوپ چھا گئی۔

پھر علی (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہوئے تو وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی پھر سورج غروب ہو گیا۔

یہ واقعہ غزوۂ خیبر کے موقع پر صہباء (نامی مقام) میں ہوا۔

(شرح مشکل الآثار ۳/۹۴ ح ۱۰۶۸، دوسرا نسخہ ۲/۹، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۴/۱۴۵ ح ۳۸۲)

اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

عون بن محمد اور ام جعفر (ام عون بنت محمد بن جعفر) دونوں کی توثیق نامعلوم ہے یعنی دونوں مجہول الحال تھے۔

حافظ ابن تیمیہ نے کہا: عون اور اس کی ماں (ام جعفر) کی عدالت اور حفظ معلوم نہیں ہے۔

(منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۸۹)

ام جعفر کا اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے سماع بھی نامعلوم ہے۔ (ایضاً ۱۸۹)

تنبیہ: بعض روایات میں (سیدہ) اسماء (رضی اللہ عنہا) سے فاطمہ بنت حسین کے سماع کی تصریح موجود ہے لیکن اُن میں مروان بن معاویہ الفزاری اور شریک بن عبداللہ القاضی (مدلسین) کے عنعنوں (عن سے روایت کرنے / وغیرہما..) کی وجہ سے نظر ہے۔

خلاصۃ التحقیق: سیدنا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے لئے سورج کی واپسی والی روایت اپنی دونوں سندوں کے ساتھ ضعیف یعنی مردود ہے۔

ابن عقدہ رافضی اور ابن مردویہ والی روایات بھی ضعیف و مردود ہیں۔ ابن مردویہ والی روایت میں یزید بن عبدالملک النوفلی (ضعیف) ہے۔ (دیکھئے منہاج السنہ ۴/۱۹۳، من طریق یحییٰ بن یزید بن عبدالملک النوفلی عن ابیہ عن داود بن فراہیج عن عمارہ بن فرو عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

النوفلی کے ضعف کے لئے دیکھئے تقریب التہذیب (۷۷۵۱) اور میزان الاعتدال

(۴/۴۱۴ت ۹۶۵۱ ترجمہ یحییٰ بن یزید بن عبدالملک)
اس موضوع کی مردود روایات کی مفصل تحقیق کے لئے دیکھئے منہاج السنہ (۴/۱۸۵۔۱۹۵)
وما علینا إلا البلاغ
(۱۴/جنوری ۲۰۱۰ء)

کیا معراج والی رات مسجدِ اقصیٰ کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا؟

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ دحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے قیصرِ روم (عیسائی بادشاہ) کے پاس بہ طورِ قاصد اپنے نامۂ مبارک کے ساتھ بھیجا، آپ (رضی اللہ عنہ) وہاں تشریف لے گئے تو ہرقل نے ملکِ شام میں عرب تاجروں کو جمع کیا، جن میں ابوسفیان بن حرب اور اُن کے ساتھی مشرکینِ مکہ بھی تھے پھر اُس (ہرقل) نے اُن سے بہت سے سوالات کئے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہما میں مذکور ہیں۔

ابوسفیان (جو اُس وقت مسلمان نہیں تھے) کی اول سے آخر تک یہی کوشش رہی کہ ہرقل کے سامنے نبی کریم ﷺ کی تحقیر و بے ادبی بیان کریں۔

اسی روایت میں ابوسفیان سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی قسم! میں نے آپ ﷺ کو بادشاہ کی نظروں سے گرانے کے لئے اس خوف سے کوئی جھوٹی بات نہیں کہی تا کہ مجھے جھوٹا قرار نہ دیا جائے اور میری تصدیق نہ کی جائے۔ اُس وقت میرے دل میں خیال آ گیا اور میں نے کہا: بادشاہ سلامت سنئے! میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے آپ جان لیں گے کہ انھوں نے غلط کہا ہے۔ سنئے! ایک دن انھوں نے یہ کہا کہ وہ اس رات مکہ سے چلے اور آپ کی اس مسجد (یعنی بیت المقدس) میں آئے اور پھر صبح سے پہلے واپس مکہ پہنچ گئے۔

میری یہ بات سنتے ہی بیت المقدس کا لاٹ پادری جو شاہ روم کی اس مجلس میں اُس کے پاس عزت سے بیٹھا ہوا تھا فوراً بول اُٹھا: یہ بالکل سچ ہے، مجھے اس رات کا علم ہے۔

قیصر نے (تعجب خیز نظر سے) اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: تجھے کیسے معلوم ہوا؟ اُس نے کہا: میری یہ پکی عادت تھی کہ رات کو سونے سے پہلے مسجد کے تمام دروازے خود بند کرتا تھا

اور اس رات جب میں نے دروازے بند کیے تو ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا۔ میں نے بہت زور لگایا لیکن کواڑ اپنی جگہ سے سرکتا بھی نہیں تھا، پھر میں نے اُسی وقت اپنے ماتحتوں کو آواز دی، وہ آئے اور ہم سب نے زور لگایا، لیکن ناکام رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکانا چاہتے ہیں، جو اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کرتا۔

میں نے کارپینٹر (بڑھئی) بلوائے تو انھوں نے دیکھ کر کہا: اس پر عمارت کا کچھ حصہ اور بڑا پتھر گر گیا ہے، ہم صبح تک اسے ہلا نہیں سکتے، لہٰذا صبح دیکھیں گے کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ دروازہ رات کو کھلا رہا پھر میں صبح سویرے اس دروازے کے پاس گیا تو دیکھا کہ اس کے پاس کونے میں جو پتھریلی چٹان تھی اُس میں سوراخ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رات کو کسی نے کوئی جانور باندھا تھا، اس کا اثر اور نشان موجود تھا۔ میں سمجھ گیا اور میں نے اسی وقت اپنے ساتھیوں سے کہا: آج کی رات ہماری مسجد کسی نبی کے لئے کھلی رکھی گئی تھی اور انھوں نے اس میں ضرور نماز پڑھی ہے۔

یہ روایت تفسیر ابن کثیر (مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ ج ۳ ص ۲۱۵۔ ۲۱۶) میں بحوالہ دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصبہانی مذکور ہے۔ کیا یہ روایت اُصولِ حدیث اور اسماء الرجال کی رُو سے صحیح اور قابلِ حجت ہے؟ تحقیق کر کے جواب عطا فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً (ایک سائل)

الجواب یہ روایت حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حافظ ابونعیم الاصبہانی رحمہ اللہ کی کتاب دلائل النبوۃ سے نامکمل سند کے ساتھ نقل کی ہے۔

(دیکھئے تفسیر ابن کثیر مع تحقیق عبدالرزاق المھدی ج ۴ ص ۱۱۵)

لیکن ہمیں یہ روایت دلائل النبوۃ کے مطبوعہ نسخے یا دوسری کسی کتاب میں مکمل سند کے ساتھ نہیں ملی، لہٰذا حافظ ابن کثیر کی ذکر کردہ سند کی تحقیق درج ذیل ہے:

یہ روایت چار وجہ سے ضعیف (بلکہ سخت ضعیف) ہے:

۱: اس کا بنیادی راوی محمد بن عمر بن واقد الاسلمی جمہور محدثین کے نزدیک مجروح ہے۔ حافظ ہیثمی نے فرمایا: " ضعفه الجمهور " جمہور نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۳ ص ۲۵۵)

مشہور صوفی حافظ ابن الملقن نے فرمایا: "و قد ضعفه الجمهور و نسبه إلى الوضع: الرازي و النسائي" اسے جمہور نے ضعیف کہا اور (ابو حاتم) الرازی اور نسائی نے وضاع (احادیث گھڑنے والا) قرار دیا۔ (البدر المنیر ج ۵ ص ۳۲۴)

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: "متروك الحديث" وہ حدیث میں متروک ہے۔

(کتاب الضعفاء بتحقیقی: ۳۴۴)

امام بخاری نے مزید فرمایا: "كذّبه أحمد" احمد (بن حنبل) نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے۔

(الکامل لابن عدی ج ۶ ص ۲۲۴۵، دوسرا نسخہ ج ۷ ص ۴۸۱ وسندہ صحیح)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: "كان الواقدي يقلّب الأحاديث، يلقي حديث ابن أخي الزهري على معمر و نحو هذا." واقدی احادیث کو الٹ پلٹ کر دیتا تھا، وہ ابن اخی الزہری کی حدیث کو معمر کے ذمے ڈال دیتا تھا اور اسی طرح کی حرکتیں کرتا تھا۔

امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "كما وصف (أحمد) و أشد لأنه عندي ممن يضع الحديث." جس طرح انھوں (احمد بن حنبل) نے فرمایا وہی بات بات بلکہ اُس سے سخت ہے کیونکہ وہ میرے نزدیک حدیث گھڑتا تھا۔

(کتاب الجرح والتعدیل ج ۸ ص ۲۱ وسندہ صحیح)

امام محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: "كتب الواقدي كذب" واقدی کی کتابیں جھوٹ (کا پلندا) ہیں۔ (کتاب الجرح والتعدیل ج ۸ ص ۲۱ وسندہ صحیح)

امام نسائی رحمہ اللہ نے فرمایا: "و الكذابون المعروفون بوضع الحديث على رسول الله ﷺ أربعة: ابن أبي يحيى بالمدينة و الواقدي ببغداد و مقاتل ابن سليمان بخراسان و محمد بن سعيد بالشام يعرف بالمصلوب" رسول اللہ ﷺ کے بارے میں حدیثیں گھڑنے والے مشہور جھوٹے چار ہیں:

(ابراہیم بن محمد) بن ابی یحییٰ مدینے میں، واقدی (محمد بن عمر بن واقد الاسلمی) بغداد میں، مقاتل بن سلیمان خراسان میں اور محمد بن سعید شام میں جسے مصلوب کہا جاتا ہے۔

(آخر کتاب الضعفاء والمتر وکین ص ۳۱۰، دوسرا نسخہ ص ۲۶۵)

اس شدید جرح اور جمہور کی تضعیف کے مقابلے میں واقدی کے لئے بعض علماء کی توثیق مردود اور غلط ہے۔

تنبیہ (۱): سیر و مغازی ہو یا تاریخ و حدیث، جس سند میں بھی واقدی آ جائے وہ سخت ضعیف، مردود اور موضوع ہوتی ہے۔

تنبیہ (۲): جس راوی کی بعض نے توثیق کی ہو، لیکن جمہور نے جرح کی ہو اور تطبیق ممکن نہ ہو تو اُس کی منفرد روایت ضعیف و مردود ہوتی ہے۔

۲: اس روایت کا ایک راوی عمر بن عبداللہ مولیٰ غفرہ جمہور کے نزدیک ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا: "**ضعیف و کان کثیر الإرسال**" ضعیف ہے اور وہ کثرت سے مرسل روایتیں بیان کرتا تھا۔ (تقریب التہذیب: ۴۹۳۴)

حافظ ذہبی نے فرمایا: "**عمر ضعیف**" (تلخیص المستدرک ج ۱ ص ۴۹۵ ح ۱۸۲۰)

۳: محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ تابعی تھے اور یہ روایت مرسل ہے، اگر ان تک یہ سند صحیح بھی ہوتی تو مرسل (یعنی منقطع) ہونے کی وجہ سے ضعیف تھی، کیونکہ انھوں نے (بشرطِ صحت) صحابی کا ذکر نہیں کیا اور راجح تحقیق میں مرسل روایت ضعیف ہوتی ہے۔

دیکھئے مقدمہ صحیح مسلم (ص ۲۰ طبع دارالسلام) اور العلل الصغیر للترمذی (ص ۸۹۶۔۸۹۷ طبع دارالسلام مع سنن الترمذی)

۴: امام ابونعیم سے لے کر واقدی تک سند نامعلوم ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اس میں کوئی مجروح یا مجہول راوی پوشیدہ ہو۔ واللہ اعلم

خلاصۃ التحقیق یہ ہے کہ روایت مسئولہ و مذکورہ بلحاظِ سند سخت ضعیف و مردود ہے، لہٰذا جرح کے بغیر اسے بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ **و ما علینا إلا البلاغ** (۲۶/ جون ۲۰۱۰ء)

کیا کسی صحابی کے کتے کا نام راشد تھا؟

سوال سرفراز صفدر دیوبندی نے کہا ہے کہ ''اگر کسی صحابی کی نام غلط ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدل دیتے تھے دیہات سے ایک موٹا تازہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ بھائی تیرا نام کیا ہے؟ کہنے لگا میرا نام ظالم ہے اور میرے کتے کا نام راشد ہے۔ اور راشد کا معنیٰ ہے ہدایت یافتہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو بندہ ہو کے بھی ظالم ہے اور وہ کتا ہو کے راشد ہے۔ فرمایا میں نے نام بدلنا ہے آج کے بعد تیرے کتے کا نام ظالم ہے اور تیرا نام راشد ہے۔ اپنے علاقے میں جا کر لوگوں کو بتا دینا۔ منیب الطبع اور سلیم الطبع شخص تھا کوئی قیل وقال نہیں کی کہنے لگا۔ حضرت ٹھیک ہے اور اگر اَڑنا چاہتا تو کہہ سکتا تھا کہ حضرت میرا کوئی اور نام رکھ دو کتے کا نام تو میرا نہ رکھو اور بعضے اَڑ بھی جاتے تھے جیسے...''

(ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن ج ۳ ص ۱۶۲۔۱۶۳)

کیا یہ صحیح ہے کہ صحابی کے کتے کا نام راشد تھا؟ تحقیق کر کے جواب دیں۔

جزاکم اللہ خیراً (احمد بن فضل مالک، حسن زئی)

الجواب سرفراز خان صفدر صاحب نے مذکورہ کتاب میں اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا، لیکن یہ روایت امام ابونعیم الاصبہانی کی کتاب: دلائل النبوۃ (۱/۳۵ ح ۶۸) اور معرفۃ الصحابۃ (لابی نعیم ج ۲ ص ۱۱۲۰ ح ۲۸۱۴) میں درج ذیل سند کے ساتھ مطولاً و مختصراً موجود ہے:

" حدثناه عمر بن محمد بن جعفر: ثنا إبراهيم بن السندي: ثنا النضر بن سلمة: ثنا محمد بن الحسن المخزومي: حدثني يحيى بن سليمان عن حكيم بن عطاء الظفري من بني سليم من ولد راشد بن عبد ربه عن أبيه عن

جده عن راشد بن عبد ربه ... " (اللفظ لمعرفة الصحابة)

اسے ابونعیم کے حوالے سے حافظ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ/نسخہ محققہ ۳/۱۷۷۔۱۷۸) اور حافظ ابن حجر العسقلانی (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۱/۴۹۵ ت ۲۵۱۷، دوسرا نسخہ ۲/۱۴۰ ت ۲۵۱۲) نے نقل کیا ہے۔

اس روایت کی تحقیق درج ذیل ہے:

۱۔۳: روایتِ مذکورہ کی سند میں حکیم بن عطاء الظفری، اس کا باپ عطاء الظفری اور دادا تینوں مجہول ہیں۔

۴: یحییٰ بن سلیمان غیر متعین ہے۔

۵: محمد بن الحسن المخزومی کو دلائل النبوۃ اور البدایہ والنہایہ میں غلطی سے محمد بن سلمہ المخزومی لکھا گیا ہے، جبکہ معرفۃ الصحابہ لابی نعیم میں محمد بن الحسن المخزومی لکھا ہوا ہے اور حافظ ابن حجر نے کہا: " روى أبو نعيم من طريق محمد بن الحسن بن زبالة (صح) عن حكيم بن عطاء السلمي ... " (الاصابہ ۱/۴۹۵)

محمد بن الحسن بن زبالہ المخزومی القرشی المدنی پر محدثین کرام نے شدید جرحیں کی ہیں مثلاً امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: " وكان كذابًا ولم يكن بشيئ وهو مدني " اور وہ کذاب (جھوٹا) تھا، وہ کچھ چیز نہیں اور وہ مدنی ہے۔ (تاریخ ابن معین، روایۃ الدوری: ۱۰۶۰)

اور فرمایا: " ليس بثقة ، كان يسرق الحديث " وہ ثقہ نہیں، وہ حدیث چوری کرتا تھا۔

(ایضاً: ۷۹۹)

اور فرمایا: " والله ما هو بثقة حدّث عدو الله عن مالك ... "

اللہ کی قسم! وہ ثقہ نہیں، اللہ کے (اس) دشمن نے (امام) مالک سے حدیث بیان کی...

(کتاب الجرح والتعدیل ۷/۲۲۸ وسندہ صحیح)

امام دارقطنی نے فرمایا: " متروك " (سوالات البرقانی: ۴۲۷)

حافظ ابن حجر نے کہا: " كذبوه " یعنی محدثین نے اسے کذاب قرار دیا۔

(تقریب التہذیب: ۵۸۱۵)

۶: نضر بن سلمہ غیر متعین ہے اور اس طبقے میں نضر بن سلمہ: شاذان المروزی کذاب راوی بھی ہے۔

۷: عمر بن محمد بن جعفر کی توثیق مطلوب ہے۔

خلاصۃ التحقیق: سرفراز خان صفدر صاحب کی بیان کردہ روایت موضوع ہے، لہٰذا اسے بغیر ذکرِ جرح کے بیان کرنا حلال نہیں ہے۔

تعجب ہے ان لوگوں پر جو عوام کے سامنے "شیخ الحدیث" بنے بیٹھے ہوتے ہیں اور ضعیف، مردود اور موضوع بلکہ بے اصل و بے سند روایات بغیر کسی خوف کے دھڑلے سے بیان کرتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھ سے ایسی حدیث بیان کی، جس کا جھوٹ ہونا معلوم ہو تو وہ شخص جھوٹوں میں سے ایک (یعنی جھوٹا) ہے۔

(صحیح مسلم:۱، باب۱)

کیا ان لوگوں کو اللہ کی پکڑ کا کوئی ڈر نہیں ہے؟! (۵/ دسمبر ۲۰۱۰ء)

متفرق مسائل

راقم الحروف کی طرف منسوب کتابیں اور شروط ثلاثہ

سوال آج کل اردو مارکیٹ میں تفسیر ابن کثیر کی تحقیق کے نام سے کئی کتابیں موجود ہیں، جن میں سے بعض پر آپ کا نام بطورِ تحقیق یا بطورِ محقق لکھا ہوا ہے۔ مثلاً:

۱: مکتبہ اسلامیہ (فیصل آباد/ لاہور) کی شائع کردہ تفسیر ابن کثیر

۲: مکتبہ قدوسیہ (لاہور) کی طبع شدہ تفسیر ابن کثیر

۳: فقہ الحدیث پبلیکیشنز (محترم عمران ایوب لاہوری صاحب) کی مطبوع تفسیر ابن کثیر

ان کے علاوہ بھی درج ذیل کتابیں ہیں:

۱: حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتاب ''صلوٰۃ الرسول'' ﷺ (تسہیل الوصول)

۲: ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی کتاب ''نماز نبوی''

۳: الشیخ عمرو بن عبدالمنعم کی کتاب ''عبادات میں بدعات اور سنتِ نبوی سے ان کا رد''

۴: ''نبی کریم ﷺ کے لیل ونہار'' (الانوار للبغوی کا ترجمہ وتحقیق)

کیا ان سب کتابوں پر آپ کی ہی تحقیق ہے، نیز کیا یہ تحقیقات آپ کے نزدیک معتبر ہیں؟ اگر نہیں تو براہِ مہربانی وضاحت فرمائیں، کیونکہ بعض لوگ آپ کی تحقیق کے بارے میں غلط و باطل پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ جزاکم اللہ خیراً (حافظ ندیم ظہیر)

الجواب راقم الحروف نے بار بار یہ اعلان کیا ہے کہ ''میری صرف وہی کتاب معتبر ہے، جسے مکتبۃ الحدیث حضرو یا مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد/ لاہور سے شائع کیا گیا ہے یا اُس کتاب کے آخر میں میرے دستخط ہیں۔''

مثلاً دیکھئے مقدمۃ القول المتین فی الجہر بالتامین (ص۱۲، دوسرا نسخہ ص۱۹، نوشتہ ۲۲/ دسمبر ۲۰۰۳ء) ماہنامہ الحدیث حضرو (شمارہ ۲۷ ص ۶۰، نوشتہ ۱۵/ جون ۲۰۰۶ء، شمارہ ۶۸ ص۱۰، نوشتہ ۸/ نومبر ۲۰۰۹ء)

میں نے درج ذیل اعلان بھی لکھ کر شائع کیا تھا:

''اس واضح اعلان کے بعد بعض الناس کا راقم الحروف کے خلاف نماز نبوی نامی کتاب یا صلوٰۃ الرسول کی تخریج کے حوالے پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟'' (الحدیث:۶۸ ص ۱۱)

بطورِ وضاحت اور بطورِ تصریح عرض ہے کہ مصنف کے پاس یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتاب کے ہر ایڈیشن کی نظر ثانی کرے اور اگر مناسب سمجھے تو بعض مقامات کی اصلاح بھی کرے۔ اسے ''حق التعدیل'' کہا جاتا ہے اور میری تمام کتابوں و جملہ تحریرات میں حق التعدیل کا اختیار صرف مجھے ہی حاصل ہے، لہٰذا میری اجازت، نظر ثانی اور اصلاح کے بغیر کتاب یا تحریر شائع کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

تمام تحریروں اور کتابوں میں صرف وہی معتبر ہے جس کا آخری ترین ایڈیشن مکتبۃ الحدیث حضرو اور محترم محمد سرور عاصم حفظہ اللہ کے مکتبہ اسلامیہ (فیصل آباد/ لاہور) سے شائع کیا گیا ہے، یا اس پر میرے دستخط موجود ہیں۔

قاضی عیاض المالکی کی ایک عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اپنی کتاب الموطأ کی نظر ثانی فرماتے رہے۔ (دیکھئے ترتیب المدارک ۲/۳۷، اور مقدمۃ الموطأ روایۃ ابی مصعب الزہری ۱/۳۵ وخالفہ المحققان واختلاف نسخ الموطأ تدل علی التغیر فی روایۃ الموطأ)

فرقہ حنفیہ کے محدث شاہ عبدالعزیز دہلوی بن شاہ ولی اللہ الدہلوی نے لکھا ہے:

''اور جب تک امام مالکؒ زندہ رہے موطأ کو مسودہ کرتے رہے، اس وجہ سے اس میں نسخ بہت ہوا ہے اور ہر نسخہ کی ترتیب جدا ہے۔'' (بستان المحدثین ص ۲۶)

سید مشتاق علی شاہ دیوبندی نے سرفراز خان صفدر دیوبندی سے نقل کیا:

''مصنف کو اپنی زندگی میں حق ہوتا ہے کہ وہ کتاب میں جیسے چاہے، ردو بدل اور کمی بیشی کرے اور ہمیشہ اس کی آخری بات کا اعتبار ہوتا ہے۔''

(ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ جلد ۲۱ شمارہ نمبر ۱ ص ۲۱، جنوری ۲۰۱۰ء)

سرفراز خان صفدر کے بیٹے عبدالقدوس قارن دیوبندی نے لکھا ہے:

"یہ بات تو اہلِ علم جانتے ہیں کہ کسی کتاب پر بحث وطعن کے لیے اس کے قریبی ایڈیشن کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ پچھلے ایڈیشن میں اغلاط یا سقم سے آگاہی کے بعد مؤلف اس کی اصلاح کر لیتا ہے۔ اور اس کے ہاں معتبر جدید ایڈیشن ہی ہوتا ہے البتہ اگر کسی مصنف نے نے ایسی بات لکھ دی ہو جس پر معافی کا اعلان کرنا ضروری ہو تو اس بات کو نکال دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ معافی کے اعلان کی ضرورت ہوتی ہے..." (مجذوبانہ واویلا ص ۱۸۷۔۱۸۸)

نیز دیکھئے سرفراز خان صفدر کی دو کتابیں: عباراتِ اکابر حصہ اول (ص ۱۰۳۔۱۰۴)

اور "عمدۃ الاثاث فی حکم الطلقات الثلاث (ص ۱۱۴)

اب سوال میں مذکورہ کتابوں کے بارے میں مختصر جواب درج ذیل ہے:

۱: مکتبہ اسلامیہ (فیصل آباد/ لاہور) کی طبع شدہ تفسیر ابن کثیر (تحقیقی) واقعی میری تحقیق ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

اسی طرح میرے نام سے مکتبہ اسلامیہ مذکورہ کی تمام شائع کردہ کتابیں میری ہی کتابیں ہیں اور میں ان کا ذمہ دار ہوں۔

۲: مکتبہ قدوسیہ کی شائع کردہ تفسیر ابن کثیر سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

۳: فقہ الحدیث کی مطبوع تفسیر ابن کثیر سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

۴: تسہیل الوصول تخریج صلوٰۃ الرسول کی مجھ سے نظر ثانی نہیں کروائی گئی اور نہ کسی ایڈیشن میں میرے دستخط لئے گئے ہیں، لہٰذا میں اس کتاب کا ذمہ دار نہیں۔

۵: ڈاکٹر شفیق الرحمٰن صاحب کی نماز نبوی کی تحقیق کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

۶: "نبی کریم ﷺ کے لیل ونہار" نامی کتاب کے ہر ایڈیشن کے آخر میں اگر میرے دستخط نہ ہوں تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ یہی معاملہ "عبادات میں بدعات اور سنتِ نبوی سے ان کارد" کتاب کا ہے۔

تمام لوگوں مثلاً آلِ بریلی وآلِ دیوبند کی "خدمت" میں کئی بار عرض ہے کہ میں صرف تین قسم کی کتابوں کا ہی ذمہ دار ہوں:

۱: جو مکتبۃ الحدیث حضرو سے شائع شدہ ہیں۔

۲: جن کے آخر میں ہر ایڈیشن کے لحاظ سے میرے دستخط ہیں۔

۳: جو کتابیں محترم محمد سرور عاصم حفظہ اللہ کے مکتبہ اسلامیہ (فیصل آباد/ لاہور) سے شائع شدہ ہیں۔

تنبیہ: ان شروط ثلاثہ کے علاوہ کسی کتاب یا تحریر کا میں ذمہ دار نہیں، لہٰذا رد برائے رد اور راقم الحروف کے مخالفین کی، ان شرائط مذکورہ کے خلاف ہر کوشش مردود ہے۔

وما علینا إلا البلاغ (۱۵/فروری ۲۰۱۲ء)

کیا مباہلہ کرنا جائز ہے؟

سوال کیا صحیح العقیدہ مسلمانوں کا اہلِ بدعت اور گمراہوں سے مباہلہ کرنا جائز ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴾

پھر آپ کے پاس علم آ جانے کے بعد جو شخص جھگڑا کرے تو کہہ دیں: آؤ! ہم اپنے بیٹے بلائیں اور تم اپنے، ہم اپنی عورتیں بلائیں اور تم اپنی، اور ہم اپنے اشخاص بلائیں اور تم اپنے اشخاص بلاؤ پھر ہم مباہلہ کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ (آل عمران:۶۱)

اس آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران سے دو عیسائی: عاقب اور سید آئے تا کہ آپ (ﷺ) سے مباہلہ کریں۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: مباہلہ نہ کرنا، اللہ کی قسم! اگر وہ نبی ہوا تو ہم مباہلے کے بعد کبھی فلاح میں نہیں رہیں گے اور نہ ہماری نسل باقی رہے گی۔ (دیکھئے صحیح بخاری ۴۳۸۰ ملخصاً)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر وہ لوگ نبی ﷺ سے مباہلہ کرنے کے لئے باہر

نکلتے تو واپسی پر اپنے گھر والوں اور مال میں سے کچھ بھی نہ پاتے یعنی سب کچھ تباہ ہو جاتا۔
(تفسیر عبدالرزاق ۱/۱۲۹ ح ۴۱۱ وسندہ صحیح تفسیر ابن جریر الطبری ج ۳ ص ۲۱۲ وسندہ صحیح)

نیز دیکھئے مسند الامام احمد (۱/۲۴۸ ح ۲۲۲۵)

مشہور ثقہ تابعی قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: مجھے پتا چلا ہے کہ نبی ﷺ اہل نجران (کے عیسائیوں) سے مباہلہ کرنے کے لئے نکلے پھر جب انھوں (عیسائیوں) نے آپ کو دیکھا تو ڈر گئے پھر وہ (عیسائی مباہلے کے بغیر ہی) واپس چلے گئے۔
(تفسیر عبدالرزاق ۱/۱۲۹ ح ۴۰۹ وسندہ صحیح تفسیر طبری ۳/۲۱۲ وسندہ صحیح)

اس آیت کی تشریح میں یہ بھی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (سیدنا) علی (بن ابی طالب رضی اللہ عنہ) (سیدہ) فاطمہ (سیدنا) حسن اور (سیدنا) حسین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو بلایا اور فرمایا: ((اللهم هؤلاء أهلي .)) اے اللہ! یہ میرے اہل ہیں۔
(صحیح مسلم: ۲۴۰۴، دارالسلام: ۶۲۲۰)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ اگر ضرورتِ شرعیہ ہو تو صحیح العقیدہ (اور قابلِ اعتماد، صالح) مسلمانوں کا کفار کے خلاف مباہلہ کرنا جائز ہے۔

مباہلہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دو فریقوں کا باہم جمع ہو کر اللہ سے دعا کرنا کہ اے اللہ! جو ناحق پر اور جھوٹا ہے، اُسے ہلاک کر دے، تباہ و برباد کر دے، اُس پر لعنت بھیج۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾
اللہ تو یہ ارادہ کرتا ہے کہ اے اہل بیت! تم سے پلیدی کو دُور کر دے۔ (الاحزاب: ۳۳)

اس کی تشریح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نزلت في نساء النبي ﷺ خاصة" یہ (آیت) خاص طور پر نبی ﷺ کی بیویوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس روایت کے راوی مشہور ثقہ تابعی عکرمہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "من شاء باهلته: أنها نزلت في أزواج النبي ﷺ" جو چاہے میں مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ (آیت) نبی ﷺ کی ازواج (بیویوں) کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن ابی حاتم بحوالہ تفسیر ابن کثیر

۱۶۹/۵۔۱۷۰، وسندہ حسن، دوسرا نسخہ ۱۱/۱۵۳، تاریخ دمشق لابن عساکر ۳/۷۴، ۱۱۱، وسندہ حسن، ترجمۃ ام المومنین ام حبیبہ رملۃ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا، قلت: و فی تاریخ دمشق "زید النحوی" والصواب: یزید النحوی)

اس اثر سے معلوم ہوا کہ اگر شرعی ضرورت ہو تو صحیح العقیدہ اور صالح و قابلِ اعتماد مسلمان یا مسلمانوں کا اہلِ بدعت یا گمراہوں اور کفار کے خلاف مباہلہ کرنا جائز ہے لیکن یاد رہے کہ صرف نبی کا مباہلہ ایسا ہے کہ مقابلے میں آنے والے ہر شخص کی تباہی و بربادی یقینی ہے، جبکہ اُمتیوں کے مباہلے میں یہ بات نہیں ہوتی لہٰذا بہتر ہے کہ مباہلہ نہ کیا جائے۔

محدث برہان الدین البقاعی نے لکھا ہے: ہمارے استاذ حافظ ابن حجر العسقلانی کا ابن الامین نامی ایک شخص سے ابن عربی کے بارے میں مباہلہ ہوا۔ اس آدمی نے کہا: اے اللہ! اگر ابن عربی گمراہی پر ہے تو تُو مجھ پر لعنت فرما۔ حافظ ابن حجر نے کہا: اے اللہ! اگر ابن عربی ہدایت پر ہے تو تُو مجھ پر لعنت فرما۔ وہ شخص اس مباہلے کے چند مہینے بعد رات کو اندھا ہو کر مر گیا۔ یہ واقعہ ۷۹۷ھ کو ذوالقعدہ میں ہوا تھا اور مباہلہ (تقریباً دو مہینے پہلے) رمضان میں ہوا تھا۔ (تنبیہ الغبی ص ۱۳۶۔۱۳۷، علمی مقالات ج ۲ ص ۴۷۰۔۴۷۱)

خلاصۃ التحقیق: حتی الوسع مباہلہ سے گریز کرنا چاہئے اور فقہی و اجتہادی مسائل کی وجہ سے مسلمانوں کا آپس میں مباہلہ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ دلائل کے ساتھ فریقِ مخالف کو سمجھانا چاہئے اور اگر اشد ضرورت ہو تو پھر کفر و اسلام کے اختلاف اور صریح و اجماعی اور سلف صالحین کے متفقہ عقیدے پر صحیح العقیدہ نیک سمجھدار اشخاص کٹر مبتدعین اور گمراہوں کے خلاف مباہلہ کر سکتے ہیں لیکن یاد رہے کہ قطعی نتیجہ صرف نبی کے مباہلے کا ہی تھا، باقی امتیوں کے مباہلے کا نتیجہ اور انجام یقینی معلوم نہیں ہے۔ واللہ اعلم (۸/ دسمبر ۲۰۰۹ء)

خطبہ سے پہلے خطیب کا سلام کہنا

سوال اکثر یہ بات سننے اور دیکھنے کا مشاہدہ ہوا ہے کہ اہلِ حدیث علماء خطبہ جمعۃ المبارک اور اصلاحی پروگرام میں منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے سے پہلے اپنے سامنے بیٹھے

لوگوں کو "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہتے ہیں۔

ہمارا ایک اہلحدیث بھائی کہتا ہے کہ خطیب حضرات کو منبر پر کھڑا ہو کر تقریر شروع کرنے سے پہلے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہنا بدعت ہے۔ (آفتاب احمد سلفی، دولت نگر)

الجواب کسی صحیح حدیث سے یہ بات ثابت نہیں کہ خطیب منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو السلام علیکم کہے۔ (دیکھئے میری کتاب: تحقیقی مقالات ج ۳ ص ۱۵۷، فقرہ: ۶)

میرے علم کے مطابق ثقہ تابعی امام عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے ثابت ہے کہ وہ جب منبر پر چڑھ جاتے تو لوگوں کو سلام کہتے اور لوگ اُن کا جواب دیتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۱۱۴ ح ۵۱۹۷ وسندہ حسن)

خیر القرون کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ خطبہ سے پہلے خطیب کا لوگوں کو سلام کہنا جائز ہے، لہٰذا اسے بدعت کہنا غلط ہے اور اگر اس حالت میں سلام نہ کہے تو بھی بالکل صحیح ہے۔

خطبے میں درودِ ابراہیمی پڑھنا؟

سوال علماءِ اہلحدیث منبر پر چڑھ کر تقریر شروع کرتے وقت درودِ ابراہیمی بھی پڑھتے ہیں، اُوپر کے مسئلہ کو بدعت کہنے والا بھائی نعوذ باللہ علماء کا تقریر شروع کرتے وقت "درودِ ابراہیمی" پڑھنے کو بھی بدعت کہتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارا یہ اعتراض کرنے والا بھائی "السلام علیکم" اور "درود ابراہیمی" کا نعوذ باللہ منکر نہیں ہے وہ صرف مندرجہ بالا حالت میں السلام علیکم اور درود ابراہیمی پڑھنے کو بدعت کہتا ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس کا قرآن وسنت کی روشنی میں جلد از جلد جواب ارسال فرمادیں، کیا اس بات کی قرآن وسنت میں کوئی دلیل ہے یا اجماع ہے؟؟؟

(آفتاب احمد سلفی، دولت نگر

الجواب خطبے میں نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنا سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ (دیکھئے زوائد عبداللہ بن احمد علی مسند الامام احمد ۱/۱۰۶ ح ۸۳۷ وسندہ صحیح، اور فضائل درود وسلام کا مقدمہ ص ۲۸ فقرہ: ۱۸)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے تھے اور خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع کا حکم حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھئے سنن ابی داود (۴۶۰۷) سنن الترمذی (۲۶۷۶) اور اضواء المصابیح (ح ۱۶۵، الحدیث حضرو: ۵۳ ص ۵۔۸)

معلوم ہوا کہ شخصِ مذکور کا حالتِ خطبہ والے درود کو بدعت کہنا غلط ہے۔ (۶/ دسمبر ۲۰۱۰ء)

ایک دوسرے کو سلام کہنا

سوال قرآن مجید میں الفاظ ''سلامٌ علیکم ''ہیں۔

اسی طرح صحیح ابن حبان میں بھی ہیں، جیسا کہ امام دمیاطی نے ''المتجر الرابح'' میں نقل فرمایا۔ سوال یہ ہے کہ اکثر لوگ ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت ''سلامُ علیکم'' کہتے ہیں۔ جب کہ سلام کے حوالے سے اکثر احادیث میں ''السلامُ علیکم'' کے الفاظ ہیں جیسا کہ امام نووی نے ریاض الصالحین میں اکثر ایسی احادیث کو جمع کر دیا ہے۔

کیا ''سلامُ علیکم'' کہنا بھی جائز ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، سمندر کٹھ ایبٹ آباد)

الجواب السلامُ علیکم کہنا زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔ (مثلاً دیکھئے صحیح بخاری: ۶۲۲۷، صحیح مسلم: ۲۸۴۱/۱۶۳ے)

سلامٌ علیکم بھی صحیح ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

(دیکھئے سورۃ الانعام: ۵۴، الاعراف: ۴۶، الزمر: ۷۳)

اسی طرح صرف سلامٌ اور سلاماً بھی آیا ہے۔ (مثلاً دیکھئے سورۃ ھود: ۶۹)

لیکن کسی آیت یا حدیث میں سلامُ علیکم نہیں آیا اور نہ ایسے الفاظ سلف صالحین سے آئے ہیں، لہٰذا سلامُ علیکم (یعنی م کی ایک پیش کے ساتھ) نہیں بلکہ ''السلام علیکم'' کہنا

چاہئے جو کہ مسنون ہے۔ یاد رہے کہ سلام کہنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا ضروری (فرض وواجب) ہے، لہٰذا سلام کہنے والے کا جواب بھی صحیح اور بہتر طریقے سے دینا چاہئے۔ مثلاً السلام علیکم کا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ یا وعلیکم السلام کے الفاظ سے جواب دینا چاہئے۔ جولوگ سلام کے جواب میں صرف سر ہلا کر یا مسنون الفاظ کے بغیر جواب دیتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں، بلکہ گناہ کے مرتکب ہیں۔

فائدہ: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں۔

(دیکھئے سنن ابی داود: ۵۱۹۵ وسندہ حسن، سنن الترمذی: ۲۶۸۹ وقال: حسن صحیح غریب) [۲۰/نومبر ۲۰۱۰ء]

اوجھڑی حلال ہے

سوال اوجھڑی بالعموم اور قربانی کے جانور کی اوجھڑی بالخصوص حلال ہے یا حرام؟ وضاحت مطلوب ہے۔ (ارشاد اللہ امان، شیخوپورہ شہر)

الجواب حلال جانور مثلاً گائے، بھینس، اونٹ، بکری اور بھیڑ وغیرہ کو شرائطِ شرعیہ کے ساتھ ذبح کیا جائے تو اُس کی اوجھڑی حلال ہے، چاہے قربانی ہو یا عام ذبیحہ ہو اور اسے حرام کہنا غلط ہے۔

قربانی کے جانوروں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ پھر جب وہ پشت لگا دیں (یعنی ذبح ہو جائیں) تو اُن میں سے کھاؤ، اور امیر و غریب کو کھلاؤ۔ (الحج: ۳۶)

اس آیت کے عموم سے ثابت ہے کہ ذبح شدہ جانور کا گوشت، اوجھڑی، کلیجی اور دل وغیرہ حلال ہیں اور یہاں بطور فائدہ عرض ہے کہ جس چیز کی حُرمت قرآن، حدیث اور اجماع یا آثارِ سلف صالحین سے ثابت ہے تو وہ چیز اس آیت کے عموم سے خارج ہے۔ مثلاً:

۱: وہ چیز جسے عام اہلِ ایمان کی طبیعتیں خبیث اور گندی سمجھیں تو آیت:

﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ اور آپ (ﷺ) ان لوگوں پر خبیث چیزیں حرام قرار

دیتے ہیں۔(الاعراف:۱۵۷) کی رو سے مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہیں۔

اوجھڑی کا خبیث ہونا نہ تو آثارِ سلف صالحین سے ثابت ہے اور نہ عام اہل ایمان اُس کو گندا یا مکروہ وناپسندیدہ سمجھتے تھے۔

۲: وہ چیز جو چوری یا غصب کر کے حاصل کر لی جائے۔مثلاً کسی شخص کی بکری چوری کر کے ذبح کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے اس کا گوشت حلال نہیں ہے، اِلا یہ کہ اصل مالک اجازت دے دے۔

۳: وہ حلال جانور جس کی خوراک ہی گندگی نجاست ہو(یعنی جلالہ جانور) اُس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے۔

۴: زندہ جانور کا کٹا ہوا گوشت حرام ہے۔وغیرہ

اب موضوع کی مناسبت سے چند فوائد پیشِ خدمت ہیں:

۱: مفسر قرآن امام مجاہد تابعی رحمہ اللہ سے روایت ہے: ''أن النبي ﷺ كره من الشاة سبعًا :المثانة والمرارة والغدّة والذكر والحياء والأنثيين .''

بے شک نبی ﷺ بکری کی سات چیزوں کو مکروہ سمجھتے تھے: مثانہ، پِتا، غدّہ (گوشت کی گرہ جو کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے ابھر آتی ہے) آلۂ تناسل، کھر اور سم والے جانوروں کی فرج (شرمگاہ) اور دونوں خصیے۔(کتاب المراسیل لابی داود: ۴۶۰، مصنف عبدالرزاق ۴/ ۵۳۵ ح ۸۷۷۱، دوسرا نسخہ: ۸۸۰۲، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/ ۷)

یہ روایت دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: واصل بن ابی جمیل جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔مثلاً امام دارقطنی نے فرمایا: ''وواصل هذا ضعيف'' اور یہ واصل ضعیف ہے۔(سنن دارقطنی ۳/ ۷۷ ح ۳۰۵۹)

دوم: روایت مرسل (یعنی منقطع) ہے اور مرسل جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے۔روایتِ مذکورہ کو عمر بن موسیٰ بن وجیہ نے واصل بن ابی جمیل عن مجاہد عن ابن عباس کی سند سے مرفوعاً بیان کیا ہے لیکن عمر بن موسیٰ بن وجیہ کذاب منکر الحدیث راوی تھا۔

(دیکھئے لسان المیزان ۴/۳۳۲۔۳۳۳، دوسرا نسخہ ۵/۲۴۱)

لہٰذا یہ روایت موضوع ہے۔

المعجم الاوسط للطبرانی میں اس روایت کا ایک شاہد بھی ہے۔

(۱۰/۲۱۷ ح ۹۴۷۲، مجمع الزوائد ۵/۳۶)

اس کی سند میں یحییٰ الحمانی چور تھا۔ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۷۵۹۱)

اس کے استاد عبدالرحمٰن بن ابی سلمہ سے مراد عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ہے اور اس کی روایات اس کے باپ سے موضوع ہوتی ہیں اور یہ روایت بھی اس کے باپ سے ہے، لہٰذا موضوع ہے۔

علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی (متوفی ۵۸۷ھ) نے بغیر کسی سند کے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا کہ خون حرام ہے اور میں چھ چیزوں کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ (بدائع الصنائع ۵/۶۱)

یہ روایت قابلِ اعتماد صحیح وحسن سند نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ومردود ہے اور چھ چیزوں سے مراد ضعیف حدیث میں بیان شدہ خون کے علاوہ چھ چیزیں ہیں، جس کی تحقیق تھوڑا پہلے گزر چکی ہے۔

خلاصۃ التحقیق: شرائط شرعیہ کے ساتھ ذبح شدہ حلال جانور کی اوجھڑی حلال ہے، بشرطیکہ اسے خوب دھو دھو کر، خوب صفائی کر کے پکایا جائے اور کسی قسم کی نجاست کا کوئی اثر باقی نہ رہا ہو۔ (۲۹/ دسمبر ۲۰۱۰ء)

قربانی کا گوشت اور غیر مسلم؟

سوال قربانی کا گوشت غیر مسلم لوگوں کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(ارشاد اللہ امان)

الجواب قربانی کے گوشت کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ پس اس سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیر کو

کھلاؤ۔ (الحج:۲۸)

اور فرمایا: ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾

پس اس میں سے کھاؤ اور امیر و غریب کو کھلاؤ۔ (الحج:۳۶)

ان آیات سے ثابت ہوا کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کرنا، خود کھانا، امیروں مثلاً رشتہ داروں اور دوستوں کو کھلانا اور غریبوں کو کھلانا بالکل صحیح ہے اور چونکہ قربانی تقربِ الٰہی وعبادت ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ قربانی کا گوشت صرف مسلمانوں کو کھلایا جائے۔

اگر تالیفِ قلب کا معاملہ ہو تو پھر سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۰ کی رُو سے اُن کافروں کو یہ گوشت کھلانا جائز ہے جو اسلام کے معاند دشمن نہیں بلکہ نرمی والا سلوک رکھتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے گھر میں ایک بکری ذبح کی گئی، پھر وہ جب آئے تو کہا: کیا تم نے (اس میں سے) ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی بھیجا ہے؟ آپ نے یہ بات دو دفعہ فرمائی اور کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((ما زال جبريل يوصيني بالجار حتى ظننت أنه سيورّثه .))

جبریل مجھے مسلسل پڑوسی کے بارے میں کہتے رہے، حتیٰ کہ میں نے سمجھا کہ وہ اسے وارث بنادیں گے۔ (سنن ترمذی:۱۹۴۳، مسند حمیدی:۵۹۳، وسندہ صحیح)

معلوم ہوا کہ تالیفِ قلب اور پڑوسی وغیرہ ہونے کی وجہ سے غیر مسلم کو بھی قربانی کا گوشت دیا جا سکتا ہے۔ (۲۹/ دسمبر ۲۰۱۰ء)

مکان کی خریداری اور قرض؟

سوال ایک آدمی جس کے پاس دو لاکھ روپیہ ہے۔ اُس نے ایک مکان خریدنا ہے۔ جس مکان کو خریدنا ہے اس کی مارکیٹ ویلیو دس لاکھ روپیہ ہے۔ وہ آدمی آٹھ لاکھ روپیہ میزان بینک سے قرض لیتا ہے۔ اس دس لاکھ سے مکان خرید لیا جاتا ہے۔ میزان بینک کی شراکت زیادہ ہے اس لیے بینک کے نام مکان ہو جاتا ہے۔ ضرورت مند آدمی

بینک سے آٹھ لاکھ کی قسطیں کر لیتا ہے۔ جب قسطیں ادا کرتے کرتے اس آدمی کا حصہ پچاس فیصد سے بڑھ جاتا ہے تو مکان اس آدمی کے نام ہو جاتا ہے۔ بقیہ قسطیں اختتام تک جاری رہتی ہیں۔ یہ آدمی پہلے سے ایک کرایے کے مکان میں رہ رہا ہوتا ہے، جب اس کا معاملہ بینک سے ہوتا ہے تو یہ خریدے گئے مکان میں بطورِ کرایہ دار کے منتقل ہو جاتا ہے۔ اب یہ بینک کو اپنی قسط بھی ادا کر رہا ہے اور ساتھ ہی کرایہ بھی دے رہا ہے۔ جونہی اس کی اقساط مکمل ہوتی ہیں کرایہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے، کیا اِس طرح سے یہ ڈیل جائز ہے یا کہ نہیں؟ اگر وہ خود اِس مکان میں نہیں رہتا تو اسے کہیں نہ کہیں رہ کر کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے، دوسرا یہ کہ بینک والے بھی دوسرے کو کرایہ پر مکان دے دیتے ہیں، جب تک کہ وہ بندہ آٹھ لاکھ بینک کو واپس نہیں کر دیتا۔ چوں کہ اس بندے کا دو لاکھ کا سرمایہ اس مکان میں لگا ہوا ہے اس کو اس کا حصہ ملتا ہے جو کہ اقساط میں ضم کر لیا جاتا ہے۔ براہ مہربانی ضرور رہنمائی فرمائیں۔ والسلام (اعجاز احمد گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ)

الجواب اس میں یہ شک ہے کہ قرضے کی وجہ سے نفع حاصل کیا گیا ہے، لہٰذا یہ کاروبار مشکوک ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔ واللہ اعلم (۴/اپریل ۲۰۱۱ء)

جنات سے علاج

سوال ایک آدمی جس کا عقیدہ ٹھیک ہے۔ پانچ وقت کا نمازی اور ہر گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کی دوستی کسی مسلمان جن سے ہو جائے اور وہ اس کو استعمال میں لا کر کسی آسیب زدہ انسان کا علاج کر دے اور وہ بندہ صحت یاب ہو جائے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ (اعجاز احمد، گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ)

الجواب اگر یہ بات صحیح ہے اور واقعی کسی شخص کی کسی مسلمان جن سے دوستی ہے تو بیمار انسان کے علاج کی دو حالتیں ہیں:

۱: جن کسی حلال چیز مثلاً جڑی بوٹی سے علاج کا مشورہ دے یا کسی غیر شرکیہ اور صحیح ذکر

واذکار کا عمل بتائے تو اس پر عمل جائز ہے اور یہ اس حدیث کے تحت ہے، جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکے تو ضرور پہنچائے۔

(صحیح مسلم:۲۱۹۹،توضیح الاحکام ج۱ص ۴۷۸)

۲: بذاتِ خود جن سے مدد لے کر مافوق الاسباب علاج کرایا جائے، جیسا کہ آج کل بہت سے مدعیان علاج کا طرزِ عمل ہے تو یہ مشکوک ہے، لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔

شیخ محمد ناصر الدین الالبانی وغیرہ بہت سے علماء نے الاستعانۃ بالجن سے منع فرمایا ہے۔ (دیکھئے السلسلہ الصحیحہ ۶/۱۰۰۹ ح ۲۹۱۸)

نیز شیخ ابو محمد امین اللہ پشاوری اور شیخ ابو زکریا عبدالسلام رستمی حفظہما اللہ نے اس کی مخالفت پر ایک رسالہ لکھا ہے: ''دم میں جنات سے تعاون اور خدمت لینے کا حکم''

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے اس کا مشروط جواز نقل کیا ہے۔ (دیکھئے الفتاوی المہمہ ص۶۹۔۷۰ لقاءات الباب المفتوح ۱۲۶۰)

راجح یہی ہے کہ اس عمل سے اجتناب کیا جائے۔ واللہ اعلم (۴/ اپریل ۲۰۱۱ء)

حائضہ عورتیں اور مساجد میں آمد و رفت

سوال اہلِ حدیث مساجد میں علیحدہ سے عورتوں کا انتظام موجود ہے۔

کیا حائضہ عورت مسجد کے کسی کونے میں بیٹھ کر ذکر و اذکار کرسکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسئلے کی وضاحت فرمادیں۔ (محمد فیاض دامانوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**وجّھوا ھذہ البیوت عن المسجد فإني لا أحل المسجد لحائض ولا جنب**)) ان گھروں (کے دروازوں) کو دوسری طرف پھیر دو، کیونکہ میں مسجد کو حائضہ اور جنبی کے لئے حلال قرار نہیں دیتا۔

(سنن ابی داود: ۲۳۲ وسندہ حسن وصححہ ابن خزیمہ: ۱۳۲۷)

اس روایت کے راوی افلت بن خلیفہ صدوق ہیں۔ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۵۴۶)

اور جسرہ بنت دجاجہ کی توثیق امام عجلی، حافظ ابن حبان اور امام ابن خزیمہ سے ثابت ہے اور جمہور کی اس توثیق کے مقابلے میں امام بخاری کا قول ''عند جسرة عجائب'' مرجوح ہے۔

ثابت ہوا کہ حائضہ عورت مسجد میں نہ داخل ہو سکتی ہے اور نہ مسجد میں ذکر واذکار کر سکتی ہے۔ [1]

حج اور بیت اللہ کا طواف، نیز تنعیمی عمروں کا حکم

سوال اگر کوئی شخص حج کے لئے جائے اور وہ فارغ اوقات میں کعبہ کا طواف ہی کرتا رہے تو یہ عمل کرنا کیسا ہے؟ اور بعض لوگ میقات جا کر وہاں سے احرام باندھ کر اپنے لئے، اپنے والدین یا عزیز رشتہ داروں کے لئے عمرہ کرتے ہیں۔ یہ عمل کیسا ہے؟ براہِ مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(محمد فیاض دامانوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إنما الطواف صلوة فإذا طفتم فأقلّوا الكلام .)) طواف تو نماز ہے، لہٰذا جب تم (بیت اللہ کا) طواف کرو تو باتیں تھوڑی کیا کرو۔ (مسند احمد ۳/۴۱۴ ح ۱۵۴۲۳ وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: طواف میں باتیں تھوڑی کیا کرو اور (اس حالت میں) تم تو نماز میں ہوتے ہو۔ (سنن نسائی: ۲۹۲۶ وسندہ صحیح موقوف)

بیت اللہ کا طواف نماز کے حکم میں ہے اور یہ عبادت پوری دنیا میں صرف مکہ مکرمہ (بیت اللہ) میں ہوتی ہے، لہٰذا حاجی یا معتمر (عمرہ کرنے والے) کو چاہئے کہ اپنے مناسک سے فارغ ہو کر اپنا زیادہ وقت بیت اللہ میں صرف کرے اور داخل ہونے کے بعد تحیۃ المسجد (دو رکعتیں) پڑھنے کے بعد حتی الوسع طواف ہی کرتا رہے اور اگر تھک جائے تو بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت یا ذکر واذکار میں مصروف رہے۔

---

[1] اس سوال کے تفصیلی جواب کے لیے ملاحظہ ہو: اشاعۃ الحدیث: ۱۲۷، ۱۲۸

تنعیم سے جو مروّجہ عمرے کئے جاتے ہیں، ان پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، لیکن اس استدلال میں نظر ہے اور بہتر یہی ہے کہ میقات سے عمرہ کیا جائے اور حائضہ کے علاوہ دوسرے لوگ تنعیم (مسجدِ عائشہ) سے عمرہ نہ کریں۔

اہلِ مکہ کے صحیح العقیدہ علماء کی بھی یہی تحقیق ہے۔ واللہ اعلم

درج بالا حدیث سے دو مزید مسئلے بھی ثابت ہیں:

۱: نماز میں کلام کرنا جائز نہیں۔

۲: حالتِ طواف میں ضروری کلام کرنا جائز ہے۔

عورتوں کا اپنے بال کٹوانا

سوال عورتوں کا بال کٹوانا یا نہ کٹوانا کیسا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (محمد فیاض دامانوی، بریڈفورڈ انگلینڈ)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ليس على النساء الحلق ، إنما على النساء التقصير .))

عورتوں پر (حج میں) سر منڈانا نہیں، بلکہ عورتوں پر بالوں کا قصر کرنا ہے۔

(سنن ابی داود: ۱۹۸۵، سنن دارمی: ۱۹۱۱، وسندہ حسن وحسنہ الحافظ فی التلخیص الحبیر ۲/ ۲۶۱)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حج اور عمرے کے دوران میں بھی عورتیں سر نہیں منڈائیں گی اور اسی پر اجماع ہے۔ (دیکھئے کتاب الاجماع لابن المنذر: ۱۹۹/ ۶۵، حاجی کے شب وروز ص ۸۹)

قصر میں بھی صرف ایک انگلی کی موٹائی یا اس کے قریب جتنے بال کاٹے جاتے ہیں۔

یاد رہے کہ عورت مردوں کی طرح اپنے سر کے بال نہیں کاٹ سکتی، کیونکہ اس سے مردوں کی مشابہت لازم آتی ہے اور مشابہت حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو عورتیں مردوں سے مشابہت کرتی ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہو۔

(صحیح بخاری: ۵۸۸۵، الحدیث حضرو: ۲۷ ص ۵۳)

دعا میں صیغہ بدلنا کیسا؟

سوال کیا قرآنی یا مسنون دعا میں صیغہ بدلا جا سکتا ہے؟
مثلاً يا حيّ يا قيوم برحمتك أستغيث کو نستغيث پڑھنا؟

(ایک سائلہ)

الجواب بہتر یہی ہے کہ قرآن و حدیث میں وارد دعاؤں کو اسی صیغے میں پڑھا جائے جس میں وہ وارد ہیں، لیکن دو دلیلوں کی رُو سے کبھی کبھار صیغہ بدلنا یعنی واحد کی جگہ جمع کا لفظ استعمال کر لینا بھی جائز ہے۔

۱: اگر امام ہے تو دعائے قنوت میں صرف اپنے لئے ہی دعا نہ مانگے بلکہ اپنے مقتدیوں کو بھی اپنی دعا میں شریک کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا يؤم رجل قومًا فيخصّ نفسه بالدعاء دونهم فإن فعل فقد خانهم))
''کوئی آدمی بھی لوگوں کو نماز پڑھاتے وقت ان کے علاوہ صرف اپنے لئے دعا (دعائے قنوت) نہ مانگے اور اگر اس نے ایسا کیا تو خیانت کی۔''

(سنن ابی داود: ۹۰ وسندہ حسن، سنن ترمذی: ۳۵۷، سنن ابن ماجہ: ۶۱۹، ۹۲۳)

۲: رسول اللہ ﷺ نے تشہد میں دعا کے بارے میں فرمایا:

((ثم ليتخيّر من الدعاء أعجبه إليه فيدعو)) ''پھر جو دعا بھی پسند ہو تو وہ مانگے۔''

(صحیح بخاری، کتاب الاذان باب ما یتخیر من الدعاء بعد التشہد ولیس بواجب ح ۸۳۵)

جب تشہد میں، عربی زبان میں کوئی بھی دعا مانگی جا سکتی ہے تو قنوت میں بدرجۂ اولیٰ دوسری دعا جائز ہے۔ تشہد میں ''السلام عليك أيها النبي'' کے صیغے کو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض صحابۂ کرام نے ''السلام على النبي'' سے بدل دیا تھا۔

(دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستئذان باب الاخذ بالیدین ح ۶۲۶۵)

ثابت ہوا کہ ضرورت کے وقت مسنون دعا کا صیغہ بدلنا جائز ہے۔

یوسف النبہانی کون تھا؟

سوال: علامہ (!) نبہانی کون شخص ہے؟ اس کا عقیدہ اور مرتبہ ومقام کیا ہے، اس کا مختصر تعارف کرائیں؟ (محمد عمران اعظم)

الجواب: یوسف بن اسماعیل بن یوسف النبہانی الشافعی (متوفی ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۲ء) ایک بدعتی ''مولوی'' تھا جس نے شواہد الحق فی الاستغاثہ بسید الخلق، جامع کرامات الاولیاء اور الانوار المحمدیہ وغیرہ کتابیں لکھیں۔ علمائے حق میں سے علامہ ابوالمعالی محمود شکری آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۴۲ھ) نے اس کا رد ''غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی'' کے نام سے لکھا۔

نیز دیکھئے الجواب الفائق فی الرد علیٰ مبدل الحقائق (تالیف عبداللہ عبدالرحمٰن بن جبرین ج ۱ ص ۹ بحوالہ المکتبۃ الشاملہ)

نبہانی مذکور نے کسی محمد بن عبداللہ بن علوی کے بارے میں لکھا ہے: ''آپ کی کرامتوں میں یہ ہے کہ آپ متوسلین میں سے کسی کے پاس بیٹھے تھے کہ جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے پھر لوٹے تو آپ کے کپڑوں میں سے پانی ٹپک رہا تھا، ان صاحب نے اُٹھنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میرے متوسلین میں سے بعض کا جہاز پھٹ گیا تھا اُنھوں نے مجھ سے مدد مانگی تو مَیں نے اُس میں اپنا کپڑا لگا دیا حتیٰ کہ اُن لوگوں نے اس پھٹن کو درست کرلیا اور جہاز جیسا تھا ویسا ہو گیا۔'' (جمال الاولیاء ترجمہ جامع کرامات الاولیاء / اشرفعلی تھانوی ص ۱۴۱، ۱۴۲)

یہ خود ساختہ کرامت صریحاً شرک پر مبنی ہے کیونکہ اس میں اللہ کو چھوڑ کر اُس کی مخلوق کو مافوق الاسباب مدد کے لیے پکارا گیا ہے۔

ان بدعقیدہ لوگوں کے رد کے لیے دیکھئے سوۃ النمل (آیت نمبر ۶۲)

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ بدعت کے اس لکھاری نبہانی کی کسی روایت (جس میں وہ منفرد ہو) کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ وہ اپنے عقائد بدعیہ کی وجہ سے ساقط العدالت ہے۔

شیخ شمس الدین الافغانی رحمہ اللہ نے یوسف بن اسماعیل النبہانی الفلسطینی کے بارے میں فرمایا: "وکان شاعرًا مجیدًا و أدیبًا بارعًا لکنه وثني داعیة الی الشرك والکفر وهو أحد کبار أئمة القبوریة" وہ بہترین شاعر اور فاضل ادیب تھا لیکن بت پرست، شرک اور کفر کی طرف دعوت دینے والا تھا اور وہ قبر پرستوں کے بڑے اماموں میں سے ایک تھا۔ (جہود علماء الحنفیۃ فی ابطال عقائد القبوریۃ ج ا ص ۴۳۲)

❁ ❁ ❁

الفهارس

أطراف الآيات والأحاديث والآثار

اسماء الرجال

مختصر اشاریہ



فتاویٰ علمیہ

المعروف

توضیح الاحکام

مکتبہ اسلامیہ
MAKTABA ISLAMIA

مکتبہ اسلامیہ

لاہور بادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

/maktabaislamia1 maktabaislamiapk.com maktabaislamiapk@gmail.com